وہی اِک لمحہ زیست کا

A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

فاخرہ گُل

وہی اِک لمحہ زیست کا

فاخرہ گُل

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 042-37652546-37668958

اس کتاب کا کوئی حصہ، پیراگراف یا مضمون پبلشر، مصنف کی اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔
اس کتاب کے جملہ حقوق القریش پبلی کیشنز کے نام محفوظ ہیں۔

وہی اِک لمحہ زیست کا ..... فاخرہ گل
ناشر ..... محمد علی قریشی
بااہتمام ..... فہد حسن قریشی
بار اوّل ..... فروری 2016ء
قیمت ..... 600/- رُوپے

☆☆☆

ISBN: 9789696022985
www.alquraish.com
email: info@alquraish.com
Join us: alquraishpublications
Printed by: Nayyar Asad Press, Lahore.

انتساب!

عشرت، نورین، نازیہ جی اور فوزیہ آپی کی بے غرض اور بے لوث محبتوں کے نام.....
جن کے ہونے سے میرا ہونا، اور جن کے احساس سے زندگی کی مٹھاس قائم ہے۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

پیش لفظ

شروع اللہ کے پاک نام سے جو عزت دینے پر آئے تو پڑھنے والے اُس پاک ذات کی رحمت سے اُن ناپختہ سطروں کو اس قدر سراہیں کہ اُن کی تعریفی آراء اور قابل قدر جملوں سے یہ آنکھیں بھیگ جائیں اور پروردگار کی شکر گزاری کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرنے لگیں کہ بے شک میرا لکھنے کا ہنر خام مگر اس کا نوازنا خاص بلکہ خاص الخاص ہے۔

''وہی ایک لمحہ زیست کا'' مجموعی طور پر میری تیسری جبکہ نثری میدان میں دوسری کتاب ہے۔ اس میں آپ کو اپنے ہی اردگرد بکھرے ہوئے کئی کردار ملیں گے۔ کئی ایسی کہانیاں نظر آئیں گی جو ہماری ہی روزمرّہ زندگی کا حصہ ہیں اور بالخصوص ''وہی ایک لمحہ زیست کا'' کہانی ہے اُس لمحے کی جس نے تاجی کی زندگی بدل ڈالی اور جس میں پینو کو انجانے میں سرزد ہو جانے والے فعل قبیح کا احساس ہوا یا جس لمحے ہاجرہ خاتون نے عزت کو مال و دولت پر ترجیح دی۔ یہ کہانی ہے بھوک کی ..... جو ساری دنیا کو متحرک کئے ہوئے ہے، کہیں روٹی کی بھوک ہے تو کہیں اقتدار کی، پیسے کی، جاہ و نسب کی، ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کی، پیار کی، دولت کی، عورت کی!

ساری دنیا اپنی اپنی بھوک کے پیچھے دیوانہ وار ہر چیز کو تج کئے بس بھاگتی ہی جا رہی ہے، بغیر کسی اکتاہٹ اور بیزاریت کے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ پھر بھی یہ بھوک مٹتی ہی نہیں ..... رفتار مدہم ہونے ہی نہیں دیتی کہ قدم روکے جانے کا سوچا بھی جائے اور پھر آخر کار اشرف المخلوقات جیسا اعلیٰ رتبہ پانے والا انسان اس سے پہلے کہ اس بھوک کے پیچھے بھاگتا شل جسم کے ساتھ کہیں کا نہ رہے ..... اُسے یاد دلا دیا جاتا ہے کہ بیمار ہونا نہ ہونا، ہماری محبتیں، محنتیں اور ہمارا آنا جانا کچھ بھی ہمارے بس میں نہیں اور تبھی ہر انسان کی زندگی میں کم از کم ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب اچھے برے، سچ جھوٹ اور حلال حرام کے سب حجابات ہٹا کر وہ نوازنے والی ذات تمام مناظر اس قدر واضح کر دیتی ہے کہ پھر کچھ لوگ تو اس چندھیا دینے والی روشنی کے سامنے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور کچھ خوش قسمت اپنا آپ اُس لمحہ ہدایت کے سپرد کر کے ہاتھ باندھتے ہوئے آنکھیں جھکا لیتے ہیں ..... وہ لمحہ ہدایت جسے پا لینے والوں کو وہ چاہے تو سولی پر چڑھا دے، چاہے تو کربلا سے گزار دے، جیل میں ڈالے، کنویں میں،

آگ میں یا مچھلی کے پیٹ میں.....

ہدایت کا یہ لمحہ زندگی میں آنا، درست وقت پر اُس کا ادراک ہونا اور پھر تمام عمر اُس ایک لمحے کی لاج رکھنا.....

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

تاجی تو ایک تعفن زدہ سوچ اور حرص و ہوس میں مبتلا نفس سے ہدایت کے اُس ایک لمحے کے صدقے اپنا آپ آزاد کروا بیٹھی۔ اب میری دُعا ہے کہ اللہ ربّ العزت ہماری زیست کو بھی اسی ایک لمحے سے نواز دے جس میں ہم اپنا آپ اس کی رضا میں ڈھالتے ہوئے ایسے جئیں کہ لوگوں کو ہمارے مرنے پر رسمی نہیں حقیقی دُکھ اور کمی کا احساس ہو اور ہم اپنی ذات میں اترے اُسی ایک لمحے کی روشنی کی مدد سے دوسروں کی زندگی میں بھی چراغاں کر سکیں۔

اس موقع پر میں اپنے امی ابو، بہنوں اور شریکِ سفر کی بے حد شکر گزار ہوں جن کے بھرپور تعاون اور محبت کے بغیر میں یقینی طور پر کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ عبدالرحمٰن اور محمد حمزہ جو ہمیشہ مجھے لکھتا ہوا دیکھ کر اب اُسے پڑھنے کے شوق میں اُردو سیکھ رہے ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔

اس کے علاوہ محترمہ انجم انصار صاحبہ، ریحانہ امجد بخاری، شمع زیدی، ماہ نور، طاہر قریشی صاحب، شیزینہ، فائزہ، رضوانہ فرقان، ثمرین، فرحت شیخ، اُمِ ہانی، حنا میر، فہیم انجم اور نٹ کھٹ سی ستارہ امین کومل کے ساتھ ساتھ باقی تمام محترم لوگ اور دوست جن کا نام نہیں لکھ پائی مگر اُن کی محبت کا احساس ہمیشہ مجھے ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔

آخر میں محترم محمد علی قریشی صاحب کے کام کرنے کے پروفیشنل انداز کو نہ سراہنا یقیناً زیادتی ہو گی، مصنفین کی محنت کو خوبصورت طریقے اور مکمل ذمہ داری کے ساتھ قارئین تک اس طرح پہچانا کہ ادارے کا نام رائٹرز کی ترجیحات میں شامل ہو..... بلاشبہ یہ القریش پبلیکیشنز کا ہی خاصہ ہے جن کے زیرِ اہتمام انشاء اللہ آپ آئندہ بھی میری تحاریر پڑھتے رہیں گے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

فاخرہ گل
اٹلی
binteadam987@yahoo.com

ترتیب

وہی اِک لمحہ زیست کا 7
میں گلیاں دا روڑا کوڑا 121
میں کس کے ہاتھ پہ 152
ہزاروں خواہشیں ایسی 189
صبح کا بھولا 213
کاش ایسا ہو 242
درد کا گہرا بادل 273

آج کا دن بھی باقی دنوں سے ہرگز مختلف نہ تھا' اسی ڈھب سے رات گزری تھی اور ہمیشہ کی طرح اسی انداز میں اب صبح ہونے کو تھی۔ چار دیواری کے اندر رہائش پذیر لوگوں کی خواہشات کل بھی وہی تھیں اور تمنائیں آج بھی کچھ مختلف نہ تھیں۔

سورج کی نرم اور تروتازہ کرنوں نے بڑے مدھم طریقے سے دھرتی کے کشادہ سینے پر اپنا لمس ثبت کیا اور پھر دھیرے دھیرے رات بھر کی جدائی کا احوال کہنے لگیں۔

ناجی نے بھی حسب معمول جاگنے کے بعد آڑے ترچھے سوئے ہوئے نوشے اور طاقو کو اپنی کراری آواز میں پکارنا شروع کیا۔

فیکا بھی جاگ تو گیا تھا مگر یوں ہی دیوار کی طرف منہ کیے صحن میں بان کی چارپائی پر لیٹے ہوئے شاید ان بدرنگ چھوٹی بڑی اینٹوں کو گننے میں مصروف تھا، جو محض دو گھروں کو علیحدہ کرنے کی نشان دہی کیا کرتی تھیں۔

نوشے اور طاقو کے کسمسا کر پھر سے کروٹ لے لینے کے بعد ناجی نے ایک مرتبہ پھر ان دونوں کو جھنجوڑا مگر اسی دوران چپ چاپ خاموش نظروں سے دیوار کو تکتے فیکے کو دیکھتے ہی اسے سارے جسم کا بوجھ دل پر پڑتا محسوس ہوا۔

''تجھے کتنی مرتبہ کہا ہے فیکے یوں چپ ہو کر نہ لیٹا کر تو گھر میں ہوتے ہوئے بھی خاموش ہو تو میرا جی بڑا گھبراتا ہے۔''

اس کی ٹانگوں کو پرے ہٹاتے وہ خود ادوائن پر ہی ٹک گئی تھی، جہاں پوری چارپائی کے برعکس پھٹی ہوئی دری کو اس خیال سے ڈالا گیا تھا کہ چبھن سے بچا جا سکے اور یہ خاص انتظام بھی اس لیے تھا کیونکہ وہ ناجی کا مجازی خدا تھا اور جس سے وہ اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح کوئی دیہاڑی دار اپنے سارے دن کی کمائی سے کرتا ہو۔

Pakistanipoint
Waqar Azeem

اس کے مخاطب کرنے پر فیکے نے محض کروٹ بدلی اور رخ اس کی طرف کر کے بس اسے دیکھے ہی گیا۔ گہرے سانولی رنگت' فربہی کی طرف مائل جسم' پتلی سی چٹیا' گلابی سے سرمئی ہوتے ہونٹ' بڑی بڑی سفید بے رونق آنکھیں.....

یہ تھی ناجی جس کے لیے آج سے چند سال پہلے فیکے نے قبیلے کے سب لوگوں سے ٹکر لی تھی اور آخر ریلوے اسٹیشن پر پہلی ملاقات کے بعد اس کے دل کو سکون تب ملا جب وہ اسے کالج سے سرخ چوڑیاں پہنائے' ہاتھوں اور پاؤں کے ناخنوں پر تیز سرخ رنگ کی نیل پالش اور ہونٹوں پر گہرے' نارنجی رنگ کی لپ اسٹک لگائے دلہن کے روپ میں اپنی بستی میں لے آیا۔ نیل پالش کے ننھے ننھے نشانات کے اترنے تک اس نے خود کو دلہن سمجھا مگر دس روپے کی کچی نیل پالش بھلا کتنے دنوں تک اس کے دلہناپے کو برقرار رکھتی سو جیسے ہی نیل پالش چھلکے کی مانند اتری وہ بھی فیکے کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی نظر آئی۔

نہ تو اس نے اپنے وجود کے اندر سانس لیتی ننھی سی جان کی پروا کی اور نہ ہی شادی کے ابتدائی مہینوں کی خوب صورتی کی۔

یوں بھی یہ چونچلے وہیں پورے ہو سکتے ہیں جہاں رزق روز فلک پر نکلتے سورج کی طرح لازمی ملنا ہو' اس کے برعکس جہاں مسئلہ دیہاڑی کا ہو وہاں شادی کے روز بھی دیہاڑی ہاتھ نہ آنے کا غم لاحق رہتا ہے۔ سو ایسی صورت میں اس نے فیکے کے کندھوں کا بوجھ بٹانے کی خاطر وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً میدان عمل میں اترنے کا ارادہ کیا تھا اور دن بھر یوں اس کے ساتھ پھرکی کی طرح لگی رہتی کہ پہلے فیکے کے مخالف لوگ اب اس کے اس اقدام کو سراہتے۔

''خیر تو ہے ناں' اٹھنا نہیں ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' وہ ایک دم پریشان ہوگئی تھی کیونکہ عموماً اس وقت وہ ناشتے کے لیے دودھ وغیرہ کا بندوبست کرنے گیا ہوتا آج اسے یوں کسل مندی سے لیٹے دیکھا تو اس کا گھبرانا لازمی تھا۔

''ارے میں تو بس یونہی لیٹ گیا تھا' تُو کیوں پریشان ہو رہی ہے؟'' ناجی کی تشویش دیکھتے ہوئے اب وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

''کل بھی اس وقت حفیظ کی دکان بند تھی اس لیے میں نے سوچا تھوڑی دیر رک جاؤں' آج بھی دیکھو دودھ ملتا ہے کہ نہیں۔'' فیکے نے اٹھ کر سلیپرز پہنے۔

''شادی اس کی ہوئی ہے تو ہماری بلا سے۔ کم از کم گاہکوں کو وقت پر سودا تو دے پھر کر لے جا کر کمرہ بند۔'' ناجی کل بھی گھر سے بغیر ناشتے کے نکلنے پر بڑی بدمزہ ہوئی تھی جبھی تڑخ کر بولی۔

''ہاں بھئی قسمت والا ہے۔'' فیکے نے آگے بڑھتے ہوئے ناجی پر جھکتے ہوئے کہا تو وہ یوں اچانک اس کا موڈ بدلنے پر حیران آنکھوں سے مسکراتے ہوئے یوں پیچھے ہٹی کہ اس کے پاؤں تو زمین کو چھو رہے

تھے مگر پشت ادوائن سے جا لگی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش قدمی کرتا ناجی نے ابرو اٹھا کر آنکھوں کو دائیں سمت گھماتے ہوئے دروازے کی چوکھٹ کی سمت دیکھا جہاں جانی آنکھیں ملنا بھول کر ان ہی دونوں کو دیکھ رہا تھا جب کہ پینو بھی ٹھنڈے چولہے کے پاس چائے کے انتظار میں بیٹھی کن اکھیوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اس کا ذہن گو کہ کچا ضرور تھا مگر اس پر بننے والے خاکے بڑے واضح اور ٹھوس تھے۔ نظریں ملنے پر جانی نے آنکھوں کو آخری حد تک پھیلاتے ہوئے اپنے غصے کا اظہار لازمی سمجھا تھا۔

''لے آ گئی فوج بیرکوں سے باہر' ہر وقت سر پر کھڑا نگرانی کرتا رہتا ہے۔ ہونہہ..... کانسٹیبل نہ ہو تو.....'' جانی کی آمد پر فیکے کے موڈ کا یوں ستیاناس ہوا کہ دانتوں تلے ریت آتی محسوس ہوئی جبھی بکتا جھکتا گھر سے نکل گیا۔

فیکے کے موڈ کو دیکھ کر پینو نے خوامخواہ سر جھکا لیا جبکہ ناجی نے بغیر کوئی نوٹس لیے ایک بار پھر نوشے اور طاقو کو زور سے جھنجوڑا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے کیونکہ جانتے تھے کہ اس کے بعد ناجی کی زبان نہیں چپل چلے گی۔

''چل ناں' اب جا بھی۔ کھڑا کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔'' ناجی نے جانی کو غسل خانے کی طرف دھکیلا کہ اس کے بعد پھر نوشے اور طاقو کی باری تھی مگر جانی نے جھٹکے سے اپنا کندھا چھڑایا اور گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا جس کے دروازے کے نام پر ناجی کا دوپٹہ ہوا سے یہاں وہاں لہراتا اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ غسل خانہ خالی ہے۔ جونہی کوئی اندر جاتا دوپٹے کے زمین تک آتے پلو پر اینٹ رکھ کر اسے اڑنے سے روکنا اور یوں دروازہ بند ہو جایا کرتا۔

یوں بھی جانی اب کوئی بچہ نہ تھا' لڑکپن کی دہلیز پار کرنے کے بعد اب جوانی کی چوکھٹ پر پاؤں رکھ رہا تھا ویسے بھی وہ جس ماحول کا حصہ تھا وہاں بچپن کی بہاریں دبے پاؤں کب گزر جاتی ہیں پتا نہیں چلتا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ ناجی سے کم از کم پینو کے سامنے فیکے سے بے تکلف ہونے میں احتیاط برتنے کا کہے لیکن یہ سب وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا۔ کہنے کی نہ تو اسے اجازت تھی نہ ہمت' جس کی بنیادی وجہ فیکے کا خوف تھا۔

یہ الگ بات تھی کہ فیکے اور ناجی کو ایک دوسرے کے یوں قریب دیکھ کر اس کے اندر ہمیشہ کی طرح چڑچڑاہٹ اور بے زاری بڑے دلیرانہ انداز میں اپنے قدم جما چکی تھی۔

فیکا دودھ لے کر آیا تو وہ سب مٹی کے تیل کے چولہے کے اردگرد نیم دائرہ بنائے قہوے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

''یہ لے پکڑ' دوسرے محلے سے لایا ہوں۔ حفیظ خود تو عیش کر رہا ہے اور ہمیں مصیبت میں ڈالا ہوا

ہے۔'' فیکے نے دودھ ناجی کو پکڑایا اور پاپوں کا چھوٹا پیکٹ امید بھری نظروں سے دیکھتے بچوں کو پکڑانے کے بجائے مٹی کے کچے فرش پر پٹخ دیا۔

''فیکے تُو مجھے ایک بات تو بتا کہ غصہ تجھے دوسرے محلے جانے پر آ رہا ہے یا حفیظ کے عیش کرنے پر۔'' ناجی نے دودھ قہوے میں ڈال کر جیسے جلے کے دل پھپھولے ہی پھوڑ ڈالے تھے۔

'' بکواس بند کر اپنی..... ہونہہ عیش!'' فیکے نے چٹختے لہجے میں کہا اور نظریں ایک دم جانی سے جا ملیں تو اس نے گھبرا کر فوراً سر گھٹنوں میں دے دیا۔

چائے سے فارغ ہو کر جلدی جلدی سب نے اپنے دھندے کے کپڑے پہنے' ٹین کے سیاہ بکس کے ساتھ قطار سے موجود ٹوٹے اور گھسے ہوئے تلوے والے ربر کے سلیپر پہنے تو گویا اپنے اصل میں آ گئے کہ اب دن بھر انہیں اسی حلیے میں رہنا تھا۔

ناجی نے سب سے پہلا سر کے گرد دوپٹہ باندھ کر کندھے سے دوسرا پلّو لٹکائے کشکول نما انداز میں گرہ لگائی۔

جانی ایک طرف کھڑا نوشے' طاقو اور پینو اور رانی کو دیکھ رہا تھا جو باپ کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے فٹافٹ تیار ہو کر کھڑے تھے جب کہ خود فیکا بغیر قمیص کے بڑی بے پروائی سے صحن کے بیچوں بیچ کھڑا ناجی کی توجہ کا منتظر تھا۔ گڈی ہنوز فرش پر پڑی سو رہی تھی۔

ناجی نے فیکے کو اپنا منتظر پایا تو کمال پھرتی سے دو ٹوٹے ہوئے ازار بند جوڑ کر بنائی جانے والی رسّی اس کے بائیں بازو اور پیٹ کے اردگرد گھما کر اسے دائیں طرف گرہ لگائی اور پھر سامنے رکھی قمیص پہنا دی تو وہ ظاہراً ایک بازو سے معذور دکھنے لگا۔

''پینو! جا اب گڈی کو لے آ۔''

ناجی کے کہنے کی دیر تھی پینو تیزی سے فرش پر سوئی ہوئی گڈی کو گود میں اٹھا لائی تو ہاتھ میں دو رس بھی پکڑے ہوئے تھی جو کہ گڈی کا ہی حصہ تھے اور وہ چونکہ روزانہ کے اس عمل کی عادی تھی جبھی نیند میں خلل پڑنے کے باوجود نہ روئی اور نہ ہی کسمسائی۔ مُندی مندی آنکھوں سے محض ان سب کو ایک مرتبہ دیکھا اور دوبارہ سو گئی اور ویسے بھی اس وقت کی نیند تو یوں بھی اس کی من پسند تھی جبھی ساری رات فرش چبھنے کے بعد ماں کی نرم گرم آغوش میسر آتی تو وہ بھوکی ہونے کے باوجود بڑے مزے سے سویا کرتی البتہ تیز دھوپ کی چبھن کے باعث اسے کچھ دیر بعد ہی جاگنا پڑتا تو وہ منہ بسورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا رس (Rusk) کھانے لگتی۔

نکلنے سے پہلے فیکے نے ایک نظر ان سب کو دیکھا مطمئن ہو کر رنگ برنگے کپڑے کی ٹکڑیوں سے بنی ٹوپی سر پر رکھی اور دائیں ہاتھ سے ریڑھی کو دھکیل کر گھر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا جبکہ

اس کی ہاں میں ہتھی پینو کے ہاتھ میں تھی۔ وہ سب نکلنے لگے تو جانی نے بھی اپنا تھیلا کندھے پر رکھا اور اللہ تعالیٰ کی اس وسیع زمین سے اپنے حصے کا رزق تلاش کرنے کی کوشش میں اپنا حصہ ڈالنے لگا۔

بالکل اسی طرح جیسے شاہین اپنی فضاؤں میں اُڑا کرتے ہیں مگر دیکھا جائے تو ان ہی فضاؤں میں ان کے الگ الگ جہاں آباد ہیں۔ عادات و خصائل کے لحاظ سے بھی اور خصوصیات کے لحاظ سے بھی۔ اسی طرح گھر سے تو وہ سبھی لوگ نکلے تھے مگر جانی کی نیت حق حلال اور محنت کی کمائی حاصل کرنے کی تھی جبکہ باقی نیت گھر کے باقی لوگ روپوں کے عوض دعائیں بیچنے کا کام کیا کرتے تھے۔

❀---❀---❀

عبدالواثق کو دنیا سے گئے آخر کار چالیس روز بھی بیت گئے تھے' زندگی کے کام البتہ ان چالیس دنوں کے بعد بھی نہ بدلے تھے اور اسی رفتار سے جاری وساری تھے کہ یہی تو قانونِ قدرت ہے کہ جن کے بنا ایک پل زندہ رہنے کا تصور محال ہوتا ہے ان کے دنیا سے چلے جانے' کبھی واپس نہ آنے اور نہ ملنے کے یقین کے باوجود اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو زمین کی چادر اوڑھا کر کچھ ہی عرصے بعد زندگی کے جھمیلوں میں یوں گرفتار ہو جاتا ہے کہ بے شک دل سے ان کی یاد محو نہ بھی ہو مگر انہیں پڑھ کر بخشنے کا وقت بھی اکثر دنیا داری کی طرف کھینچ لے جاتی ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود خدا کی رحمت بے قرار دلوں کو کچھ ایسی محبت سے تھپکتی ہے کہ چین آ ہی جاتا ہے۔

قرآن شریف بند کر کے جزدان میں رکھنے کے بعد نبیلہ نے کتابِ مقدس کو بوسہ دیا تو پلکیں بند ہونے کے ساتھ ہی کئی آنسو اس میں جذب ہو کر گم ہونے لگے۔

کچھ دیر بے آواز رونے کے بعد آخر نبیلہ نے قرآن کریم رحل پر رکھا اور اپنے مجازی خدا کے لیے ہاتھ اٹھا کر بخشش کی دعا کرنے لگی کہ چند دن پہلے تک وہ عبدالواثق کی بیوی تھی مگر اب بیوہ کہلانے لگی تھی۔

''اے باری تعالیٰ! رحم فرمانا میرے مالک' تمام مسلمانوں پر اور ان سب کے وسیلے میرے سر کے تاج پر جن کا نام اب بھی میرے لیے باعثِ احترام ہے۔ رحم فرمانا مالک! سب مسلمانوں کے وسیلے ان پر بھی جنہوں نے ہمیں زندگی بھر کوئی غم سہنے نہ دیا۔ تیرے دیئے ہوئے رزق سے ہماری تمام ضروریات پوری کرتے رہے' تیری طرف سے عائد کیے گئے تمام فرائض پورے کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ اے ربّ کریم! تو بھی ان پر رحم فرما ان کے اعمال کے حساب سے نہیں اپنی رحمت کے حساب سے' ان کے ساتھ وہ معاملہ کر جو تیری رحمت کے شایانِ شان ہو وہ حساب نہ کر جو ان کے اعمال کی بنیاد پر ہو۔ پروردگار مجھے حوصلہ اور ہمت دے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے ان کے بغیر بھی تیرے احکامات کی پابندی کر سکوں۔''

دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے آخر وہ بلک بلک کر رونے لگی تھیں کہ جوانی کی دہلیز کو چھوتی بیٹی اور عمر میں اس سے چند قدم پیچھے بیٹے کے ساتھ دنیا کے بازار میں اپنا آپ بچا کر چلنا اب ان کے لیے ایک

مشکل مرحلہ تھا جسے انہیں سر کرتا تھا لیکن کسی بھی مدد اور سہارے کے بغیر۔

❀---❀---❀

''یہ لے استاد۔''

جانی نے دن بھر تھیلا کندھے پر ڈال کر مختلف جگہوں سے شیشہ اور ربر وغیرہ جمع کیا تھا اور اب حسبِ معمول گھر جانے سے پہلے کباڑیے کو دے کر اپنی محنت وصول کر رہا تھا۔ فیکے کے ساتھ بھیک مانگنے کے دوران سنائی جانے والی گالیوں سے اکتا کر اس نے مختلف چھوٹے موٹے کام کرنے کی کوشش تو بہت کی مگر ہر طرف سے ہونے والی ناکامی سے اکتا کر آخر کار اب وہ اپنے مطلب کی چیزیں ڈھونڈ کر کباڑیے کے ہاتھ بیچا کرتا اور مطمئن ہوتا کہ وہ رزق حلال لے کر گھر جا رہا ہے۔

''لے پکڑ اپنے ستائیس روپے۔''

استاد نے پہلے خالی تھیلا اس کی طرف اچھالا اور پھر چند نوٹ اور سکے اس کی طرف بڑھائے۔

''لیکن استاد! اتنے کم پیسے؟ آج تو سامان بھی پہلے سے زیادہ تھا۔''

جانی جو کچھ دیر پہلے تک خوش تھا کہ اگر آج اس کے کندھے زیادہ بوجھ اٹھا رہے ہیں تو شام کو جیب بھی یقیناً اس بوجھ کو روپوں یا سکوں کی صورت اٹھا کر خوش ہوگی لیکن یہاں تو معاملہ بالکل ہی متضاد نکلا تھا سو جانی نے پہلے تو گھگھیا کر ان لڑکوں کی طرف دیکھا جو استاد کو سامنے موجود پا کر محض اپنی کارکردگی دکھانے کی غرض سے بڑی پھرتی سے لائے گئے سامان میں سے ربر، شیشہ، لوہا اور دوسری چیزیں الگ کر کے متعلقہ ڈھیریوں کا حجم بڑھاتے جا رہے تھے۔

''کم.....؟'' استاد نے اپنی موٹی موٹی بھنویں سکیڑ کر ناک چڑھاتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''ارے تو کیا یہ صندوقچی تیرے حوالے کر دوں، پھر ہوگا تو خوش۔'' استاد نے ہاتھوں سے لوہے کی صندوقچی بجاتے ہوئے کہا۔ ''ابے اوئے ایک بات کان کھول کر سن لے بازار میں کسی اور کے پاس سامان لے کر جاتا ناں تو اتنے بھی نہ ملتے۔ یہ بھی ترس کھا کر دے رہا ہوں ورنہ لایا کیا ہے تُو؟'' پھر سے وہی ترس کا لفظ سننے کو ملا تھا جس سے جانی کو اب تک چڑ تھی اسی لفظ کی گردان سے وہ اس حد تک تنگ آ چکا تھا کہ اب محنت کی کمائی کرنا چاہتا تھا۔ بجائے اس کے کہ ترس سے رقم اکٹھی کرتا۔

''استاد ایک موبائل ہے، بولو کرو گے سودا؟''

ابھی وہ استاد سے مزید بات کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ سیاہ سے سفید ہوتی گھسی کالر کی شرٹ پہنے اور سر پر رکھی ٹوپی کا چھجا کانوں پر کیے ایک لڑکا دکان میں داخل ہوا اور آتے ہی بغیر سلام دعا کے ماچس کی جلی ہوئی تیلی کو زبان کی مدد سے دانتوں میں یہاں وہاں گھماتے ہوئے بولا تو استاد فوراً للچاتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔ جانی بھی اپنی بات بھول کر ان دونوں کو دلچسپی سے

ا بھٹ اکالنا۔

''ہا ہا ال ہے استاد! اس دفعہ کم میں بات نہیں ہوگی۔''

ہ ہال استاد کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے ایک پاؤں سامنے رکھی کرسی پر رکھا اور گلے میں ا ا ھا ۔ ٹ چیک کا چھوٹا سا مفلر کھول کر گردن کی پچھلی طرف گھمانے لگا۔

'' لتنے لو گے؟'' استاد بھی پیشہ ور تھا نئے ماڈل کا سیاہ چمچماتا موبائل دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی تھی ا ان وہ ایک گھاگ خریدار کی طرح اپنی دلچسپی ظاہر کر کے ہرگز ہلکا پڑنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اپنے لہجے کو ی ا ا ا ان سرسری رکھا۔

'' مات ہزار سے کم ہرگز نہیں۔'' مختصر سا جواب آیا۔

'' مات ہزار؟'' استاد نے حیران ہونے کی بھرپور اداکاری کرتے ہوئے ابرو چڑھائے تو آنکھیں ا ا ا چھیل گئیں حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس ماڈل کی قیمت بیس ہزار سے کسی طور کم نہ تھی۔

''ارے اس کے تو کوئی پانچ بھی نہیں دے گا' جاؤ دوسرے کباڑیے بھی بیٹھے ہیں پوچھ لو سب سے جا ۔''

''لیکن استاد.....؟'' منہ میں حرکت کرتی تیلی داڑھ پر جا کر رک گئی تھی۔

''ارے سب جانتا ہوں میں بڑا آیا چوری کے مال پر دام لگانے والا۔ تین ہزار لینے ہیں تو بول ورنہ ی مرضی۔'' استاد نے اوپری دل سے موبائل واپس کیا تھا۔

''چل ٹھیک ہے استاد' ہے تو یہ زیادتی مگر جو تیری مرضی۔'' لڑکے نے ہار مانتے ہوئے موبائل دوبارہ ا ا ا ی طرف بڑھایا تو اس سے پہلے کہ استاد نوٹ نکالتا اس کی نظر جانی پر پڑی جو بڑی حیرت سے دونوں ی بات چیت سن رہا تھا۔

''ابے تُو ابھی تک یہیں کھڑا ہے؟'' گرجتا لہجہ گم صم کھڑے جانی کا تو خون ہی خشک کر گیا۔ ''چل فوراً ہٹ یہاں سے۔''

استاد نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے باہر کا رستہ دکھایا تو وہ اس کی ابلتی ہوئی آنکھوں کے مزید پھیلنے سے قبل ہم کر پیسوں کی درخواست کرنا بھول کر اپنا تھیلا اٹھانے کے بعد باہر بھاگا۔

یوں بھی جانی کو استاد کی آنکھوں سے بے حد خوف آتا تھا لیکن مجبوری روزانہ اسے وہیں لے جاتی تھی۔

❀---❀---❀

ا یکا اور نا جی اپنی بیٹیوں کے ساتھ کسی ایک ٹھکانے پر بھیک نہیں مانگتے تھے بلکہ محرم' رمضان شریف ا ر دوسرے مواقعوں کی نسبت سے ان کی جگہیں اکثر تبدیل بھی ہوا کرتی تھیں۔ چند دن پہلے تک ان کے ر ل کا بسیرا ایک میٹرنٹی ہوم کے آہنی گیٹ کے عین بائیں طرف بیٹھے چوکیدار سے چند ہاتھ فاصلے پر تھا

جہاں آنے والی خواتین نئی خوش خبری اور اللہ کو راضی رکھنے کے شوق میں کشکول میں جھنکار پیدا کرنے کا باعث بنتیں تو بعض اوقات اولاد حاصل کرنے والے جوڑے صدقہ و خیرات کرتے۔

یہ جگہ یوں بھی انہیں بڑی موافق آئی تھی کہ اسپتالوں کے باہر بیٹھے سائلوں کو عموماً آتے جاتے مریض اور ان کے رشتہ دار اس لیے بھی کچھ روپے پیسے دے دیا کرتے ہیں کہ شاید ان کے منہ سے نکلی دعا ربّ تعالیٰ کے حضور ان کے شفا اور خوشیوں کا باعث بن جائے مگر پیشہ ور فقیر اکثر ان روپوں کو اپنی دعاؤں کے معاوضے کے طور پر بھی وصول کرتے ہیں مگر جو بھی ہے اور جیسا بھی ہے دینے والا ضرور اس دی گئی رقم کا فکس ڈیپازٹ کئی گنا منافع کے ساتھ وصول کرنے کے لیے اللہ کے پاس جمع کروا دیتا ہے اور ان معاوضہ کی' کی گئی دعاؤں کا نہ سہی مگر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اجر دنیاوی صورت میں بھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

فیکے اور ناجی کا بس چلتا تو اسی جگہ کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیتے لیکن ایک شام بستی واپسی پر جب فیکا قمیص کے اندر چھپایا اور باندھا گیا بازو باہر نکال کر باقاعدہ دونوں ہاتھوں سے سڑک کے ایک طرف بنے کیبن سے بیٹری خرید رہا تھا تو میٹرنٹی ہوم کی مالکن نے نہ صرف اسے دیکھ لیا بلکہ اسی وقت گاڑی سے نکل کر اس کی بے عزتی بھی کر دی اور آئندہ نظر آنے کی صورت میں پولیس کو بلانے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ سو آج کل وہ لوگ یوں ہی کبھی اِدھر کبھی اُدھر کسی اور منافع بخش ٹھکانے کی تلاش میں تھے کہ ہر ماہ کرائے پر حاصل کی جانے والی ریڑھی کا کرایہ بھرنا ان کے پیٹ بھرنے سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

❀---❀---❀

''اچھا اماں! اللہ حافظ۔''

بابر نے صبح سویرے کام پر جانے سے پہلے ماں کو الوداعی کلمات کہتے ہوئے ان کے سامنے سر کو ہلکا سا خم دیا تو وہ پیار سے اس کی کمر تھپک کر ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے مسکرا دیں۔

''اللہ تیرا نگہبان ہے میرے بچے! جا اللہ کے سپرد' اللہ کی امان۔'' اتنی خوب صورت دعا محبت بھرے لہجے اور ماما کے لمس نے بابر کے اندر ایک انجانی طاقت سی بھر دی تھی۔

''اور ہاں بیٹا! اونچ نیچ تو ہر جگہ ہوتی رہتی ہے مگر برداشت کرنے میں ہی بہتری ہے' جب سیٹھ کوئی ایسی ویسی بات کر دے تو بس صبر سے کام لیا کر۔'' وہ رات کو بھی کافی دیر اسے سمجھاتی رہی تھیں اور اب خلاصے کے طور پر یاد دہانی کے طور پر دہرائے جانے پر جملے بھی گزشتہ سے پیوستہ تھے۔

''یہی تو مجھ سے نہیں ہوتا ناں اماں! آخر ہم بھی تو انسان ہیں اگر ذرا سی غلطی ہو جائے تو انہیں بھی لحاظ کرنا چاہیے۔ یہ کیا کہ جھانپڑ لگانے لگتا ہے وہ ٹھیکیدار۔'' بابر کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''بس بیٹا! نوکروں کو نخرہ جچتا نہیں ناں' اس لیے تو اوپر والے پر اپنا معاملہ چھوڑ کر ایمانداری سے بس کام کرتا جا پھر اوپر والا جانے اور نیچے والے۔ وہ بڑا بے نیاز ہے پر سختی بھی ہے' رسّی ڈھیلی کرتا ہی جاتا ہے'

آخری وقت تک وہ یہی چاہتا ہے کہ ہم سدھر جائیں اور گرفت مضبوط نہ کرنی پڑے۔ پر ہم..... ہم انسان بھی تو ضدی ہیں' جب تک خود آگ سے ہاتھ نہ جلالیں یقین نہیں کرتے کہ یہ زرد اور نارنجی سی شے ہمیں جلا کر سیاہ راکھ کا ڈھیر بھی کر سکتی ہے پر تب یقین کرنے کا کیا فائدہ بھلا۔''

نبیلہ جانتی تھیں کہ جوان خون ہے جو عموماً مصلحتوں کا شکار کم ہی ہوتا ہے جس کے لیے عزت نفس اس کی عزیز ترین چیز ہوتی ہے اور جو ہر بات اور عمل کو توازن پر رکھ کر تولتا ہے۔

''اسے دیکھ کر مجھے آپ کی یہی باتیں تو یاد آجاتی ہیں اور میں چپ ہو جاتا ہوں ورنہ اماں دل تو چاہتا ہے کہ ایک گھونسہ اس کے منہ پر مار کر چلا آؤں۔ محنت ہی کرنی ہے ناں کسی اور جگہ جا کر کرلوں۔'' ٹھیکیدار کا ناروا سلوک برداشت کرتے کرتے اب وہ زچ ہو چلا تھا جب ہی نرم لفظوں میں ماں کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کر کے اس کا ردعمل جاننے کی کوشش کی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں جھگڑا فساد کرنے کی' سمجھے؟'' نبیلہ نے پیار بھری خفگی سے کہا۔

''اور اب جاؤ دیر ہو رہی ہے۔'' بات کرنے کے ساتھ ہی نبیلہ نے دروازہ کھول دیا تو وہ ان کے ہاتھوں پر بوسہ دے کر رفتہ رفتہ ہجوم میں گم ہونے لگا۔

''نبیلہ اسی طرح ایک ہاتھ سے دروازہ پکڑے وہیں کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہیں۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے بابر کسی دن.....''

کسی بھی قسم کے خدشے کو زبان پر آنے سے روکنے کے لیے زینب چپ چاپ بس نبیلہ کو دیکھے گئی جس کے چہرے پر عبدالواثق کے دنیا چھوڑ جانے سے کس قدر جھریاں در آئی تھیں۔

''ہاں اندیشہ تو ہے پر اللہ کرے ایسا نہ ہو' ہمارا واحد سہارا بعد از خدا اب بابر ہی تو ہے۔''

وسوسوں کو سلاتے ہوئے بھی نبیلہ نے زینب کے خدشات کی تردید نہیں کی تھی گو کہ واہموں کے ناگ پھن پھیلائے کئی دنوں سے ان کے سامنے رقص کر رہے تھے۔

''جذباتی تو وہ پہلے سے ہے مگر ابا کے جانے کے بعد سے اس کی برداشت تو جیسے بالکل ہی جواب دے گئی ہے۔'' دروازہ بند کر کے پیچھے مڑتے ہوئے وہ بولی مگر نبیلہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوبارہ دروازہ بجا اور ہاتھوں میں سپارہ لیے چند بچے اندر داخل ہوئے۔

انہیں اور محلے کے باقی بچوں کو بھی نبیلہ بڑی نیک نیتی سے نہ صرف سپارہ پڑھایا کرتی بلکہ رموزِ اوقاف تک ذہن نشین کرواتے ہوئے نیکی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بتانا بھی انہوں نے اپنا معمول بنا رکھا تھا۔

عبدالواثق کی وفات کے بعد کبھی کبھار آس پڑوس کے لوگ ان کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر نبیلہ نے اپنی خودداری بچاتے ہوئے سب کو بڑی سہولت سے منع کر دیا یوں بھی ان کے نزدیک بیٹھ کر یا کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر مانگ کر کھانا رزقِ آتش کے برابر تھا اور اپنے ہاتھ سے کی گئی محنت کی کمائی سے تمام دن میں

چند نوالے کھا کر پانی پی لینا ان کے نزدیک بہتر تھا بہ نسبت کسی خیرات میں بخشی ہوئی روٹی سے تین وقت سیر ہو کر کھانا۔

❀---❀---❀

''ہاں بھئی کہاں ہے تیری حق حلال کی کمائی؟'' شام کو گھر پر اکٹھا ہونے کے بعد فیکا آلتی پالتی مارے چار پائی پر بیٹھا آج کمائے جانے والے پیسوں کا حساب کر رہا تھا' باری باری سب سے دیہاڑی وصولنے کے بعد حسبِ معمول آخر میں جانی کی باری آنے پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''ابا آج تو.....'' اس نے بڑی بے چارگی سے ڈرتے ڈرتے دونوں خالی ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلا دیں۔

''ہونہہ! یہ ہے بھئی اس کی محنت کا انعام۔'' فیکے نے طنز کیا۔

''یہ دیکھ چھوٹے ہیں تجھ سے نوشا اور طاقو' اور یہ دیکھ.....'' فیکے نے سلور کا کٹورا ہوا میں لہراتے ہوئے فخر سے پہلے چھوٹے بیٹوں کو دیکھا اور ملال بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے کٹورا عین اس کے سامنے کیا تا کہ اسے وہ پیسے نظر آ سکیں جو ابھی ابھی اس نے گن کر رکھے تھے۔

''دیکھ لے جانی' دونوں کتنے پیسے لے کر آئے ہیں آج پھر اور تو محنت کی' حق حلال کی کمائی..... ہونہہ!'' فیکے نے چہرے کے نقوش بگاڑ کر کہا تو ناجی نے بھی لفظوں کی مار میں اپنا حصہ ڈالنا مناسب اور ضروری خیال کیا۔

''اور کیا..... بلکہ نکڑ والے تندور سے دونوں نے روٹیاں کھائیں اور اکٹھی کر کے ہمارے لیے بھی لے آئے۔'' ناجی نے محبت بھری نظروں سے نوشے اور طاقو کو دیکھتے ہوئے جہاں ان کی کارکردگی کو سراہا تھا وہیں اسے وقت ضائع کرنے پر طنز اور غصیلی نظروں سے بھی دیکھا تھا۔ اسی لمحے جانی کو اپنا آپ بے حد خالی لگنے لگا تھا۔

ذہن پر زور ڈالنے کی اس نے کوشش تو بہت کی مگر کوئی ایسا لمحہ خیال کی گرفت میں نہ آ سکا جس میں ناجی نے اسے بھی ماں ہونے کا احساس دلاتے ہوئے سب کے بیچ یا تنہائی میں سراہا ہو' ممتا بھری نظروں سے دیکھا ہو' محبت سے اس کی کمر پر بھی تھپکی دے کر اس کے بال سنوارے ہوں' اس معاملے میں تو اس کے ذہن کی سلیٹ کوری تھی اور ایسا کوئی بھی نقش وہاں اس کی ممتا کا ثبوت دینے کو حاضر نہ ہوا تھا۔

''ابا! میں نے خود بھائی کو آرام سے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر گاڑیاں گنتے دیکھا تھا۔'' نوشے نے فیکے کے سامنے نمبر بڑھانے کی غرض سے کہا تو وہ جیسے جانی پر پل ہی پڑا۔

''اچھا تو ہمیں کہتا ہے محنت کرتا ہوں ایک چکر میں دو تین کرچیاں چُن کر چند سکے میرے منہ پر دے مارتا ہے اور کہتا ہے حلال کماؤں گا' ہونہہ! دی تو کبھی دمڑی بھی نہیں' گھر سے باہر جا کر بیٹھا رہتا ہے

لفنگے!'' طیش میں آ کر فیکے نے دو ہاتھ اس کی کمر پر جڑ دیئے تھے۔

''ہم تو الو ہیں ناں' سارا دن گالیاں بھی سنتے ہیں اور خوار بھی ہوتے ہیں۔'' فیکے کے منہ سے غصے کے مارے کف بہنے لگا تھا جانی کی آرام طلبی کی رپورٹ اسے جلا ہی تو گئی تھی۔

پینو چپ چاپ گود میں سر رکھ کر لیٹی رانی کے بال انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے ہونٹ کاٹتی رہی۔

''جانی! پیسے کما کر نہیں لائے گا تو تیرے پیٹ کا دوزخ بتا کون بھرے گا اور..... اور میں تو کہتی ہوں یہ روز روز کی بہانے بازیاں چھوڑ اور ہمارے ساتھ دھندے پر جایا کر' نہ کیا کر باپ کو تنگ۔'' ناجی نے دوپہر کو نوشے اور طاقو کی حاصل کردہ روٹیوں کو لمحہ بھر کے لیے پانی میں بھگو کر دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھنے کے بعد ہلکے ہاتھ سے دبایا اور معمولی سا گھی لگے توے پر ڈال کر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں سفید روٹی کی جگہ مدھم سنہری پراٹھا بن چکا تھا اور آج چونکہ دیہاڑی اچھی لگ گئی تھی اور روٹیاں بھی موجود تھیں سو آتے ہوئے فیکا حفیظ کی دکان سے گھی کا ایک ساشہ بھی خرید لایا تھا۔

مار کھانے اور مغلظات سننے کے بعد جانی گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا تھا' ناجی نے روٹیوں کو پراٹھے میں بدلنے کے بعد سب سے پہلے فیکے کو دی اور پھر نوشے اور طاقو کو دینے کے بعد باری باری پینو' رانی اور گڈی کو جو حیرت آمیز نظروں سے توے کو دیکھتیں شاید اس مہک کو اپنے اندر محفوظ کر لینا چاہتی تھیں کہ ایسی عیاشیاں بھلا روز روز تھوڑا ہی ہوتی ہیں۔

فیکا کھانے سے فارغ ہو کر ماچس کی تیلی دانتوں میں دباتے ہوئے حفیظ کی دکان سے بیڑی لینے گیا جس کے بعد اسے کھلے میدان میں موجود اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ گپیں بھی ہانکنا تھیں۔

یوں بھی یہ فقیروں کی بستی نہ تھی اور نہ ہی یہاں کے تمام باسی گداگر تھے بلکہ کچھ ایسے بھی تھے جو مختلف طریقوں سے خود محنت کر کے کماتے۔ فخرو کی بیوی اور بیٹیاں اسے پکوڑے' آلو کی ٹکیاں اور پودینے کی چٹنی بنا کر دیتیں اور وہ سر پر رکھ کر سارا دن تپتی دھوپ میں گلی گلی پھرتا' پہلی ترجیح اس کی اسکول کے گیٹ ہوا کرتے تھے لیکن پھر بھی بعض اوقات سامان بچ جاتا۔ سردیوں میں اکثر اسے مغرب کے بعد سے عشاء تک ابلے ہوئے انڈے بیچتے دیکھا جاتا۔ اسی طرح دینو چھریاں' چاقو تیز کر کے گزر بسر کرتا تو ماجھا اسپتال میں دو وقت جھاڑو پونچھا کرتا۔ اسی طرح بھکاریوں کے چند گھرانے بھی اسی بستی کا حصہ تھے۔

جب گھر کے سبھی افراد اپنے اپنے حصے کی روٹی کھا کر فارغ ہو گئے تو جانی نے بھی چند لقموں کی آس میں آہستگی سے چولہے کی طرف کھسک کر تھوڑی گھٹنوں پر ٹکا دی۔

''جا اٹھ کے چلا جا' کچھ نہیں ہے تیرے لیے۔ سارا سارا دن باہر سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد گھر آ جاتا ہے' ہم تو پاگل ہیں ناں صبح سے شام تک بہروپ بنائے جھولیاں پھیلا کر دنیا والوں کی گالیاں سنتے رہتے ہیں۔'' ناجی نے انتہائی غصے میں ناک پھلاتے ہوئے کہا اور تیل کی بوتل اور چولہا اٹھا کر ایک

طرف رکھا اور اپنی روٹی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانی کے حصے کی روٹی البتہ وہ پہلے ہی نوشے اور طاقو کو انعام کے طور پر دے چکی تھی جو کہ جانی کے لیے یقیناً سزا تھی۔

''اماں بب.....بس تھوڑی سی۔'' بھوکا رہنا اس کے لیے کوئی نیا تجربہ نہ تھا بلکہ وہ تو اس مشق کا عادی تھا لیکن کیا کرتا گھی کی اڑتی ہوئی اشتہا انگیز اور بھوک بڑھاتی خوشبو نے اسے نفس کے ہاتھوں مجبور کر دیا تھا سو بول ہی پڑا۔ ٹھوڑی ہنوز گھٹنوں پر جبکہ آنکھیں ناجی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''ایک لقمہ نہیں دوں گی تجھے۔ آج بھوکا سوئے گا ناں تو کل خود بخود کچھ لائے گا' اگر آج میں نے کھلا دیا تو تیری نکمی عادتیں میری آس پر پکی ہو جائیں گی۔'' وہیں آتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے ناجی روٹی کھانے لگی۔

''کیا یہ ماں ہے میری سگی اور اپنی ماں؟'' جانی نے دلگرفتی سے سوچتے ہوئے دوبارہ اپنی پیشانی گھٹنوں پر ٹکا دی۔ روٹی کھاتی ناجی نے ایک نظر اسے دیکھا اور ''ہونہہ'' کہہ کر دوبارہ چھوٹی چھوٹی برفیاں پانی سمیت حلق سے اتارنے لگی تاکہ ذائقہ دیر تک برقرار رہے۔

ناجی روٹی کھانے کے بعد چارپائی پر جا لیٹی تو پینو نے ماں سے نظر بچا کر سونے کے لیے لیٹ جانے والے جانی کے سامنے اپنی آدھی روٹی لے جا کر رکھ دی جو اس نے خاص طور پر اسی کے لیے بچا کے رکھی تھی۔ جانی نے تشکر آمیز ممنون نظروں سے پینو کی طرف دیکھا تو آنکھیں بھر آئیں۔

ہمیشہ سے جانی کو اپنی یہ پیاری سی بہن باقی سب کے مقابلے میں اپنے دل کے بہت قریب معلوم ہوا کرتی تھی' ناجی کے بجائے وہ اس کا یوں خیال رکھا کرتی جیسے گڈی کی عمر کا ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا پینو نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا اور سلور کے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے حوالے کرنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔

گو کہ وہ سبھی ابھی بچے ہی تھے' انہیں ایک دوجے کا احساس اس طرح تک نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ بچپن کی دہلیز عبور کرتے جوانی کی چوکھٹ کو چھوتے ان سب میں سے باقی بہن بھائی اپنی جگہ لیکن جو انسیت پینو کو جانی اور جانی کو پینو سے تھی وہ دوسرے بہن بھائیوں میں سے کسی میں نہیں تھی۔

یہ چند نوالے آج جانی کو مرغ مسلّم کا مزہ دے گئے تھے سو پانی پی کر صبح کچرا چھانٹنے کے لیے مزید دور جانے کا سوچ کر ان ہی خیالات کا تانا بانا بننے لگا۔

آنکھ کھلی تو تب جب رات کے کسی پہر ایک مرتبہ پھر اسے بھوک نے آلیا' کروٹ بدل کر ابھی لیٹا ہی تھا کہ دن کی تپش اور حبس کے برعکس خراماں خراماں چلتی ہوا اسے شاد کر گئی تھی' فرش پر سونے کی وجہ سے بے تحاشا پسینہ تو ضرور آیا تھا لیکن پسینے سے شرابور گیلے جسم کو چھوتے ہوا کے سبک جھونکوں نے عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

یوں بھی شاید رُت ہی کچھ ایسی تھی کہ دن چاہے جیسے بھی ہوں لیکن راتیں اکثر خوشگوار ہو جایا کرتیں جبھی وقت کا اندازہ کرنے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنا چاہا تو صحن میں بچھی چارپائی پر ناجی اور فیکے کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے جو اس نے مخالف سمت کی طرف گردن موڑی تو وہاں لیٹی پینو پر نظر ٹھہر سی گئی' چند لمحے آنکھیں پھیلا کر غور سے دیکھنے پر اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو ابھی جاگا ہے لیکن پینو جانے کب سے ماتھے پر بازو رکھے آنکھوں کو ڈھانپنے کے باوجود پلکوں کی جھریوں سے انہی دونوں کو دیکھ رہی ہے۔

اس لمحے جانی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے ماں باپ کو اس مدہوشی سے نکالے یوں بھی وہ اب توتلی زبان میں باتیں کرتا بچہ نہ تھا اور خصوصاً پینو شعور کی جس سیڑھی پر قدم رکھ چکی تھی وہ عمر والدین کے لیے امتحان کی ہوتی ہے۔ بعض اوقات والدین' اولاد اور خصوصاً بچیوں کو چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بہت زیادہ دوستیاں کرنا بھی معیوب سمجھتے ہیں مگر گھر کے ماحول کو ان کی بڑھتی عمر کے لحاظ سے ڈھالنا اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ جانی ان دونوں کو مخاطب کر کے کچھ کہتا فیکے نے سفید مومی لفافے سے خاکی کاغذ میں لپٹی برفی کی واحد ڈلی نکالی جس پر لپٹا ورق چاندنی رات میں خوب چمک رہا تھا۔ شاپر خالی ہو جانے پر اسے ادوائن میں ٹھونسنے کے بعد ٹکڑا پہلے ناجی کے منہ میں ڈالا اور پھر ناجی نے فیکے کے منہ میں.....

یہ منظر دیکھ کر جانی کے دل میں تو گویا کانٹے سے چبھنے لگے تھے یوں لگا جیسے کوئی زہر سے بجھی انی اس کے سینے میں آر پار بڑی بے دردی سے کیے جا رہا ہے۔

''کیا انہیں ایک لمحے کے لیے بھی ہم میں سے کسی کا خیال نہیں آیا' جو حلوائی کی دکان سے گزرنے کے بعد بھی مڑ مڑ کر اس وقت تک مٹھائیوں کو دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں اور پھر میں جو صبح سے بھوکا تھا۔'' وہ چپ چاپ سوچے گیا اور جانے کب تک یونہی سوچتا کہ ناجی کی ہلکی سی ہنسی سرگوشی بن کر اس کی سماعتوں میں سیسہ پگھلاتی محسوس ہوئی۔

ایک دم اسے پینو کے بھی جاگنے کا خیال آیا تو کچھ سوچ کر فیکے کی موجودگی کے باعث ہمت کر کے بولا۔

''اماں.....او اماں! بھوک لگ رہی ہے مجھے۔''

اس نے سابقہ حالت میں لیٹے پشت ان کی طرف کرنے کے بعد کہا اور وہ بھی یوں کہ جیسے نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ ان دونوں میں سے کسی کے بھی بولنے سے پہلے خالی کاغذ کے کھڑکھڑانے کی آواز البتہ جانی نے خوب سنی تھی۔

''زندگی اجیرن کر دی ہے اس لڑکے نے۔'' فیکے نے بے زاری سے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

''بھوک لگ رہی ہے تو مجھے کھا لے ہڈ حرام! اس وقت کچھ نہیں ہے میرے پاس' دفع ہو' سو جا۔'' ناجی نے فیکے بے برعکس رات کا لحاظ رکھتے ہوئے آواز دباتے ہوئے کہا جانی کو قطعاً کوئی غرض نہ تھی وہ تو بس

کسی طرح یہ منظر بدلنا چاہتا تھا جس میں سو فیصد کامیاب بھی رہا تھا۔ ہلکا سا رخ موڑ کر اس نے پینو کو دیکھا جو اَب کروٹ لے چکی تھی سو گہری سانس لے کر اپنے ماں باپ کے رویے پر غور کرتا آہستہ آہستہ ایک بار پھر سو گیا۔

❀---❀---❀

''کتنی مرتبہ سمجھایا ہے تجھے برداشت سے کام لیا کر' ٹھیکے دار کچھ بھی کہے بس یہی سمجھ کہ تجھ سے پیچھے کوئی اور لڑکا کھڑا ہے جس سے وہ بات کر رہا ہے لیکن تُو نے.....'' بہتے آنسوؤں نے نبیلہ کو مزید کچھ بھی بولنے سے روک دیا تو وہ خاموشی سے مالکِ مکان سے مستعار لی گئی استری سے اپنا چار تہہ میں کیا گیا دوپٹہ گرم کر کے بابر کے چہرے اور بازوؤں پر ٹکور کرنے لگی جو سیاہی مائل سرخ ہو چکے تھے اس کے علاوہ چہرے پر جا بجا پڑنے والے نیل سے جلد کی ہیئت ہی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔

''اماں وہ.....'' کراہتی آواز میں بابر نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن زینب نے روک دیا۔

''بس اب خاموشی سے لیٹے رہو' بولنے سے تمہیں تکلیف ہوگی جو ہوا یہ ہونا ہی تھا اس لیے دل پر مزید بوجھ نہ ڈالو۔'' زینب نے گرم استری دوپٹے پر اچھی طرح رگڑنے کے بعد ماں کو پکڑاتے ہوئے نرمی سے بابر کو خاموش کروایا اور ماں سے مخاطب ہوئی۔

''اماں! آپ یوں رو رو کر خود کو ہلکا نہ کریں' اللہ کا یہی احسان کیا کم ہے کہ اس کی جان بچ گئی خود سوچیں اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو جاتا پھر.....'' ماں اور بھائی کو حوصلہ دیتے دیتے وہ خود رونے لگی تھی۔ نبیلہ نے جو اسے یوں روتے دیکھا تو میری بچی کہہ کر فوراً سینے سے لگا لیا کچھ دیر تو بابر بڑے ضبط کے ساتھ یہ سب دیکھتا رہا پھر بالآخر بول پڑا۔

''اماں! میں کبھی اس کو اینٹ نہ مارتا بلکہ اینٹ تو کیا جواب تک نہ دیتا لیکن اماں.....'' جب سے وہ زخمی حالت میں گھر آیا تھا انہوں نے اس سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں پوچھی تھی بلکہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر رہ گئی تھیں اب جو بابر خود سے کچھ بتانے لگا تو دونوں اس کی بات سننے لگیں۔

''میں بھٹے سے تیار ہونے والی اینٹیں بڑے دھیان سے گدھا گاڑی میں رکھ رہا تھا کہ موٹر سائیکل پر بیٹھا فدا روز کی طرح مجھ پر آوازیں کسنے لگا' لمحے بھر کو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا ہی تھا کہ نہ جانے کیسے اینٹیں نیچے جا گریں۔ ٹھیکیدار نے دیکھا تو گالیاں دینے لگا' میں پھر بھی چپ چاپ سنتا رہتا لیکن.....'' بات کرتے کرتے اس کی اپنی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں۔

''لیکن اماں! جب اس نے ماں بہن کی گالیاں دینی شروع کیں تو پھر مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے اینٹ اٹھا کر ٹھیکیدار کے سر پر دے ماری۔'' نبیلہ اور زینب کی سرخ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز اور دل بے بسی کے احساس سے شکستہ ضرور تھا لیکن سر فخر سے بلند ضرور ہو گیا تھا۔

''جواب میں فدا اور اکرم نے مجھے مارا لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں نے مصلحت کے ہاتھوں اپنی غیرت کا سودا نہیں کیا۔''

''اللہ تجھے لمبی عمر اور صحت دے میرے بچے! تجھے طاقت دے کہ تو اپنا فرض نبھا سکے۔''

آن کی آن میں آنسو تھم سے گئے تھے ان کے لیے یہ احساس بھلا کیا کم تھا کہ ان کی حفاظت کے لیے ان کے پاس بابر ایک غیرت مند بھائی اور احساس ذمہ داری رکھنے والے بیٹے کی صورت میں موجود تھا۔ ایک مرتبہ پھر آنکھیں جل تھل ہونے لگیں مگر اس دفعہ آنسو شکر کے تھے۔

جبھی ٹکور کی نیت سے ہاتھ میں پکڑے جانے والا دوپٹہ زینب کو تھما کر وہ باورچی خانے کی طرف چلی آئیں جہاں آٹے کا خالی کنستر کسی بھکاری کی طرح راہ دیکھ رہا تھا۔ بھٹے کا مالک ہفتے کے ہفتے پیسے دیا کرتا تھا اور آج بابر کو ملنے والے پیسوں سے ہی آٹا بھی منگوایا جانا تھا جو کہ اب ظاہر ہے کہ منگوایا نہ جا سکتا اور محلے میں کسی سے مانگنا نبیلہ کو کبھی گوارا نہ ہوتا جبھی تین روٹیوں کے گندھے ہوئے آٹے سے روٹیاں بناتے ہوئے چہرے پر کرب اور تکلیف کے تاثرات بھی سجا لیے کیونکہ یہی واحد طریقہ تھا جس سے وہ بابر اور زینب کو پیٹ میں درد کا کہہ کر کھانا کھلا سکتی تھی۔ شام کو کھانے میں کیا ہوگا یا ہوگا بھی کہ نہیں..... یہ سوال بھی اپنی جگہ قائم تھا اسی لیے وہ چاہتی تھی کہ اس وقت جتنا میسر ہے وہ تو کم از کم دونوں شکم سیر ہو کر کھائیں۔

رہی بات نبیلہ کے پیٹ کے درد کی.....تو وہ تو اکثر ہوتا ہی تھا۔

❀---❀---❀

دن خزاں میں جھڑنے والے پتوں کی مانند وقت کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے اکثر دیہاڑی نہ لانے کے باعث ناجی اور فیکے کے نامناسب رویے نے جانی کو بد دل کر دیا تھا۔ آج کل یوں بھی ان سب کا دھندہ بھی سرد پڑ گیا تھا جبھی فیکے نے یہ طریقہ نکالا کہ روزانہ طاقو کے ماتھے اور بازو پر پانی ملی ہلدی مل کر اوپر سفید پٹی یوں باندھتا کہ چوٹ کا گمان ہوتا اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے جا کر کہانی یوں بیان کی جاتی کہ ''جناب ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے پٹی تو ہم نے کروالی لیکن دوا دارو کے لیے پیسے چاہئیں'' اور یہ گُر کافی حد تک کامیاب بھی رہا تھا جبکہ ناجی' گڈی کو افیم چٹا کر بے سدھ بچی کو اسپتال کے گیٹ کے سامنے ہاتھوں پر ڈالے پھرتی اور ساتھ ہی ڈاکٹرز کی سنگ دلی کا رونا روتی کہ روپوں کے بغیر کوئی بھی ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کو تیار نہیں' اس لیے خدارا اس کی چند روپوں سے مدد کی جائے۔

جانی کے پاس آج کباڑیئے کو دینے کو کچھ بھی نہیں تھا کسی وزیر کی متوقع آمد کے باث سارا کچرا گاڑیوں کی مدد سے اٹھا کر ایسی جگہ منتقل کیا جا رہا تھا جو وزیر صاحب کے آنے والے رستے سے نہ ٹکراتی ہو' گو کہ یہ ان کا اپنا حلقہ تھا اور وہ الیکشن نزدیک ہونے کی وجہ سے علاقے کے بہت بڑے تاجر کی مزاج پرسی کے لیے آ رہے تھے سو اداروں نے اپنی کارکردگی دکھانے کی غرض سے سارا کوڑا کرکٹ ہٹوا کر سڑک کے

دونوں اطراف سفید چونے کی لائنیں لگوادیں کیونکہ ان کے ساتھ کیمروں اور صحافی حضرات کا ہونا بھی خارج از امکان نہ تھا اور پھر بعض اوقات بندہ کام کرنے کے بجائے فارغ رہنے سے بھی تھک جاتا ہے' اسی طرح تھیلا کندھے پر ڈالے جانی بھی یوں ہی اِدھر اُدھر گھومتے گھومتے تھک گیا تھا۔

بھوک محسوس ہوئی تو وہ ایک ہوٹل کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بڑی دلچسپی سے وہاں پر موجود چیزوں کو دیکھنے لگا' لکڑی کے کاؤنٹر پر شیشے کے مختلف قسم کے مرتبانوں میں کیک رس' پیسٹریاں اور مختلف انواع بسکٹ موجود تھے جنہیں گاہک اپنی پسند کے مطابق آرڈر کیا کرتے' دائیں طرف بنیان پہنے اکڑوں بیٹھا شخص گدی کی مدد سے جھک کر ایک کے بعد ایک روٹی تنور میں لگاتا اور نکالتا جارہا تھا۔ ساتھ ہی مختلف دیگچیوں میں تین چار قسم کے سالن تھے۔

ہوٹل چونکہ بس اسٹاپ پر تھا اس لیے خوب چلتا تھا اور اکثر ڈرائیور حضرات اور مسافر یہیں کھانا کھایا کرتے تھے۔

جانی حسرت بھری نظروں سے سامنے موجود تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور قریب تھا کہ حاصل کرنے کی تمنا اس کے دل ہی میں دم توڑ دیتی مگر اس کے سامنے غیر متوازن میز پر موجود ایک شخص کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ گاہکوں کے آرام کی خاطر لگائے گئے شامیانے پر جانے کب سے تاک میں بیٹھا کوّا یوں جھپٹ کر لے اڑا کہ وہ شخص بس دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ وہ تو شامیانے میں اس لیے عین فرشی پنکھے کے سامنے بیٹھا تھا تاکہ اندر کے حبس سے بچ جائے لیکن..... اس شخص نے مسکراتے ہوئے گردن کو جھٹکا دیا اور دوبارہ کھانے میں مشغول ہوگیا مگر جانی کے دماغ سے وہ منظر اب تک نہیں نکل پایا تھا۔ ایک خیال بجلی کی مانند اس کے ذہن میں کوندا تھا جس نے اس کے تمام حواس جگا کر رکھ دیئے تھے۔

''لیکن یہ سب کیا ٹھیک ہوگا؟'' اس نے سوچنا تو چاہا مگر کوئی بھی تدبیر اس وقت قابلِ قبول نہ لگی۔ جانی کے لیے اس کی زیست کا وہ ایک لمحہ ہی شاید سب کچھ تھا۔ کندھے پر رکھا تھیلا اسی پل بارِ گراں لگنے لگا تھا۔

''حیرت ہے وہ کم عقل کوّا ہر کام کرسکتا ہے تو میں کیوں نہیں اور کیا میں اتنا بدھو ہوں کہ آج پھر بھوکا سوؤں؟''

جونہی اس نے اس نظریے سے سوچا تو ایک بار پھر فیکے اور ناجی کا رویہ سامنے آگیا جن کے نزدیک مفت میں بچوں کو کھلانے سے کام کرنے کی لگن پیدا نہیں ہوتی اور واقعی ان کے اس طرزِ عمل سے اس کے اندر بھی کام کرنے کی لگن پیدا تو ضرور ہوئی تھی اور بڑی شدت سے ہوئی تھی مگر انداز کچھ مختلف بھی تھا اور منفرد بھی.....

تبھی اب اس کے قدم اس ٹھیلے والے کی طرف بڑی تیزی سے بڑھنے لگے جو بڑے سے گول سیاہ توے پر چھوٹی چھوٹی ٹکیاں سجائے چمٹے کی مدد سے انہیں ہلکا ہلکا دباتے ہوئے بڑی پھرتی سے گاہکوں کو

نمٹانے میں مصروف تھا۔

❀---❀---❀

''لو بھئی آ گیا سب سے زیادہ کمائی والا۔''

پہلے کی نسبت آج وہ ذرا دیر سے گھر پہنچا تھا' گھر کے سبھی افراد موجود تھے اور فیکا تمام حساب کتاب نمٹا چکا تھا۔ پینو نے چونک کر بڑی سہمی نظروں سے اسے دیکھا جبکہ ناجی نوشے اور طاقو کے ماتھے اور ہاتھ پر لگی پٹیاں اتارتے ہوئے لمحہ بھر کو رکی اور پھر مصروف ہوگئی۔

''کاش ان دونوں کی طرح اماں مجھے بھی کبھی اتنے پیار سے بٹھائے۔''

ناجی کو دیکھ کر محبت کے بجائے ایک حسرت سی سردیوں میں سہ پہر کی دھوپ کی طرح اداسی بن کر اس کے دل میں پھیل جاتی اور پھر آج تو وہ تھا بھی بے حد خوف زدہ۔ جتنا ڈر اسے اس وقت اماں ابا کے سامنے لگ رہا تھا اتنا تو اس ٹھیلے والے سے نہیں لگا تھا جہاں سے وہ دل مضبوط کر کے یہ ٹکیاں اٹھا لایا تھا۔ اس سارے معاملے کی خبر فیکے کو ہونے پر جو مار اسے پڑتی اور ناجی سے جو گالیاں سننے کو ملتیں اس تصور سے ہی اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''اس سے تو بہتر تھا کہ میں خالی ہاتھ چلا آتا کم از کم دل کی اس دھڑ دھڑ سے تو بچتا۔'' جانی نے کن اکھیوں سے فیکے اور ناجی کو دیکھا۔

''او فیکے! ذرا بات تو سن۔'' باہر سے آتی ماجھے کی آواز پر فیکا کھوجتی نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹولتا باہر نکل گیا جیسے کہتا ہو ''آ کر پوچھتا ہوں تجھے۔''

سبھی چونکہ کما کر لائے تھے اس لیے چولہے کے گرد بیٹھے روٹی کا انتظار کر رہے تھے' رانی اور گڈی بھی پینو کے ساتھ لگی بیٹھی تھیں

''ملا کوئی کنکر پتھر آج بھی کہ نہیں؟''

پودینہ پیستی ناجی طنزیہ مسکراہٹ سے بولی تو اس نے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اپنا کندھے پر لٹکائے جانے والا تھیلا دیوار کے ساتھ رکھا اور اس میں سے ٹکیاں نکال کر کانپتے ہاتھوں سے ناجی کے آگے کر دیں تو وہ ناسمجھی کی کیفیت میں جانی کا منہ دیکھنے لگی۔ دوسروں کی کیفیت بھی کم و بیش ایسی ہی تھی۔

''باجی.....'' رانی نے پینو کو کہنی مار کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹکیا مانگی۔

''اوں ہوں۔'' پینو نے ناک چڑھاتے ہوئے رانی کو منع کیا تھا۔

''کیا ہے یہ؟'' ناجی نے ٹکیا ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تو دوسرے بہن بھائیوں سے نظریں چراتے ہوئے اس نے مختصراً تمام روداد ماں کے گوش گزار کر دی۔ جانی کی توقع کے برعکس وہ پودینہ چھوڑ کر فوراً اس

سے لپٹ گئی تھی اور جانے کتنے ہی عرصہ بعد اس کے ماتھے پر اپنا بھرپور بوسہ دیا کہ سالوں بعد ہی سہی مگر جانی کی روح سیراب ہوگئی۔

پینو نے انتہائی کرب سے جانی کو دیکھا جو ماں کا والہانہ پیار پا کر لمحے بھر میں کھل سا گیا تھا' چند ثانیے پہلے چہرے پر چھائی پژمردگی' تھکن' اداسی ایک ہی پل میں اڑن چھو ہوگئی تھی۔

''آج میرا جانی بیٹا جوان ہوگیا ہے۔'' خوشی ناجی کے سیاہی مائل ہونٹوں سے بے قابو ہوکر اب اس کے پچکے ہوئے رخساروں پر کھیلنے لگی تھی اور خود جانی اسے تو یاد بھی نہ تھا کہ آج سے پہلے کبھی اسے ماں کی طرف سے اتنا پیار ملا ہو۔

محنت کی کمائی کا مذاق اڑایا گیا تھا اور بس.....

پینو کو حکم دینے کے بجائے ناجی نے قیمے کی ٹکیاں ایک طرف رکھیں اور خود اٹھ کر گھڑونچی سے سلور کے گلاس میں پانی لا کر اسے دینے کے بعد بڑی محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرنے لگی اور جاجی جو چوری کی ٹکیا گھر لانے پر انتہائی خوف زدہ تھا اس غیر متوقع عمل پر حیران سا کبھی ماں کو دیکھتا اور کبھی باقی سب کو۔ جو ماں کی اس کایا پلٹ پر آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھے جا رہے تھے' پینو سے البتہ وہ نظریں چرانے پر مجبور تھا۔

''تو بیٹھ میں فیکے کو بلا کر لاتی ہوں' بڑی فکر کرتا ہے وہ تیری' شکر ہے اب تو سیانا ہوگیا ہے تو وہ بھی سکھ کا سانس لے گا۔'' وہ اس خوشی میں فیکے کو بھی شریک کرنا چاہتی تھی اس لیے فوراً اٹھ کر اسے بلانے چل دی تو پینو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

''اگر تو نے چوری چکاری ہی کرنی تھی تو پھر اس سے بہتر تھا فقیر بن جاتا ہماری طرح' کم از کم لوگ دیتے تو مرضی سے ہیں ناں۔'' بھائی کے اس نئے روپ نے پینو کو بُری طرح دھچکا لگایا تھا' ایک نظر چھوٹے دونوں بھائیوں کو ٹکیوں کی نگرانی کرتے دیکھ کر اس نے ان کی طرف کمر کر لی تھی۔ جواب میں جانی کی وہی ایک چپ تھی' آخر کہتا بھی تو کیا۔

''میں دل میں خوش تھی کہ میرا بھائی محنت مزدوری کرتا ہے' روٹی ہی تو تھی ناں جو ہم دونوں آدھی آدھی کھا لیتے تھے پھر یہ..... یہ دو روٹیاں کھانے کی خواہش کب جاگی تیرے اندر؟'' وہ رو دی تھی بے آواز۔

تھی تو وہ جانی سے چھوٹی لیکن اس گھر میں سب ایک دوسرے کو اپنا ہم عمر ہی خیال کرتے۔

''مم..... مم..... میں نے تو صرف اماں اور ابا کو خوش کرنے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ورنہ.....'' وہ شاید کچھ اور بھی کہتا لیکن فیکے نے آتے ہی دونوں بازو وا کر کے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''واہ بھئی واہ..... اب لگیں گی دیہاڑیاں۔'' فیکے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو چند لمحے خاموش رہ کر حیرت سے اسے دیکھنے کے بعد آخر جانی نے تائید کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بابر کے زخم تقریباً مندمل ہو چکے تھے البتہ بازو دو مرتبہ ہڈی جوڑ سے چڑھوانے کے باوجود ٹھیک نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان لوگوں نے اسے اس قدر بے دردی سے مارا تھا کہ ہڈی ہی ٹوٹ گئی تھی اور پھر گھر میں بھی چار روز سے فاقے ہو رہے تھے۔ نبیلہ نے آخر کار تلاش معاش کے سلسلے میں خود گھر سے باہر نکلنے کا سوچا تھا اور مختلف بنگلوں میں اطلاعی گھنٹی بجا کر ان سے اپنا مدعا بیان کیا لیکن حالات کے باعث بغیر ضمانت کے کوئی بھی کام کاج کروانے کو راضی نہ ہوا تو وہ تقریباً خود کو گھسیٹتے ہوئے واپس جانے لگیں۔ خالی پیٹ' چلچلاتی دھوپ اور کام نہ ملنے پر اندھیرا آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگا تھا وہ خود کو لاکھ سنبھالنے کے کسی کی دور سے آتی گاڑی کو نیم وا آنکھوں سے دیکھتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔

متوازن رفتار سے چلتے چلتے بعض اوقات زندگی یوں رستہ بدلتی ہے کہ خود چلنے والا حیران ہو کر رہ جاتا ہے' کچھ یہی معاملہ جانی کے ساتھ ہوا تھا' کچرا چننے والا تھیلا کہاں رکھا ہے؟ اردگرد کے باسی عموماً کس وقت کچرا پھینکتے ہیں؟ اب اسے ان تمام فکروں سے کوئی غرض نہ تھی کیونکہ اس کی زندگی کی ٹرین غیر محسوس طریقے سے پٹڑی بدل کر اب سابقہ منزل کے برعکس مخالف سمت کی جانب رواں دواں تھی۔ چند ہی دنوں میں اس کے جسم پر ملگجے شلوار قمیص کی جگہ لنڈے کی پتلون اور شرٹ نظر آنے لگی تھی کہ اس نئے کام میں حلیے کا بڑا دخل تھا۔ سابقہ حلیے میں لوگ اسے دیکھتے ہی دھتکار دیا کرتے تھے مگر اب صورتِ حال مختلف تھی اور اب اس کے ساتھ بھی اٹھائی گیرے یا بھیک منگے کے بجائے عام شہریوں کا سا رویہ روا رکھا جاتا۔

چھوٹی موٹی چیزیں چوری کرتے وقت جو تپش اس کے جسم میں خون کے ساتھ دوڑا کرتی اس کا مزہ جانی کو اس کام میں بھرپور متحرک بنا جاتا۔ گو وہ چند ایک بار مار بھی کھا چکا تھا لیکن اب اسے ان چیزوں کی کوئی پروا نہ تھی البتہ چوری شدہ مال بیچنے کی نوبت آتی تو اسی کے استاد کے پاس جا کر بلا جھجک دام کھرے کر لیتا جس کے پاس پہلے کبھی شیشہ' پلاسٹک یا ربر وغیرہ بیچا کرتا تھا۔

وقت سبک رفتاری سے رواں دواں تھا جب انہیں پتا چلا کہ قریب ہی موجود ایک مزار پر سالانہ عرس کی تقریبات شروع ہونے والی ہیں تو طے یہ پایا کہ فیکا دونوں چھوٹے بیٹوں کے ساتھ تین دن تک وہیں قیام کرے گا کہ اس طرح کے مواقع گداگروں کے لیے عید کا پیغام ہوتے ہیں البتہ رانی چونکہ بخار میں پھنک رہی تھی اس لیے سوچا یہ گیا کہ زیادہ بیمار ہو جانے کی صورت میں کیے جانے والے خرچے سے بہتر ہے کہ وہ تینوں گھر پر رہیں تاکہ ناجی گڈی کے ساتھ کام پر چلی بھی جائے تو رانی کے پاس پینو موجود رہے۔

''میں کہاں ہوں اور یہ گھر.....'' ہوش میں آتے ہی نبیلہ نے آنکھیں کھولیں اور نظر چھت پر لگے

آرائشی فانوس پر پڑی تو کہنیوں پر زور ڈال کر اٹھ بیٹھیں۔

''تم بے ہوش ہو کر کوٹھی کے سامنے گر گئی تھیں' اتنے میں فروا بی بی کی گاڑی آئی تو وہ تمہیں اندر لے آئیں اور ڈرپ بھی لگا دی۔

وہ شاید اس گھر کی ملازمہ تھی جس نے بنیادی تفصیل بتا کر نبیلہ کی فطری حیرت میں کچھ کمی کی۔

''بی بی نے کہا تھا جب تم بہتر محسوس کرو تو ان سے مل لینا۔''

''ہاں ہاں' اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

نرم گرم بستر چھوڑ کر پاؤں نیچے رکھے تو دبیز قالین میں پاؤں اندر دھنستے محسوس ہونے لگے۔ کمرے میں ائر کنڈیشنڈ کی ہلکی ہلکی خنکی کے باعث بستر سے نکلتے ہی جیسے کپکپی کا احساس ہوا تھا اور پھر لان کے گھسے ہوئے جوڑے میں ٹھنڈ کا احساس بھی بڑھنے لگا۔

''تمہارے جوتے اُدھر پائیدان پر رکھے ہیں۔'' ملازمہ نے اسے یوں کھڑے دیکھا تو اپنے تئیں اس کی مشکل آسان کی۔

نبیلہ نے بڑے میکانکی انداز میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ساتھ رکھے ڈسٹ بن کو دیکھا جس میں ڈرپ کے ساتھ کچھ خالی انجکشنز بھی پڑے تھے ساتھ ہی کہنی کی اگلی طرف معمولی سی چبھن کا بھی احساس ہوا اور اسی دوران وہ ملازمہ کی ہمراہی میں لاؤنج میں آ گئی جہاں چالیس پینتالیس سالہ خاتون بڑے مصروف انداز میں دو کتابوں سے باری باری کچھ دیکھتیں اور پھر ایک صفحے پر لکھتی جا رہی تھیں' صوفے پر ان کے قریب ہی لیپ ٹاپ بھی موجود تھا۔

''بی بی! یہ جاگ گئی ہے۔'' ملازمہ نے اس کی توجہ ہاجرہ کی طرف مبذول کروائی جو ہونق بنی اس کے دائیں طرف کھڑی تھی۔

''اچھا..... آؤ آؤ بیٹھو۔'' فوراً کتابیں بند کرتے ہوئے فروا نے کہا تو نبیلہ چند لمحے تذبذب کا شکار رہنے کے بعد آخر مخملیں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''میں نے تمہیں باہر سے اٹھایا تھا لیکن پھر بھی میں ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ خودکشی کی اس کوشش کے پسِ پشت ایسے کون سے عوامل اور لوگ ہیں، جنہوں نے تمہیں اس فعل قبیح پر مجبور کیا۔'' فروا نے اندازے سے سوال کیا تھا لیکن جواب میں نبیلہ کی زبانی تمام ماجرا سن کر اپنی رائے بدلنی پڑی۔

''اوہ..... ویری سیڈ۔'' ہاتھ میں لیے پین کا پچھلا حصہ دانتوں تلے دباتے ہوئے انہوں نے کچھ سوچا۔

''ایسا کرو اسے ایک ہزار روپے اور دو تین جوڑے کپڑوں کے دے دو اور جانے سے پہلے کھانا بھی کھلا دینا۔'' کتابیں کھولتے ہوئے انہوں نے ملازمہ کو ہدایت کی جو یقیناً ان کی معتمدِ خاص تھی۔

''معاف کیجیے گا بی بی! مگر میں خیرات نہیں لیتی لیکن ہاں آپ کا یہ احسان یقیناً مجھ پر رہے گا کہ آپ نے میری مدد کی اور ان شاء اللہ آپ کو اس کا اجر ضرور ملے گا۔'' نبیلہ کسی طور اپنی خود داری کو ٹھیس لگنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔

''کیا.....؟'' کتابیں کھولتے ہاتھ وہیں رک گئے تھے۔

''بی بی! بغیر محنت کے دام وصول کرنا جبکہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں حرام سمجھتی ہوں۔''

''ہوں۔'' پُر خیال نظریں نبیلہ کے چہرے پر ٹک گئی تھیں۔

''اچھا ٹھیک ہے تم کل سے کام پر آ جانا اور اپنی بیٹی کو بھی لے آنا وہ رومی بابا کو سنبھال لے گی اور تم گھر کا کام کاج دیکھ لینا' کھانا بھی ملے گا اور تنخواہ بھی اور ہاں اپنے بیٹے کو بھی کہنا کہ سرکاری اسپتال میں' میں چار سے چھ بجے تک بیٹھتی ہوں' پرچی لے کر آ جائے تو میں اسے ہڈی والے ڈاکٹر کے پاس بھیج دوں گی۔'' فروا نے دو منٹ میں سارے مسائل گویا سلجھا کے رکھ دیئے تھے۔

نبیلہ نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا اور کل آنے کا وقت پوچھ کر ہواؤں کے سنگ زینب اور بابر تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔

❀---❀---❀

کتنے ہی عرصے بعد پینو آج گھر پر موجود تھی رانی سوئی ہوئی تھی اور بستی کی خاموشی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ سب اپنے اپنے کاموں پر جا چکے ہیں۔ گھر سے باہر نکلنے کی اسے اجازت نہیں تھی ورنہ باہر گھوم پھر کر وقت پاس کر لیتی لیکن ناجی نے اسے نہ تو کبھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گھلنے ملنے دیا تھا اور نہ ہی اکیلے باہر نکلنے کی اجازت تھی۔ صبح سے شام تک ناجی اور فیکے کے ساتھ بھیک مانگتی اور شام کو گھر آ کر چھوٹی بہنوں کو سنبھالتی۔ باہر کی دنیا سے اسے کوئی واسطہ یا تعلق نہ تھا۔

وہ ناجی جو فیکے کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہوئے پینو کی موجودگی میں کوئی احتیاط یا لحاظ روا نہ رکھتی اسے دوسری لڑکیوں سے صرف اس لیے ملنے جلنے نہ دیتی کہ ان کا ماحول ناجی کی نظر میں ٹھیک نہ تھا۔

کافی دیر یونہی گھر میں بور ہونے کے بعد آخر وہ مختلف طریقوں سے خود ہی رانی کو جگانے کی کوشش کرنے لگی مگر بے سود.....!

جسم بخار کی حدت سے دہک رہا تھا اور پیلی رنگت مزید سرسوں کا پھول بن گئی تھی' تھی تو پینو بھی بچی ہی مگر پھر بھی ذہن نے اتنا کام ضرور کیا کہ اسے کندھے پر ڈال کر حفیظ کی دکان پر جا پہنچی یوں تو وہ اپنی ہی بستی کے راستوں سے کوئی خاص واقف نہ تھی مگر یہ دکان چونکہ ان کے معمول کے رستے میں آتی تھی اس لیے سیدھی وہیں چلی آئی اور پہلی دفعہ دکان کو اندر سے دیکھ کر مزید حیران رہ گئی۔

روزمرہ کے سودا سلف کے علاوہ محدود تعداد میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹس' مختلف ادویات' دہی کی خالی

پراتیں اور دودھ کے دھلے دھلائے ڈرم بھی رکھے تھے جن میں شام کو نزدیکی گاؤں سے آنے والے گوالے سے دودھ لے کر ڈالا جاتا تھا۔

حفیظ سر جھکائے دکان پر ختم ہونے والے سودے کی لسٹ بنا رہا تھا جب پینو ہانپتی ہوئی رانی کو اٹھائے اندر داخل ہوئی' آہٹ پر اس نے چونک کر پہلے تو اس کی طرف دیکھا پھر سانولے سلونے چہرے پر نظریں جمائے پین اور کاپی سائیڈ پر رکھ کر کھڑا ہو گیا جبکہ پینو اس کے یوں گھورنے پر ایک دم گھبرا سی گئی تھی جب ہی فوراً رانی کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کرتے ہوئے اپنی آمد کی وضاحت کرنے لگی۔

''بخار ہو گیا ہے اسے' پتا نہیں کیوں اب تو..... اب تو آنکھیں بھی نہیں کھول رہی۔ میں آئی تھی کہ اگر کوئی دوا ہو تو.....'' اس کے دیکھنے کے انداز سے پینو کی زبان گوشت کے لوتھڑے کے بجائے برف کے ٹکڑے میں بدل رہی تھی' جب ہی الفاظ کی ادائیگی جتنی مشکل اسے آج لگی پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی ورنہ وہ تو پینٹ کوٹ پہنے بابوؤں سے بھی ہاتھ پھیلا کر یوں مانگتی کہ انہیں بھی جان چھڑانے کے لیے کچھ دیتے ہی بنتی لیکن آج گھٹنوں سے بھی اوپر گہری فیروزی قمیص اور ڈیڑھ بالشت پائنچوں کی شلوار میں ملبوس حفیظ کے سامنے وہ تو ہکلا ہی گئی تھی۔

''آنکھیں تو میرا خیال ہے تیری بھی ابھی نہیں کھلیں۔'' دراز میں رکھی پلاسٹک کی پڑیا سے ربڑ ہٹا کر اس نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے چٹکی میں نسوار بھری اور نچلے ہونٹ اور مسوڑھوں کے درمیان بھر کر کاؤنٹر چھوڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تو وہ اس کے دور ہونے کے باوجود بدک کر مزید پیچھے ہٹ گئی۔

''وہ میں تو رانی.....''

دھان پان سی پینو اتنی دیر سے رانی کا بے حس و حرکت وجود اٹھائے شل ہو رہی تھی۔

''ہاں پگلی! میں بھی تو اس کی ہی آنکھیں کھولوں گا ناں' تو پتا نہیں کیا سمجھ رہی ہے۔'' مسکراتے ہوئے حفیظ نے اس کے قریب آ کر دائیں طرف سے تین فٹ کا لکڑی کا ڈبہ اٹھایا تو عطر کی تیز خوشبو پینو کے اردگرد پھیل گئی۔ وہیں پر موجود لکڑی کے چھوٹے سے بنچ پر ڈبا کھول کر اس نے پہلے سفید رنگ کے پاؤڈر کو پانی میں حل کر کے محلول کی شکل دی اور پھر چنے کی دال کے برابر ہلکی گلابی سی گولی پاؤڈر بنا کر اس میں دو قطرے پانی ڈالا اور رانی کے تالو سے چٹا دی۔

پینو جو کہ کچھ دیر پہلے تک ہراساں تھی اب بڑی دلچسپی سے یہ سارا عمل دیکھ رہی تھی' دوا کے اندر جاتے ہی رانی نے رونا شروع کیا تو حفیظ نے بڑی سرعت سے یکے بعد دیگرے دو چمچ سیرپ اس کے حلق میں انڈیل دیا جو کہ یقیناً میٹھا تھا۔ اسی لیے گولی کے برعکس سیرپ منہ میں جانے پر رانی کے رونے کی رفتار میں وہ تیزی نہیں رہی تھی مگر اس کے باوجود اس نے اسے چپ کروانے کی غرض سے بڑے پیار سے پینو کی

گود سے لیا اور کندھے سے لگا کر بہلانے لگا۔

اس دوران پینو دکان میں موجود مختلف فلموں کے چسپاں پوسٹرز کا جائزہ لینے لگی تو حفیظ نے کاؤنٹر میں موجود دراز سے نسوار کی پڑیا کے ساتھ رکھی افیم کی معمولی مقدار روتی ہوئی رانی کے منہ میں ڈال دی وہ چونکہ ویسے روزمرہ کی روٹین میں بھی افیم کھا کر سونے کی عادی تھی سو چند ہی لمحوں میں خاموش ہو کر سو گئی۔ حفیظ نے آہستگی سے اسے دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر لیٹا دیا جس کی ٹوٹی ہوئی رسیاں بوڑھے برگد کی شاخوں کی طرح زمین کو چھو رہی تھیں' پینو نے رانی کو سکون سے سوتے دیکھا تو اطمینان بھرا سانس لیا۔

''کتنے پیسے ہیں دوا کے؟'' پینو نے دوپٹے کے کونے سے بندھی گرہ کھول کر اس میں موجود معمولی ریزگاری نکالنا چاہی لیکن حفیظ نے اس کی ہرنی سی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پینو کو پل بھر میں تمام جسم میں شرارے سے جلتے محسوس ہونے لگے تھے۔

''پیسے تو تجھے میں دوں گا۔'' دائیں کندھے پر رکھے سفید رومال سے چہرہ صاف کر کے ایک طرف اچھالتے ہوئے وہ ذومعنی انداز میں مسکرایا تھا۔

''تُو دے گا؟'' پینو نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''لیکن کیوں؟'' کچھ سمجھ اور ناسمجھی کی کیفیت کا شکار ہوتی پینو نے غائب دماغی سے پوچھا' ذہن کے پردے میں ورق لگی برفی کھلاتے فیکے کا چہرہ جھلملایا تھا۔

جواب دینے کے بجائے اس کے بھاری ہاتھ کا بڑھتا دباؤ اور آنکھوں میں ہلکورے لیتا سوال کچی عمر کی زرخیز زمین پر پہلی بارش بن کر ابھرا تو حفیظ کی طرف سے کی گئی چند ہی چکنی چپڑی باتوں کے جواب میں پینو نے بھی خود کو تصور میں چمکتی کئی چاندنی راتوں کے مسافر بنے ناجی اور فیکے کے ساتھ شریکِ سفر سمجھ لیا۔

جبکہ حقیقتاً اس وقت کی تپتی جھلستی سنسان دوپہر میں ننھی معصوم چڑیا نے بس یوں ہی پریشان ہو کر اپنے بچوں پر پَر پھیلا کر انہیں خود سے قریب کر لیا اور اس روز جب وہ اپنی عمر کا اہم ترین دور گزار کر واپس جانے لگی تب بھی اس کے دل میں کسی قسم کی پشیمانی تھی ملامت اور نہ ہی ندامت اور آخر اس طرح کے جذبات ہوتے بھی تو کیوں؟ کہ یہ سب تو اس کے نزدیک قابلِ گرفت تھا ہی نہیں' ہاں البتہ ایک احساس ضرور تھا کہ وہ آج خود کمائی کر لائی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جس دلدل میں وہ پاؤں رکھ آئی ہے وہ نہایت بدبودار ہے اور وہاں سے واپسی نہایت مشکل۔

وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ کچھ بھی ایسا انہونا نہیں ہوا تھا کہ یہ سب کچھ تو وہ دیکھتی آ رہی تھی اور دوسرے تمام بچوں کی طرح وہ بھی اپنے اماں ابا کے کیے گئے ہر کام کو درست ہی خیال کرتی تھی' جب ہی بہت سے تعلقات' رشتے اور اعمال اگر جائز ہونے اور حلال ہونے کے باوجود پردے کے متقاضی ہوا کرتے ہیں تو

اس فعل کی بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

''ابا نے تو اماں کو کبھی پیسے نہیں دیئے بلکہ ساری دیہاڑی بھی لے لیتا ہے اور حفیظ کتنا اچھا ہے اس نے تو مجھے پیسے بھی دیئے۔ رانی کا علاج بھی کیا اور ستر روپے کلو ملنے والا دودھ بھی مفت میں دے دیا تا کہ رانی جلدی سے ٹھیک ہو سکے۔'' اپنے گھر کی گلی مڑتے ہوئے سے اس نے سوچا۔

ستم تو یہ تھا کہ اسے اس بات کا احساس تک نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کچھ غلط کر چکی ہے بلکہ وہ تو اسی لٹیرے کو اپنا محسن بھی مان چکی تھی جو اس کی متاع چند نوٹوں کے عوض مٹی میں رول گیا تھا۔ کندھے پر کسمساتی رانی نے سوتے میں کچھ کہا تو پینو نے اپنی رفتار تیز کر دی کہ رانی کا بخار کم ہونے اور خود کما کر لانے کی خبر سنا کر وہ جلد از جلد ناجی کی آنکھوں میں اترتے ڈھیر سارے جگنو دیکھنا چاہتی تھی۔

❀---❀---❀

جب سے نبیلہ نے نوکری شروع کی تھی گھر میں سکون کی لہر دوڑ گئی تھی' ان کے بتائے ہوئے ٹائم کے مطابق وہ اور زینب بنگلے پر آ جاتیں' زینب کا کام ننھے رومی کو سنبھالنا تھا جبکہ دوسرا کام نبیلہ اور دوسری ملازمہ مل جل کر بڑے احسن طریقے سے نمٹا لیتیں۔ بابر کا بازو بھی ہڈیوں کے ماہر ڈاکٹر کی زیر نگرانی ہونے والے علاج کے باعث اب بہتر تھا لیکن پھر بھی نبیلہ نے اسے مزید چند روز گھر میں ہی رہنے کا کہا تھا کہ ٹھیکیدار کے بندے اب تک اسے ڈھونڈ رہے تھے کیونکہ ان کے خیال میں اسے غلطی کے برابر سزا نہیں مل پائی تھی اور اگر اس کا ٹھیک ٹھاک انتظام نہ کیا گیا تو کوئی بعید نہیں کہ بھٹے کے دوسرے ملازم بھی ٹھیکیدار کے آگے زبان کھولیں۔

آج فروا کے شوہر تین ہفتوں بعد دبئی سے واپس آ رہے تھے' اس لیے کھانے میں خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا فروا بھی اپنے روٹین کے ٹائم سے پہلے گھر میں موجود تھیں اور بڑی بے چینی سے انتظار کرنے کے ساتھ یوں ہدایات دے رہی تھیں گویا گھر میں ایک نہیں دس لوگ آ رہے ہیں۔

خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ڈرائیور کے دیئے گئے ہارن کے ساتھ ہی فروا اپنی ساڑھی سنبھالے باہر نکل کر استقبال کرنے لگیں تو بوا نے گھبرائی ہوئی آواز میں نبیلہ کو مخاطب کیا۔

''فراز صاحب کے سامنے کسی قسم کی کوئی ایسی بات نہ کر دینا جو انہیں بُری لگ جائے۔''

''میں سمجھی نہیں بوا!'' بوا کی سرگوشی اور بوکھلاہٹ سے نبیلہ نے مزید گھبرا کر زینب کی طرف دیکھا جو رومی کے ساتھ کھیلتے ہوئے بھی ان کی طرف متوجہ تھی۔

''سمجھ جاؤ گی اور اگر نہ سمجھیں تو موقع دیکھ کر خود تمہیں سمجھا دوں گی۔'' ان کی بات کے ختم ہوتے ہی فروا اور فراز ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اندر داخل ہوئے تو نبیلہ اور زینب ٹھٹک کر رہ گئیں۔

''کہاں چالیس پینتالیس سالہ ڈاکٹر فروا اور کہاں وہ بیس پچیس سالہ لڑکا۔'' نظریں ان سے ہوتی

ہوئیں ایک دم بوا سے جا ملیں تو انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام کرنے کا اشارہ کر ڈالا۔

''السلام علیکم صاحب!'' زینب اور نبیلہ کے سلام کرنے پر وہ جو پہلے ہی رومی کو پیار کرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کا جائزہ لے رہا تھا فروا کی طرف رخ موڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''انہیں میں نے کام کے لیے رکھا ہے' ہیں تو غریب مگر بلا کی خود داری ہے اور اسی چیز نے مجھے بے حد اپیل کیا۔'' بوا کی لائی گئی ٹرالی سے فریش جوس گلاس میں منتقل کرتے ہوئے فروا نے جواب دیا اور چھوٹے چھوٹے قدم لے کر فراز کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''اوہ گریٹ!'' سلام کا جواب دینے کے تکلف کیے بغیر اس نے ہونٹ سکیڑے اور گہری نظروں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

''بوا! آپ کھانے کا انتظام کریں تب تک صاحب بھی فریش ہو جائیں گے۔'' فروا نے فراز کے ساتھ بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تو بوا اور نبیلہ اثبات میں سر ہلاتی کچن کی طرف اور زینب رومی کو لیے اس کے کھلونوں سے بھرے پلے روم کی جانب چل دی۔

❀---❀---❀

شام کو وقتِ مقررہ پر ناجی نے آ کر گڈی کو گود سے اتارا' کپڑے کا تھیلا چارپائی پر رکھا' نائلون کی پیلی تار پر ٹنگے کپڑے اتار کر قدرے بہتر حالت والے کپڑے پہنے' زنگ لگی بالٹی میں جمع شدہ گدلے پانی کے محدود استعمال سے ہاتھ منہ دھویا اور چارپائی پر آ بیٹھی۔

''جانی ابھی تک نہیں آیا ناں آج۔'' محض بات کرنے کی غرض سے پینو نے تمہید کے طور پر آغاز کیا۔

''ہاں' کہہ رہا تھا دوپہر کے بجائے شام ڈھلے آئے گا دھندہ زیادہ زور پکڑتا ہے اس لیے شاید دیر سے آئے۔'' ٹیکے کے بغیر آج وہ پیدل گئی تھی اور پہلے تو چونکہ وہ سارا دن ریڑھی میں بیٹھ کر مانگنے کی عادی تھی' اسی لیے آج بے حد تھک گئی تھی سو نڈھال سی جیسے آ کر بیٹھی تھی وہیں آڑھی ترچھی ہو کر لیٹ گئی۔

''آئے ہائے' آج تو بڑا ہی مشکل دن گزرا ہے ٹیکے کے بغیر' اوپر سے مرد ساتھ نہ ہو تو پولیس والے بھی اپنا ریٹ بڑھا دیتے ہیں اور اگر بولو کہ دیہاڑی نہیں لگی تو بھی ہماری محنت پر یوں ہاتھ صاف کر جاتے ہیں جیسے ان کے باپ کا مال ہو۔'' پولیس والوں کو گالیوں سے نوازتی ناجی چت لیٹی پتا نہیں آسمان سے محو کلام تھی یا پینو سے' اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔

اور حقیقتاً وہ کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ صبح وہ جس حال میں رانی کو چھوڑ کر گئی تھی اس پر پینو کا خیال تھا کہ ناجی جانے کیسے دن تو گزار لے گی مگر شام کو گھر آتے ہی سب سے پہلے رانی کو اٹھائے گی' پیار کرے گی اس کا حال پوچھ کر شاید دوا دارو کا انتظام تو نہیں مگر فکر ضرور کرے گی لیکن..... یہاں تو ایسا کچھ بھی نہ تھا۔

نہ تو رانی کا حال پوچھا گیا اور نہ ہی دوا دارو کی کوئی بات ہوئی بلکہ خود اس نے پینو کو رانی کو گود سے نکال کر اپنی ٹانگیں دبانے کو کہا کیونکہ اسے تو شاید ابھی تک یاد بھی نہیں رہا تھا کہ صبح رانی بخار میں تپ رہی تھی۔

''اماں کو تو بس ابا کی فکر لگی ہوئی ہے جو بھلا چنگا ہے اور میلی (عرس) میں گیا ہوا ہے اور یہ رانی جو موت کے منہ سے نکل کر آئی ہے اس کا تو حال تک بھی نہیں پوچھا' وہ حفیظ ہی تھا جس نے اسے اپنا سمجھ کر اس کا علاج کیا اور وہ بھی مفت۔'' ناجی کی ٹانگیں دباتے ہوئے پینو نے رانی کو دیکھتے ہوئے سوچا جو ماں کے آنے کے بعد کچھ کھانے کی منتظر پہلے سے سلور کا کٹورا ہاتھ میں لیے نقاہت کے باعث فرش پر دراز ہو چکی تھی جبکہ گڈی' طاقو اور نوشے کو اِدھر اُدھر ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

''دن تو چلو آج گزر ہی گیا فیکے بغیر' مگر رات کیسے کٹے گی؟'' بایاں بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹی کسی سوچ میں گم ناجی نے کہا تو کئی چاندنی راتیں چھن سے پینو کے من آنگن میں رقص کرنے لگیں۔

فیکے اور جانی کی غیر موجودگی میں جوان ہوتی بیٹی کے ہمراہ رات گزارنا ناجی کو مشکل لگ رہا تھا کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ فیکا آج کل گھر سے باہر اور جانی بھی اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہتا ہے ایسے میں اگر ناجی نے یہ جملہ ادا کیا تھا تو محض غیر محفوظ ہونے کی نیت سے کیونکہ پینو کی جسامت اب اس کی حقیقی عمر کو بڑے دھڑلے سے جھٹلانے پر تلی تھی' اب یہ الگ بات ہے کہ پینو نے یہ جملہ کسی اور ہی طریقے سے سوچا تھا۔

''باجی روٹی دے ناں۔'' رانی اور گڈی دونوں ہی ماں سے زیادہ پینو سے مانوس تھیں سو اسی کو پکارا تو پینو سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''کچھ نہیں ملا آج' جو تھا وہ ریڑھی کا کرایہ ادا کر کے استاد کو دے آئی ہوں مگر کرایہ پھر بھی پورا نہیں بنا۔ ریڑھی بے شک گھر پر تھی مگر کرایہ تو دینا تھا ناں' چل جا سلا دے ان دونوں کو۔''

دھیرے سے بات شروع کرنے کے بعد آخر میں اس نے جھڑکتے ہوئے بات ختم کر کے خود دوبارہ کروٹ لے لی تو پینو جو بات کرنے کے لیے راہ ڈھونڈ رہی تھی بد دلی سے چھوٹی بہنوں کو بہلانے لگی' ناجی نے دیوار کی طرف کروٹ لیتے ہوئے رانی کو کٹورا پکڑے دیکھا تو سکون کا سانس لیا کہ کم از کم اب اس کی حالت بہتر تھی۔

''چلو اچھا ہے جو پیسے اس کی دوا میں لگتے وہ اب کچھ کھانے میں کام آ جائیں گے۔''

دکھتی پنڈلیوں اور مسلسل سارا دن معمول کے برعکس چلتے رہنے کے باعث درد کرتے پاؤں پسارے ہوئے اس نے گھر کی خاموشی کو بے طرح محسوس کیا۔

فیکے کے بغیر گھر کتنا سونا لگ رہا تھا' نہ نوشا تھا طاقو نہ ہی جانی..... ململ کے دوپٹے سے اچھی طرح سر

باندھنے کے بعد وہ چپ سادھ کر لیٹ گئی تھی۔

رانی اور گڈی کو بہلانا پنو کی ذمہ داری تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نا جی سے کہے کہ ''اماں ناشتے کے لیے بے شک پیسے نہ بچا، جو ہیں ان کا کچھ لے آ اور ناشتا میرے پیسوں سے کرلیں گے۔''

مگر بعض اوقات صورتِ حال ایسی ہوتی ہے کہ وہی عام سے الفاظ جو ہم کتنی ہی دفعہ عام زندگی میں بولتے اور سنتے رہتے ہیں انہیں ادا کرنا ہمارے لیے اس قدر مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنی ہی دفعہ الفاظ ہونٹوں تک آنے کے باوجود مایوس سائل کی طرح پھر سے واپس لوٹ جاتے ہیں اور لفظوں کی اصل طاقت کا اندازہ درحقیقت ہمیں اسی وقت ہوتا ہے جب ہمیں خود اپنے کہے جانے والے لفظوں سے بے طرح خوف محسوس ہوتا ہے۔

پنو بھی آج اسی کشمکش کا شکار تھی مگر ظاہر ہے کب تک؟ آخر بات تو کرنا ہی تھی!

❀---❀---❀

بوا کی زبانی نبیلہ اور زینب کو معلوم ہوا کہ تھا کہ فراز اور فروا کی دوسری شادی ہے انٹرنیٹ پر ہونے والی اس دوستی نے ڈاکٹر فروا کو مجید صاحب سے طلاق لینے پر اکسایا تھا وہ ایک امیر شخص ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی نیک دل انسان بھی تھے۔ انہوں نے ہی فراز کو ہسپتال میں ایک انتظامی امور کی کمیٹی میں تعینات کیا تھا اور وہ خود تو ڈاکٹر فروا کی خواہش پر ایک جدید طرز کے ہسپتال کی تعمیر میں اس قدر مصروف ہوئے کہ پھر ان کے پاس فروا کے لیے ٹائم ہی نہ بچتا۔ اسی بے توجہی نے فروا کو ان سے دور اور فراز سے قریب کر دیا۔ اسپتال میں نظروں میں آنے کے خوف سے وہ دونوں موبائل فون یا انٹرنیٹ کا سہارا لیا کرتے اور پھر آخر کار ایک دن دونوں نے شادی کا فیصلہ کرنے کے بعد طلاق لینے کے لیے عدالت سے رجوع کر لیا لیکن مجید صاحب نے عدالتوں کے چکر لگانے کے برعکس خاموشی سے خود انہیں طلاق دے کر نہ صرف بچے بلکہ ہر اس چیز سے دستبردار ہو گئے جو اس دن تک ڈاکٹر فروا کے تصرف میں تھی۔

''اور فراز صاحب کے گھر والے؟'' دانتوں تلے انگلی دبا کر سب کچھ سننے کے دوران نبیلہ نے پوچھا۔

''وہ متوسط طبقے کے لوگ تھے مگر اب اچھی گاڑیوں میں گھومتے ہیں' نئے گھر میں رہ رہے ہیں اور بھلا انہیں کیا چاہیے؟'' بوا نے فراز کے گھر والوں کا ذکر آتے ہی نخوت سے کہا اور پھر موضوع بدل کر بولیں۔

''اللہ فروا بی بی کو سدا سکھی رکھے' بس میری تو یہی دعا ہے۔''

''ہاں بوا' آمین۔'' ڈاکٹر فروا کی خدا ترس فطرت کے باعث نبیلہ کے بھی دل سے ان کے لیے دعا نکلی تھی۔

''اچھا نبیلہ تم ایسا کرو میں سبزی لے آؤں تب تک تم چاول وغیرہ صاف کر لو پھر مل کر کھانے پکا لیں گے۔'' نبیلہ اور بوا میں کافی دوستی ہو گئی تھی سو وہ دونوں سارا دن اکٹھے باتیں بھی کرتیں اور کام بھی نمٹاتی

جاتیں جبکہ زینب کا کام صرف رومی کو سنبھالنا تھا سو وہ خوشی خوشی رومی کے ساتھ ہی مصروف رہتی۔

اس روز بھی ڈاکٹر فروا ہسپتال جا چکی تھی اور فراز اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا جبکہ زینب اسی روم کے ساتھ ملحقہ کمرے میں کھیل ہی کھیل میں رومی کو پڑھا بھی رہی تھی۔

''زینب.....'' وہ رومی کو گود میں لیے اسٹوری سنا رہی تھی جب بنا آواز کے دروازہ کھلا۔

''جج..... جی صاحب جی۔'' اچانک فراز کو سامنے دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی تھی کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس طرح رومی کے کمرے میں آیا تھا۔

''مجھے اسپتال جانا ہے' میرے کپڑے استری کر دو مگر ذرا جلدی۔'' رومی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے حکم صادر کیا۔

''وہ..... لیکن.....'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی ذمہ داری تو صرف رومی اور اس سے متعلق سب کاموں کی ہے لیکن چونکہ اپنے اور اس کے درمیان حائل منصب کی اونچی دیوار کا اندازہ اسے بہت اچھی طرح سے تھا جبھی چاہنے کے باوجود کچھ بھی کہہ نہ پائی تھی۔

''لیکن ویکن کیا؟ جو میں نے کہہ دیا وہ تمہیں کرنا ہے' سمجھیں۔'' سخت نظروں سے گھورتے اس نے جملہ مکمل کیا اور زوردار آواز سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں جا گھسا۔ آواز کی شدت سے زینب کا تو دل دہلا ہی خود نبیلہ بُری طرح یوں چونکیں کہ پیاز کاٹتی چھری ان کی انگلی بھی کاٹ گئی۔

''رومی آپ ایسا کرو میرے آنے تک یہ بلاکس بناؤ میں ابھی آتی ہوں۔'' زینب نے بلاکس کا ڈبہ رومی کو تھمایا اور خود ڈرتی جھجکتی فراز کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

''ادھر آؤ' بیٹھو میرے پاس۔'' اس سے پہلے کہ وہ کپڑوں کا پوچھتی' فراز نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن زینب ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

''میں تو..... آپ..... آپ کے کپڑے استری کرنے آئی تھی۔'' تمام تر ہمت جمع کر کے زینب نے کہا۔

''لیکن میں نے تو تمہیں کسی اور کام سے بلایا ہے۔'' فراز کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا خمار زینب کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن وہ ہمت نہیں ہاری تھی۔

''صاحب جی' ہم غریب ضرور ہیں مگر عزت اور خودداری ابھی ہم میں زندہ ہے' آپ نے جیسا مجھے سمجھا میں ویسی ہرگز نہیں ہوں۔'' اپنے تئیں بات ختم کر کے وہ جانے کے لیے مڑی لیکن فراز نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی جو تھامی تو وہ کسمسا کر رہ گئی۔

''خدا کا واسطہ ہے مجھ پر رحم کریں میں.....'' بے بسی اور تذلیل کے احساس سے اس کے رخسار بھیگنے لگے تھے۔

''تم جتنے روپے یہاں ایک ماہ کام کر کے لوگی اتنے تو میں تمہیں ایک دن کے ادا کر سکتا ہوں پھر تم.....'' اچانک دروازہ کھلنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کہ ہاتھ میں پیاز کاٹنے کی چھری لیے کسی خدشے کے تحت نبیلہ لال ہوتی آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی مگر فراز نہ تو گھبرایا اور نہ ہی بوکھلایا۔

''آؤ آؤ' تم بھی شامل ہو جاؤ اس بولی میں' بولو کتنے لوگی اس کے؟'' فراز نے زینب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبیلہ سے پوچھا۔ زینب کی کلائی بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔

''شرم آنی چاہیے تمہیں' اپنی حیثیت دیکھو اور اپنے کام.....'' نبیلہ کی بات پر فراز کا تو جیسے قہقہہ ابل پڑا۔

''میں کہتی ہوں چھوڑ دو میری بیٹی کو ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' نبیلہ کی دہاڑ سے خود زینب نے سہم کر ماں کو دیکھا کہ یہ روپ اس کے لیے مکمل طور پر نیا ہی تو تھا۔

''بس بس ٹھیک ہے' دام بڑھانے کے لیے زیادہ ڈرامہ بازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے' سیدھی طرح بول کتنے میں معاملہ طے کرے گی؟'' فراز بڑی بے خوفی سے بات کر رہا تھا۔

''میں کہتی ہوں چھوڑ دے اسے ورنہ.....'' ہذیانی کیفیت میں چیختی نبیلہ کی آواز کمرے کی تمام دیواروں سے ٹکرائی تو طنزیہ انداز میں فراز نے زینب کو ایک جھٹکے سے خود سے نزدیک کر لیا۔

''ورنہ کیا..... کیا کرے گی تُو..... ہاں کیا کر لے گی؟'' مگر نبیلہ نے اس وقت آؤ دیکھا نہ تاؤ' ہاتھ میں پکڑی چھری لے کر اس پر پل پڑیں مگر فراز ان سے زیادہ پھرتیلا اور یقیناً اس حملے کے لیے تیار تھا جبھی چھری والا ہاتھ بڑی چابکدستی سے یوں موڑا کہ وہ خود نبیلہ کے پیٹ کو لہولہان کر گیا جبکہ دوسرا وار فراز نے دانستہ سینے پر کیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔

اس تمام واقعے کے بعد وہ رکا نہیں اور آہ و بکا کرتی زینب کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے فوراً سے پیشتر پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگا اور خلافِ توقع پولیس چند ہی منٹوں میں ان کے گھر پر موجود تھی۔

حواس باختہ بوا نبیلہ کے پاس ہی تھیں جبکہ زینب ڈر خوف' صدمے اور فراز کی دھمکیوں کے باعث وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ مقصد وہاں سے فرار کے بجائے موقع پر بابر کو لے کر آنا تھا تاکہ ماں کی میت کو گھر لے جایا جا سکے جو بروقت طبی امداد نہ ملنے اور خون کے زیادہ بہہ جانے کے باعث موقع پر ہلاک ہو گئی تھیں۔

بیٹی کی عزت بچاتے بچاتے وہ خود مٹی کی چادر اوڑھے سو گئی تھیں۔ فراز نے مؤقف یہ اختیار کیا تھا کہ ان دونوں ماں بیٹی نے چاقو کے زور پر اسے چیک سائن کرنے کو کہا لیکن ہونے والی تکرار کے نتیجے میں جب نبیلہ نے چاقو سے اس پر وار کرنا چاہا تو اس نے محض اپنے دفاع کے لیے یہ قدم اٹھایا کیونکہ نبیلہ اور اس کی بیٹی کا تعلق ایک ایسے گروہ سے ہے جو عورتوں کی مدد سے مختلف طریقے اختیار کر کے گھروں میں اس طرح کی وارداتیں اکثر کیا کرتے ہیں اور ثبوت کے طور پر پولیس کے آنے سے چند ہی لمحے پہلے مشتعل

بابر کا گھر میں موجود ہونا تھا اور پھر یہ کہانی تو رسمی طور پر اختیار کی گئی تھی ورنہ وہ یہ قصہ نہ بھی گھڑتا تو بھی وکیل کے تعاون سے اس کی حیثیت انہیں ہر طرح کی سزا دلوانے کو کافی تھی۔ جبھی پولیس ان دونوں کو تو گرفتار کر کے ساتھ لے گئی جبکہ نبیلہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی گئی۔

❀---❀---❀

جانی رات کو دیر سے گھر لوٹنے کی وجہ سے ابھی تک سو رہا تھا۔ رات کوشش کے باوجود پینو ناجی سے بات نہیں کر پائی تھی سو اب اس کے لائے گئے دودھ سے چائے بنانے کے بعد ناجی کو متوجہ کیا۔

''اماں! یہ دیکھ تو ذرا۔'' چولہے سے چائے کی دیگچی اتار کر پینو نے جھڑے ہوئے کناروں کی بدرنگ پیالیوں میں چائے ڈالی' ساتھ پاپے رکھے اور ناجی کو حیران کرنے کی غرض سے دوپٹے کے کونے سے کل کے بندھے ہوئی نوٹ نکال کر ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔

''یہ..... یہ تیرے پاس کہاں سے آئے؟''

چائے کی پیالی میں پاپے بھگوتے ہوئے ناجی ایک دم حیران رہ گئی تھی پینو نے ماں کو سہیلی جان کر مختصراً تمام بات سے آگاہ کر دیا۔ اس کی بات مکمل ہوتے ہی ناجی کے ہاتھ میں پکڑا رسک زیادہ بھیگ جانے کے باعث ایک دم چائے میں چھپاک سے گرا تو چائے کے چھینٹوں سے ان دونوں کے کپڑوں کے مزید داغ بڑھ گئے۔

ناجی کے سیاہی مائل چہرے پر اس کی سفید آنکھیں پھیلیں تو اس حد تک پھیلتی چلی گئیں کہ پینو کو اس سے خوف آنے لگا۔ اس نے چند ثانیے اردگرد بکھری چائے ساتھ رکھے روپوں اور سامنے بیٹھی پینو کو دیکھا جس کا وجود نہ جانے کب اتنے بھرپور اور سڈول سراپے میں تبدیل ہوا کہ اس کی سارے دن کی خواری' جھڑکیوں اور گالیوں کے بدلے حاصل ہونے والی رقم سے زیادہ وہ ان چند گھنٹوں میں لے آئی تھی۔ ایک عجیب طرح کی میٹھی سی سنسنی کا احساس تھا جو ریڑھ کی ہڈی سے ہوتا ہوا اس کے جسم میں سرایت کر گیا اور بس زیست کا وہی ایک لمحہ تھا جب ناجی کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے بیٹھ کر کھانے کے دن آ گئے ہیں۔ کچھ دیر سوچ کر ایک نکتے پر پہنچنے کے بعد آخر وہ بولی۔

''کیا دوبارہ بھی بلایا ہے؟''

''ہاں آج..... اسی وقت۔'' پینو نے مختصر سا جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اور سن..... یہ لے پیسے' ساتھ والے کھوکھے سے کاجل اور سرخی لے کر لگا لینا۔'' ناجی نے اسے بیس روپے کا ایک نوٹ دیا تو وہ خوش ہوگئی۔

اور ہاں جو پیسے بچیں ان سے بے شک کوئی سونف سپاری لے لینا اور جاتے ہوئے الائچی ضرور پھانکنا۔'' ناجی نے گہری نظروں سے کچھ سوچتے ہوئے اس کے گال پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو

اس نے خوش ہو کر ماں کے ہاتھ کو ہی چوم ڈالا۔ وہ ناجی جو جوان ہوتی بیٹی کے ساتھ گھر میں رات گزارتے ہوئے گھبرا رہی تھی آج پیسے ہاتھ میں آئے تو خود بخود گُر بھی بتانے لگی' اس بات سے بے خبر کہ چٹائی پر سویا جانی دھوپ پڑنے کی وجہ سے چند لمحے پہلے جاگنے کے بعد محض کسلمندی سے لیٹا ہے اور ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو بڑے ضبط سے بہ خوبی سن رہا تھا جب ہی ان دونوں کے سر پر آ پہنچا۔

''شرم آتی ہے تجھے ماں کہتے ہوئے' ماں نہیں تُو اپنے انڈے خود پینے والا سانپ ہے سانپ.....''

غصے سے جانی کے منہ سے کف بہنے لگا اور یوں بھی اب وہ پہلے والا جانی تو تھا نہیں دھندے کے ساتھ اس کی ذات میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی۔

''دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تیرا۔'' ناجی نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

''ارے مائیں تو مر جاتی ہیں اپنی بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے اور تُو.....تُو خود اسے سکھا رہی ہے کہ زیادہ دام لینے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح بیچا جاتا ہے' کیوں حرام کاموں میں ڈال رہی ہے اسے۔ پہلے کیا کم حرام ہو رہا ہے یہاں؟'' ناجی کے اس لالچ نے جانی کو برہم کر دیا تھا۔

''ایسا کیا ہو گیا ہے جو جانی اس قدر غصے میں ہے۔'' پینو کھٹک تو ضرور گئی تھی مگر پھر بھی اچانک صورتِ حال کی تبدیلی پر ابھی وہ مکمل طور پر سمجھ نہیں پا رہی تھی البتہ ناجی اچھی طرح جان گئی تھی کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

''ہونہہ آیا بڑا غیرت والا' ارے حرام اور حلال کی تمیز وہ سکھاتے ہیں جن کے ہاتھ میں حرام سے پیٹ بھرنے والوں کے لیے حلال کا نوالہ ہو اور پھر تو بڑا حلال کا کھاتا ہے جو مجھے سبق دے رہا ہے۔ بول کس بات پر بڑھکیں مار رہا ہے؟'' اب کے ناجی نے بات ختم کرتے ہوئے اسے چارپائی کی جانب دھکا دیا۔

''یہ پینو ہو گی ناسمجھ' مگر میں کوئی بچہ نہیں ہوں سب جانتا ہوں کہ کیا کروا رہی ہے تُو اس سے۔'' بات نکلی تو جو ذرا سا لحاظ تھا وہ بھی جاتا رہا۔

''پینو میری بہن! یہ عورت تیری زندگی ایسے تباہ کر دے گی کہ تُو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی' تُو جیتے جی مر جائے گی اور اپنی زندہ لاش کا بوجھ نہیں اٹھا پائے گی۔'' اس تمام عرصے میں وہ پہلی مرتبہ پینو سے مخاطب ہوا تھا جو حواس باختہ سی دونوں کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ سن رہی تھی۔

''بکواس بند کر اپنی.....'' ناجی نے گالی دیتے ہوئے ربڑ کا جوتا پوری قوت سے جانی کی طرف اچھالا تھا۔

''تُو جو بھی کرے میں اپنے جیتے جی کچھ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' جانی نے کھا جانے والی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''چل دفع ہو پینو! پھینک یہ پیسے اور گھر بیٹھ' ٹانگیں توڑ دوں گا تیری اگر ایک قدم بھی باہر نکالا تو۔''

جانی کی غراہٹ اس کی عمر سے کہیں بڑھ کر تھی جو ناجی کو چونکنے پر مجبور کر گئی۔ پینو کو بھی اس بات کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ یقیناً کچھ غلط ہو گیا ہے اور آئندہ بھی ہونے والا ہے۔

''دفع ہو جا یہاں سے' نکل جا اور آج کے بعد مجھے شکل نہ دکھانا اپنی ورنہ..... ورنہ ٹانگیں تو تیری میں توڑ دوں گی۔'' مسلسل گالیوں سے نوازتے ہوئے ناجی نے کہا تو اس نے ہمدردی کی نظر سے پینو کو دیکھا جس کا رنگ ان دونوں کی بات چیت کے دوران زرد ہوا اور آنکھوں میں بھی پانی بھرنے لگا تھا۔

''مر گیا آج سے میں تم سب کے لیے اور بس.....'' ہونے والا مکروہ انکشاف اور پھر بجائے شرمندگی ناجی کی ہٹ دھرمی سے جانی کا خون کھول اٹھا تھا سو اس نے فوراً باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے شاید کبھی واپس نہ آنے کے لیے.....!

❀---❀---❀

''اچھا چل تو نے نہیں بتانا تو نہ بتا پر یوں افسردہ نہ بیٹھ یار!'' بٹو نے اکتا کر اسے دیکھا۔

صبح سے رات ہو چلی تھی آج نہ تو اس نے کچھ چرانے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی کھانے کی طلب ہوئی۔ دن بھر گٹر کے ڈھکن پر بیٹھا اپنے جیسے ٹولی کے دوسرے لڑکوں کی زندگی پر غور کر رہا تھا جنہیں بہر حال اپنی ماں سے محبت ضرور تھی لیکن اس کے دل میں معاملہ ذرا مختلف تھا جہاں فی الوقت ماں کے لیے ایک الاؤ دہک رہا تھا۔ دل تھا کہ کسی یتیم بچے کی طرح بلک بلک کر بس روئے ہی چلا جا رہا تھا۔

باپ کا رشتہ اگر دنیا سے منہ موڑ بھی جائے تو اولاد کے لیے ماں کی آغوش سدا وا ہی رہتی ہے لیکن حیرت انگیز بات تھی کہ اس کے لیے پہلے بھی ماں کی محبت دیہاڑی سے مشروط تھی اور اب بھی اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ ناجی اور فیکے کے ساتھ بھیک مانگنے جاتا تھا۔ وہ دونوں اسے ہاتھ میں کٹورا پکڑا کر جس بھی علاقے میں بھیجتے وہ بجائے اس کے کہ صدائیں لگا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا بس یونہی گھومتا گھماتا شام کو پھر ان کے پاس جا پہنچتا جہاں ہمیشہ کی طرح ماں باپ کی طرف سے گالیاں اور جھڑکیاں اس کی راہ دیکھ رہی ہوتیں۔

دونوں چھوٹے بھائی البتہ اس ہنر میں طاق تھے چہرے پر مسکینی طاری کرتے ہوئے اس وقت تک راہگیر کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے جب تک کہ وہ کچھ دے نہ دیتا' نتیجتاً ناجی اور فیکے کے پیار اور ستائش کا حق دار ٹھہرے۔ ناجی کا ان کے ساتھ پیار بھرا انداز ہمیشہ اس کے دل میں حسرت بن کر ابھرتا۔

رات کو سوتے ہوئے یہ خواب بھی وہ جاگتی آنکھوں سے بڑی باقاعدگی سے دیکھا کرتا جس میں ناجی اس کے لاڈ کرتے ہوئے کبھی اس کی پیشانی چومتی اور کبھی ممتا بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے نرم آواز میں باتیں کرتی۔ یہ اس کا ایسا پسندیدہ خواب تھا جسے تصور کی آنکھ سے' دیکھتا اکثر وہ سو جایا کرتا مگر پھر بھی نہ تو اسے کبھی سونے میں ایسا کوئی خواب نظر آیا اور نہ ہی کبھی خواب نے 'حقیقت کا روپ دھارا' ظاہر

ہے خواب تو خواب ہوتے ہیں ناں اور پھر جاگی آنکھوں سے دیکھے گئے خواب جن کی حیثیت اور جن کا وجود قطرہ قطرہ پگھلتی برف سے بڑھ کر ہرگز نہیں ہوتا۔

یوں ہی بیٹھے بیٹھے اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے جامی کو دیکھا جو ہاتھ میں صمد بونڈ کی پیلی ٹیوب پکڑے چلا آ رہا تھا انہیں دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا تو جانی کے ساتھ بیٹھے لڑکے اس کے پیچھے موٹے موٹے سے پائپوں کے سروں پر جا پہنچے' بٹو نے جانے سے پہلے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف کھینچ لیا تھا' پائپوں کے سرے پر پہنچتے ہی سب نے جیبوں سے ایک ڈیڑھ فٹ لمبی کپڑے کی پٹیاں نکالیں جو انہوں نے کچرے سے اٹھائی تھیں اور قریبی لگے بلدیہ کے نل سے ان پر پانی بہا کر اپنے تئیں صاف بھی کر لیا تھا۔

''لے جگر' آج میری طرف سے.....!'' جامی نے جیب سے کپڑے کی دو پٹیاں نکال کر ایک جانی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن.....لیکن یہ ہے کیا؟'' وہ حیران تھا۔

یہ درست تھا کہ دن کے وقت وہ اکثر ان سے ملتا رہتا تھا کیونکہ وہ پہلے انہی کے ساتھ مل کر کچرہ چنا کرتا تھا لیکن ان سب کے ساتھ رات گزارنے کا یہ تجربہ پہلا تھا اور یہ ٹیوب تو وہ استاد کے کباڑ خانے میں اس کے کاریگروں کو مختلف چیزیں جوڑنے کے لیے استعمال کرتا دیکھتا تھا' سب ہی کچھ نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت میں دیکھنے لگا۔

''بس تُو یہ سمجھ لے پیارے کہ سیٹھ لوگ اپنا غم غلط کرنے کو جام کا چسکا لیتے ہیں تو آپن جیسے لوگ دکھ مٹانے کو یہ طریقہ اپناتے ہیں۔ بس ہمیں دیکھ کر کرتا جا' سارے غم' دکھ تکلیفیں تُو بس دیکھ فٹاک سے دور۔'' غموں کو خیالی طور پر چٹکی بجا کر دور پھینکتے ہوئے اس نے کپڑا جانی کی مٹھی میں دبایا اور دائیں آنکھ بند کر کے ایک دفعہ پھر تلقین کی۔

''لیکن یار یہ چیزیں وغیرہ جوڑنے کے لیے.....'' وہ بولے بنا رہ نہیں پایا تھا۔

''زیادہ سوال کرنے کا نئیں اے کیا' ابے الّو دوسرا مال مہنگا بھی ملتا ہے اور پولیس کا بھی ڈر رہتا ہے پھر یہ پچاس روپے کی ٹیوب خریدنے پر کسی کو شک بھی نہیں ہوتا ویسے بھی آپن کا دل بھی تو ایک ٹوٹی ہوئی چیز ہی ہے ناں..... کیا بولتا ہے؟'' سب ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے تھے مگر جانی کے لیے فضا ایک دم بوجھل سی ہو گئی تھی کاش ایسا ہوتا کہ ہم اپنے دکھ درد تکالیف اور ادھوری بین کرتی حسرتیں دھوئیں کی طرح فضا میں اڑا سکتے لیکن باوجود اس کے کہ زندگی سلگتے سگریٹ کی طرح لحہ بہ لحہ ختم ہو رہی ہے پھر بھی ہم اپنے وجود کے اندر راکھ ہوتی حسرتوں کو کاش کے جزدان میں لپیٹے دل کے اعلیٰ ترین مقام پر سجائے رکھتے ہیں۔

رات کا اندھیرا اپنی تمام تر پُراسراریت سمیت ان سب پر حاوی ہو رہا تھا پھر ان سب کے اصرار پر ہی جانی نے بھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کے بوسیدہ سے ٹکڑے کو الف کی شکل دے کر ایک سرے پر صمد بونڈ لگائی اور پھر روٹی کے لیے بنائے گئے پیڑے کی طرح گول کر کے منہ کے سامنے رکھا اور اندر کی طرف سانس کھینچنے لگا۔ شروع کے دنوں میں گو کہ جانی کو کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا مگر حاصل ہونے والا سرور اس سے کہیں زیادہ تھا جب ہی ان سب کی محبت کا اثر قبول کرتے ہوئے اس خوابناک سرزمین پر قدم رکھتا ہی چلا گیا۔

❀---❀---❀

فیکے کو طاقو اور نوشے کے ساتھ عرس پر گئے تیسرا روز تھا اور پروگرام کے مطابق کل دوپہر کو انہیں واپس آ جانا تھا۔ دو دن تک پینو خود ناجی کے سمجھانے بجھانے اور اس کے بعد زبردستی بھیجنے پر دکان پر جاتی رہی تھی۔ اس دن جانی اور ماں کے درمیان ہونے والی بحث اسے بہت کچھ سمجھا گئی تھی اسی لیے دوسرے روز جب ناجی نے جان بوجھ کر کام سے چھٹی لی اور وقت مقررہ پر اسے جانے کا یاد دلایا تو اس نے صاف منع کر دیا جس پر ناجی نے اسے اپنے چکنے چپڑے انداز میں سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی مگر اس کے نہ ماننے پر دھمکیوں پر اتر آئی تو ڈبڈبائی آنکھوں سے ماں جیسے رتبے کو اپنی پھٹی ہوئی سیاہ ایڑیوں تلے روندتی اس عورت کو دیکھتے ہوئے آخر وہ گھر سے نکل آئی۔

اس دن عرصہ بعد ناجی بڑے آرام اور سکون سے گھر پر رہی تھی مگر پھر بھی تاکید اس نے پینو کو یہ ہی کی تھی کہ حفیظ کے سامنے یہ ہی کہے کہ اس کے آنے کا گھر میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہے نہ صرف یہ بلکہ اس سے پیسے لینے کے بعد ناجی نے اسے دکان سے ایک دو چیزیں بھی لے آنے کو کہا تھا۔ اسی طرح دو دن تک اس کے پاس جانے پر حفیظ آتے ہوئے اس کی مٹھی میں چند نوٹ تھما کر خاموش رہنے اور گھر میں ذکر نہ کرنے کا کہتا۔ پہلے دن پینو کی نادانستگی سے شروع ہونے والا عمل ان دو ہی دنوں میں اسے ذہنی طور پر اپنی عمر سے کئی گنا بڑا کر گیا تھا۔

ناجی اور جانی کے درمیان ہونے والی بحث اور جانی کے ردعمل سے اب اسے خود اپنے آپ پر شرمندگی ہوا کرتی تھی۔ جانی کا فرطِ جذبات سے گلوگیر لہجہ اور اس کی خاطر پہلی مرتبہ ماں کے سامنے زبان درازی کرنا اور سب سے بڑھ کر ان کو چھوڑ کر جانا پینو کو رہ رہ کر دکھ دے رہا تھا۔ ناجی کا خیال تھا کہ وہ واپس آ جائے گا مگر پینو کو یقین تھا کہ اب ایسا نہیں ہوگا' وہ نہیں جانتی تھی کہ کب اور کن حالات میں اب دوبارہ وہ اپنے بھائی سے مل پائے گی اور مل پائے گی بھی کہ نہیں..... ابھی بھی دکان سے واپسی پر یہی کچھ سوچتے سوچتے ابھی گھر کے اندر آئی تھی کہ گڈی کو اٹھائے ناجی دردناک آواز میں بین کرتی اندر داخل ہوئی۔

''ارے پینو! ہم لٹ گئے رے' برباد ہوگئے۔ ہمارا تو کچھ نہیں بچا..... ہائے ہم تو لاوارث ہوگئے آج۔'' بال نوچتے ہوئے ناجی نے روتے' بین کرتے ہوئے چلاتے ہوئے کہا تو وہ بوکھلا گئی۔

''اماں کیا ہوا' خیر تو ہے ناں؟ کچھ تو بول تو سہی.....؟'' دھڑ دھڑ کرتے دل میں فوراً جانی کے نام کی بازگشت شروع ہوگئی تھی۔

''ہائے میرے اللہ میں تو جیتے جی مرگئی اپنے سر کے سائیں کے ساتھ' ہائے میرے معصوم بچے او میرے ربا..... او میں کیا کروں.....؟'' کمر کے گرد دوپٹہ باندھ کر وہ صحن کی عین بیچوں بیچ کھڑی سینہ کوبی کرنے لگی تھی۔ بالوں کی بکھری ہوئی لٹیں کندھوں سے ہوتی ہوئی آگے آرہی تھیں اور پینو جو بت بنی ساکت وساکن کھڑی تھی یہ خبر سنتے ہی اپنے حواس کھونے لگی۔

''ہائے بدبختو..... دوزخ جلو جاکے' ہائے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا..... میرے معصوم بچے راکھ ہوگئے..... میرا فیکا..... میرے سر کا تاج.....'' ناجی کے رونے اور سینہ کوبی کی آواز سن کر آس پڑوس کی عورتیں بھی آن کے آن میں ان کی گھر جمع ہوکر اس کی تقلید کرتے ہوئے ماتم کناں ہوگئیں۔

فیکے کی جوان اور طاقتور اور نوشے کی معصومانہ موت پر ہر آنکھ اشک بار اور ہر دل غمناک تھا۔ رانی اور گڈی اس اچانک پیدا ہونے والی صورتحال سے خوفزدہ چپ چاپ بے ہوش پینو کے پاس بیٹھی تھیں۔ چند عورتوں نے گھڑونچی سے پانی نکال کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارنا شروع کیے تو وہ ہوش میں تو آگئی لیکن اب بھی اس کا دل ہرگز یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ ابھی چند لمحوں پہلے ناجی کی کہی گئی باتیں واقعی حقیقت ہیں۔

''کیوں..... کب اور کیسے.....؟'' یہ سب کچھ پوچھنے کا تو ہوش بھی نہیں رہا تھا۔

سینہ کوبی کرتی ناجی بھی غشی کے دوروں میں بھی بین ہی کررہی تھی ایسے میں وہاں موجود عورتوں نے انہیں بڑا سہارا دیا۔

''اری ہوا کیا انہیں..... کچھ پوری خبر ملی کہیں سے؟'' ایک ادھیڑ عمر عورت نے بے ہوش پڑی ناجی کا سر اپنے گھٹنے پر رکھتے ہوئے آرام سے سہلاتے ہوئے پوچھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ناجی کو کچھ دیر کے لیے ہوش میں نہ ہی لایا جائے تو بہتر ہے اس لیے کہ شوہر اور دو بیٹوں کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے اس کے دل اور دماغ کو یقیناً کچھ مہلت درکار ہوگی۔

''بس چاچی! بے چاروں کی قسمت..... کالو بتا رہا تھا کہ مزار پر عرس کی وجہ سے لگائی جانے والی بتیوں میں کرنٹ سے ایک دم آگ لگ گئی تھی' سب بھاگے تو بھگدڑ میں کئی لوگ مارگئے' کچھ تو وہیں جل بھی گئے۔'' دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرکے ناک رگڑتے ہوئے نصیبو نے کہا۔

''بڑا پیار تھا دونوں میں' ایک دوجے کو دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔'' سکھاں نے بے تاسف سے گلوگیر لہجے میں بات کرتے ہوئے ترحم آمیز نظروں سے سامنے بے ہوش پڑی ناجی کو دیکھتے ہوئے کہا تو سسکیاں

لیتی باقی عورتیں بھی ہاں میں ہاں ملانے لگیں حقیقتاً سبھی کو اس سانحے کا دلی طور پر رنج تھا۔ وقفے وقفے سے وہ پینو اور دوسری دونوں کو بھی دلاسا دیئے جاتیں گو کہ ان کی مدد کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ وہ سب اسی طرح کے کاموں سے منسوب تھے جس میں روٹی کا تعلق دیہاڑیوں کی بنیاد پر ہوتا ہے مگر پھر بھی اخلاقی طور وہ جتنی مدد کر سکتی تھیں وہ کر رہی تھیں۔

اچانک ناجی ہوش میں آ گئی تو باوجود اس کے کہ اس کی آواز بیٹھ چکی تھی مگر پھر بھی روتے ہوئے دوبارہ بال نوچنے اور سینہ کوبی کرنے لگتی۔ ماں کے ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے پینو کبھی تو اس کے ہاتھ چوم کر اپنی نم آنکھوں پر لگاتی اور کبھی خشک ہونٹوں پر۔

لیکن کچھ ہی دیر میں برداشت ختم ہوگئی تو ناجی ایک بار پھر عورتوں کے بازوؤں میں جھول گئی۔ کئی چمکتی چاندنی راتوں پر گہن لگنے کے بعد اب گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ پینو دونوں چھوٹی بہنوں کو سینے سے لگائے کبھی بآواز بلند روتی تو کبھی خود ہی چپ ہو کر انہیں حوصلہ دینے لگتی جو ان تمام مناظر سے ہراساں ہو کر سہمی بیٹھی تھیں۔

❀---❀---❀

دنوں کو گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے گو کہ مشکل وقت سردیوں کی خشک راتوں کی طرح طویل ضرور لگنے لگتا ہے لیکن بہر حال رکتا وہ بھی نہیں اور درحقیقت وقت کا گزر جانا بھی ربّ کریم کی کروڑہا نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ سو جیسے تیسے کچی بستی کے اس چھپر نما مکان میں بھی دن گزر رہے تھے لاشعوری طور پر ناجی اور پینو دونوں کو ہی جانی کا بڑی شدت سے انتظار تھا جو ان دونوں کی توقع کے برعکس لوٹ کر ہی نہ آیا تھا اور نہ ہی بستی کے کسی فرد نے اسے کہیں دیکھا تھا۔

صوبائی حکومت کی طرف سے حادثے میں جاں بحق شدگان کے وارثین کے لیے جتنی رقم کا اعلان کیا تھا اس سے نصف ضلع انتظامیہ کو ملی تھی۔

کالو نے ناجی کو روپے ملنے کی بابت آگاہ کیا تو وہ بھی اپنا حصہ لینے دفتر جا پہنچی جہاں اس کی حیثیت کا اندازہ کرتے ہوئے کئی طرح کی کٹوتیاں کرنے کے بعد مختصر سی رقم اس کے حوالے کی گئی جس روز ناجی وہ رقم لے کر گھر پہنچی' رانی اتنے سارے روپے اکٹھے اس کے ہاتھ میں دیکھ کر فوراً اپنی انگلیوں پر حساب کرنے لگی۔

''ابا..... نوشا اور طاقو..... تین لوگوں کے مرنے پر اتنے روپے ملے ہیں' اللہ کرے اگلے عرس میں گڈی بھی مر جائے تو کچھ اور پیسے بیٹھے بٹھائے مل جائیں گے۔''

رانی نے میل بھرے ناخن سے سر کھجاتے ہوئے کہا تو ناجی سے اور تو کچھ بن نہ پڑا تیل کی خالی بوتل اسے دے ماری اور وہ روتی ہوئی پینو کے گلے جا لگی کہ اپنے تئیں تو اس نے گھر کے فائدے ہی کی بات کی

تھی یوں بھی نہ تو اتنے روز سے ناجی کام پر گئی تھی اور نہ ہی پینو۔ کھانے والے اب چار تھے تو کمانے والا ایک بھی نہیں بچا تھا سو زندگی ربڑ کے جوتے کی مانند آہستہ آہستہ گھسنے لگی۔

جانی کے لیے زندگی مکمل طور پر بے معنی ہو کر رہ گئی تھی' پہلے تو پیٹ بھرنے اور گھر والوں کے طعنوں سے بچنے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا تھا لیکن اب تو سارا دن شہر کے تقریباً آخری علاقے میں موجود ہوٹل کے آگے بس گم صم سا بیٹھا رہتا جس سے کم از کم اتنی رقم تو ضرور اکٹھی ہو جاتی کہ وہ نشے میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ ہوٹل بند کرتے وقت مالکان کچھ بچا کھچا بھی اسے دے جاتے جس سے وہ پیٹ کا ایندھن بھرتا اور اکثر ہی سوچتا۔

''حیرت ہے جب میں بازو پر چھوٹے تولیے اور ہاتھ میں کنگھے پکڑ کر ٹریفک سنگلز پر بیچا کرتا تھا تو میرے ہاتھ خالی جبکہ فقیروں کے کشکول بھر جایا کرتے تھے اگر گاڑیوں کو چمکانے لگتا تو ان کے مالک چند روپے دینے کے بجائے گاڑی گندی کرنے کا الزام لگا کر گالیاں دیتے ہوئے گاڑی بھگا کر لے جاتے اور میں ان گاڑیوں کی تیز رفتاری کے باعث پہیوں سے اڑتی دھول مٹی میں اپنی ذات کو مزید گرد آلود ہوتا دیکھتا رہتا اور آج جب کہ میں ایک نشئی کی حیثیت سے چپ چاپ بس بیٹھا رہتا ہوں تو لوگ دامن بھر جاتے ہیں۔'' دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ان سب باتوں سے جانی کو قطعاً کوئی غرض نہ تھی اس کی دنیا صرف اور صرف کچرے کے ڈھیر سے شروع ہو کر بڑے بڑے پائپوں پر ختم ہوتی تھی۔

اس دن بھی وہ نشہ کرنے کے بعد پائپ کے اندر ہی آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا کہ ایک بڑی سی گاڑی عین اس کے سامنے آ کر رکی' تھوڑی دیر تک اس سے چند باتیں کرنے کے باوجود خاطر خواہ جواب نہ پا کر سفید کوٹ پر کلپ کی مدد سے اپنے نام اور پیشے سے متعلق کارڈ لگائے آدمیوں نے اسے پکڑا اور بغیر کچھ کہے سنے گاڑی میں بٹھا دیا جس میں اس جیسے چند دوسرے لڑکے بھی موجود تھے اس وقت تو ذہن ماؤف تھا سو یوں ہی خوابیدہ کیفیت میں ان کے ساتھ چل دیئے لیکن نشے کا چھایا ہوا خمار ختم ہوا تو اردگرد کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ چند نوجوان ڈاکٹرز نے نشے کے خلاف ایک بڑی مستند اور فعال این جی او بنائی ہے جو نشہ کرنے والے افراد کو اس سے نجات دلا کر زندگی کی راہ پر گامزن کرنے میں ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتی ہے۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس فلاحی تنظیم کو ایک نیک دل اور سینئر ڈاکٹر فروا کی مکمل حمایت اور سرپرستی حاصل ہے اور انہی کے بھرپور تعاون سے یہ نوجوان اپنے ملک کے مستقبل کے معماروں کو درست سمت کی روشنیاں کھوجنے کی تربیت دینا چاہتے تھے۔

کئی اخبار نویسوں نے ان کی تصویریں چھاپیں اور کئی لوگ ان کے پاس وارڈ میں آ کر نشے کے نقصانات بھی گنواتے رہے لیکن جانی کو ان سب سے کوئی غرض نہیں تھی وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ اس نشے

نے ہی اسے بہت سے دکھوں سے بچا رکھا تھا کہ تنہائی ملتے ہی اس کے دل میں گھر والوں کی یاد اور خصوصاً پینو کا ہونق چہرہ جس طرح بے چینی کا باعث بنتا تب اس کے پاس اپنا سر پیٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا البتہ نشہ کس طرح اسے اندرونی طور پر کھوکھلا کر کے ناکارہ بنا رہا تھا اس بات کا تو نہ ہی اس سمیت کسی کو بھی شعور تھا اور نہ ہی سوچنے کی فرصت۔

مطب کے اوقات میں وارڈ میں شور شرابے کا جو ایک عجیب سا ماحول ہوتا اسے تمام ڈاکٹرز بڑے ہی تحمل سے اور بردباری سے سنبھالتے۔ جانی کو چونکہ اس دلدل میں پھنسے ابھی قلیل مدت ہی گزری تھی اس لیے وہ بہت جلد ہی بہتری کی منازل طے کرنے لگا تھا لیکن ابھی ان سب کے علاج کا کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس تنظیم کی روحِ رواں ڈاکٹر فروا کے متعلق یہ سننے میں آیا کہ شوہر سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث انہوں نے جس طرح اپنے پہلے شوہر سے طلاق لینے کے لیے عدالت کا رخ کیا تھا' اسی طرح اب بھی دوسرے شوہر سے طلاق لینے کے باعث انہوں نے کورٹ میں خلع کی درخواست دائر کر رکھی تھی جو کہ منظور ہونے اور خلع حاصل کرنے پر وہ اپنے بیٹے کے ساتھ گھر بار بیچ کر مستقلاً کینیڈا شفٹ ہو رہی ہیں۔

اسپتال میں ان کو دی گئی الوداعی پارٹی کے دن وہ فرطِ جذبات سے بار بار رونے لگتیں' وارڈ میں متعین نرسز کا خیال تھا کہ انہیں ایک بار پھر مجید صاحب سے ہی نکاح کر لینا چاہیے جو پہلے ہی کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔

جانے سے پہلے ڈاکٹر فروا ان کے وارڈ میں آئیں اور بات کرنے کے دوران آبدیدہ ہوتے ہوئے ان کے مشن کو آگے بڑھانے کو کہا لیکن وہ سب نہ ہو سکا جس کا خواب ڈاکٹر فروا نے دیکھا تھا۔ تمام ڈاکٹرز کو سمیٹ کر تسبیح کے دانوں کی طرح اپنے اخلاق کے دھاگے میں پرونے والی ڈاکٹر فروا کے جاتے ہی سب اس طرح انفرادی اختلافات میں الجھے کہ وہ دھاگہ ہی ٹوٹ گیا' تسبیح کے تمام موتی یونہی بس ادھر اُدھر بکھر کر رہ گئے اور یوں ایک دن موقع پا کر ہی جانی اسپتال کی کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا' یہ جانے اور سوچے بغیر کہ اسپتال میں تو اس کو رہنے کی جگہ اور کھانا سب مفت میسر تھا لیکن پھر بھی اسے اپنا آپ وہاں قید معلوم ہوتا' باہر جا کر تو ہر کام کے لیے روپے درکار ہوں گے۔

❀---❀---❀

''اوئے ہیرو! کیا گُل کھلا کے آیا ہے؟'' لمبے چوڑے سپاہی نے جانی کو لات رسید کرتے ہوئے حوالات کے اندر پھینکنے کے انداز میں داخل کیا تو پہلے سے موجود قیدی نے فوراً ہی سوال داغ دیا۔ حواس باختہ جانی محض جاسوسی سے اسے دیکھنے لگا جو شاید اسی کا منتظر بیٹھا تھا۔

''بتا ناں' کہاں سے اور کیا کرتا پکڑا گیا ہے؟'' وہ یقیناً تنہائی سے تنگ آ چکا تھا جبھی اس کے آتے ہی بات چیت کر کے وقت گزارنا چاہتا تھا مگر اس کی خاموشی سے چڑ گیا۔

''ابے بولے گا نہیں تو تیرا دماغ پھٹ جائے گا' اچھا ہے کچھ کہہ سن کر دل ہلکا کر لے۔'' جواب میں جانی نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا' بالکل اسی طرح جیسے وہ دیہاڑی نہ لانے پر روٹی کے وقت کرتا تھا بے بسی کے آنسو تب بھی تھے اور آج بھی۔

''شکل سے اتنا چالو لگتا تو نہیں ہے میرا خیال ہے ابھی اس سمندر میں نیا ہے اور تیرنا بھی ٹھیک سے نہیں آتا' ہے ناں؟'' وہ جو کوئی بھی تھا مگر انتہائی باتونی تھا سو جانی کا کندھا ہلاتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولا تو اس نے ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ جانی کا یہ انداز دیکھ کر دوسرے قیدی نے کندھے اچکائے اور وقت گزارنے کے لیے حوالات کی سیاہ آہنی سلاخوں کے پار زندگی کے آثار دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر چند ہی لمحوں بعد اکتا کر ایک بار پھر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''چل چھوڑ' اپنے اینٹی راز اپنے پاس رکھ اور میری سن' میں آج تیسری مرتبہ جیل آیا ہوں اب تو عملہ بھی واقف ہو گیا ہے سب جانتے ہیں کہ بس چند دنوں کا مہمان ہوں۔'' چونا اکھڑی کوئلے کی تحریروں سے مزین دیوار کے سہارے ٹانگیں پسارتے ہوئے وہ بولا تو جانی نے سابقہ کیفیت میں محض آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''چل اب تو کچھ سنا دے یار! جیل کی رات بڑی لمبی لگتی ہے' گپیں مارتے ہوئے گزار لیں گے۔'' جانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا جھنجوڑتے ہوئے وہ بولا تو جانی جو رائفلیں تانے پولیس والوں کو یہاں سے وہاں جاتا دیکھ کر بے حد خوفزدہ ہو چکا تھا اسے اپنا ہمدرد خیال کرنے لگا۔

''جیل کی ایک رات..... میری تو جانے کتنی ہی راتیں اب جیل میں ہی کٹیں گی' مجھے تو کوئی چھڑانے بھی نہیں آئے گا۔''

''کیوں..... کوئی باپ بھائی کوئی والی وارث نہیں ہے تیرا؟'' گفتگو میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے وہ بولا تو جانی نے بس یوں ہی نفی میں دائیں بائیں گردن ہلا دی یہ جانے بغیر کہ وہ تو حقیقتاً اب ان رشتوں سے محروم ہو چکا ہے۔

''کوئی یار دوست.....؟''

''نہیں..... کوئی نہیں۔''

''تو کیا اب تک یوں ہی اکیلا..... ارے کوئی کچرے پر پھینک گیا تھا تجھے' کیا کرتا رہا ہے اب تک؟'' وہ جانی کی ادھوری باتوں سے الجھنے لگا تھا۔

''میں.....'' جانی نے کچھ سوچ کر اپنی مختصر سی بپتا اسے کہہ سنائی البتہ ماں کے متعلق اپنے جذبات اور پینو سے نسبت رکھنے والی ہر بات وہ مکمل طور پر چھپا گیا تھا۔

''ہوں..... تو یہ بات ہے۔'' اس نے جانی کی کہانی سن کر کسی سوچ میں گم ہوتے ہوئے نظریں جانی

کے چہرے پر جما دیں دل بہت آگے کی حکمت عملی ترتیب دے رہا تھا۔

''پھر تو تیری قسمت واقعی بڑی خراب ہے' تجھ جیسے کتنے جیلوں میں پہلے سے سڑ رہے ہیں' بے گناہ بھی اور معمولی سے جرم کے مرتکب بھی اور پتا ہے جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا ناں وہ اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف پیشی کے انتظار میں ہی ان سیلن زدہ دیواروں کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔'' جانے کیوں اسے جانی سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔

''اچھا سن' میرا نام بوبی ہے اور بس آج سے میں تیرا دوست بھی ہوں اور بھائی بھی' سمجھا؟'' جانی کی شکل میں بوبی کو اپنے اوائل روز نظر آنے لگے تھے جب وہ بھی اس کی طرح حالات سے فرار ہونے کی کوشش میں یوں گھبرایا کہ اب اپنے ضمیر سے بھی فرار پانا ممکن نہ رہا تھا' چند لمحات خاموشی نے نگل لیے۔ جانی کا کندھا تھپتھپانے کے بعد بوبی نے اسے مزید کریدنے کا ارادہ ترک کر کے بازو کا تکیہ بنایا اور لیٹ کر اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔

آئندہ آنے والے دنوں میں پولیس کا خوف جانی کے چہرے کی پیلاہٹ کو مزید گہرا کر رہا تھا' خشک لبوں پر بار بار زبان پھیرنے کے باوجود ان پر پپڑی جم چکی تھی اور پھر اس کی تو کوئی امید یا کوئی ایسا سہارا بھی نہ تھا جو اسے یہاں سے نکال کر لے جاتا۔ یہی سوچ کر اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا جسے اس نے اپنی آستین سے رگڑ کر بہنے سے روک تو دیا مگر پھر بھی یہ نمکین سیال بوبی کو بھی بے چین کر گیا۔ اسی لیے اپنی دانست میں اس کا غم دور کرنے کو وہ جانی کے نزدیک ہی کھسک آیا یوں بھی وہ اسے اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہو رہا تھا۔

''ماں یاد آ رہی ہے؟''

''ہاں بہت.....'' ناجی جیسی بھی تھی آخر کو اس کی اپنی سگی ماں تھی جبھی بوبی کے سوال پر جو دل میں آیا کہہ ڈالا۔ ہزار اختلاف کے باوجود اس کا دل اب بھی ماں کی گود کے لیے تڑپتا تھا لیکن بوبی کے اگلے ہی سوال نے جانی کے ہونٹوں کی جنبش پر بین لگا دیا۔

''ماں بہت پیار کرتی ہے تجھ سے؟'' بوبی کا پوچھا گیا سیدھا سادا سوال جانی کو انی کی طرح محسوس ہوا تھا جو اس کے جسم کو چھیدتا آر پار ہو گیا۔ آنسو تھے کہ گالوں پر لڑھکنے کے بجائے حلق میں جمع ہوتے جا رہے تھے جب ہی بولنا ناممکن ٹھہرا تو محض جبڑے بھینچتے ہوئے گردن اثبات میں ہلا دی۔

''یار ویسے اس معاملے میں تو تُو بڑا خوش قسمت ہے کہ اپنا دکھ کہنے کو تیرے پاس ماں ہے مجھے دیکھ جس کا کوئی نہیں' ایک ماں تھی جو ہمارے پیٹ کا ایندھن بھرتے بھرتے بے چاری خود ہی اس ایندھن کی نذر ہو گئی۔'' آلتی پالتی مار کر بیٹھے بوبی نے انگوٹھے کا ناخن مسلتے ہوئے کہا تو جانی اپنا غم بھول کر تا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

بوبی یادوں کے بے جان گھوڑے پر سوار ماضی کے لق و دق صحرا کی خاک چھاننے نکل کھڑا ہوا تھا' دونوں کی کہانی میں ہزار اختلاف سہی لیکن آج کے آئینے میں دونوں ہی کی ماں کا عکس بڑا واضح نظر آ رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہے تیرے لیے..... کما کر لا اور کھا..... بہانے بناتا ہے ہڈ حرام!'' بوبی کی کہانی سننے کے بعد جانی بے اختیار اپنی اور اس کی ماں کا موازنہ کرنے لگا تو ناجی کی آواز باقی تمام محسوسات پر حاوی ہو کر اس کی سماعتوں پر ضربیں لگانے لگی۔

محبت بھرا کوئی جملہ' دعا یا ممتا سے لبریز کوئی لمس' ایسا کچھ بھی تو جانی کی یادداشت کی کوٹھڑی میں محفوظ نہ تھا' ہاں تھا تو بس اندھیرا اور بس.....

''ہونہہ! میری ماں کے دل میں تو دعائیں بھی محض ان لوگوں کے لیے تھیں جو اس کے کشکول میں جھنکار پیدا کرنے کا باعث بنتے۔ کڑواہٹ بھرے ذہن کے ساتھ جانی نے بددلی سے سوچا۔

لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بوبی سے اپنا حال کہہ سن لینے کے بعد اسے واقعی اپنے اندر تبدیلی محسوس ہو رہی تھی' یوں لگتا جیسے بوبی سے اس کی برسوں پرانی شناسائی ہو۔ نیند تو دونوں ہی کی آنکھوں میں نہیں تھی اس لیے بآواز بلند باتیں کرنے پر سپاہی کی طرف سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑا تو تمام رات سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے کس طرح رات گزر گئی انہیں پتا ہی نہ چلا اور بوبی کے دعویٰ کے عین مطابق صبح نو بجے سپاہی اسے بلانے آن پہنچا۔

''جانی تُو فکر نہ کر میں تجھے ضرور چھڑا لوں گا لیکن شاید ایک دو دن لگ جائیں اور ہاں دیکھ.....'' جاتے ہوئے گلے ملنے کے دوران بوبی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کسی بھی چیز یا جرم کا اعتراف نہ کر لینا' چاہے کچھ بھی ہو جائے ورنہ بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے۔'' اس نے جاتے ہوئے جانی کی بڑی ہمت بندھائی تھی لیکن اول تو اس کا جیل آنے کا پہلا تجربہ تھا سو خوفزدہ ہونا ایک فطری عمل تھا اور دوسری بات یہ کہ اسے معلوم تھا کہ اب اس کا جیل کی اس پیلی کوٹھڑی سے نکلنا شاید ناممکنات سے ہے۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر کے سامنے اس کا بیان لیا گیا اور جانی کی اس وقت حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب سترہ موبائل فونز' ساٹھ ہزار روپے اور طلائی زیورات چوری کرنے جیسے کتنے ہی اسٹریٹ کرائمز اس کے پلّے ڈال کر اعتراف جرم کے لیے اکسایا جانے لگا۔

''صاحب جی! میں نے کچھ نہیں کیا' میں بے گناہ ہوں۔ اللہ اور رسول کا واسطہ ہے مجھے چھوڑ دیں۔''

''بس بس' اب چھوڑ دے یہ رونا دھونا اور سیدھی طرح بتا کس جماعت یا گروپ کے لیے کام کرتے ہو؟'' ایس ایچ نے روزنامچہ کھول کر جرم کی نوعیت کے خانے پر نظر دوڑائی لیکن اسے خالی پا کر جانی کی التجا

نظر انداز کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی اسٹک سے ٹیبل کی شفاف سطح پر آواز پیدا کرتے ہوئے بولا تو پاکستان کی حقیقی پولیس آہستہ آہستہ کر کے اس کے سامنے آنے لگی۔

''میرا کسی جماعت یا گروپ سے کوئی تعلق نہیں ہے صاحب! مجھے چھوڑ دو صاحب' میں ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گا۔''

''آج تک کسی مجرم نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ جرم اس نے کیا ہے۔'' سب انسپکٹر نے یونہی ایس ایچ او کے سامنے کارکردگی بڑھانے کو اسے کان سے پکڑا اور جھنجوڑ ڈالا۔

''یہ ایسے نہیں بولے گا' بند کر دو اسے' ہونہہ آیا بڑا مولوی! حلوے کھا کر دعائیں دینے والا۔'' ایس ایچ او کے کہنے کی دیر تھی کہ کانسٹیبل نے اس کی کلائی بھینچی اور ایک بار پھر بند کر دیا۔

❀---❀---❀

بہار آنے کو تھی ایسا موسم جس میں ٹنڈ منڈ کھڑے درختوں پر بھی شگوفے پھوٹنے لگتے۔

مگر ناجی کے آنگن میں اس دفعہ بہار آتے ہوئے گریزاں اس لیے تھی کہ گھر کے تمام در و دیوار پر تو جیسے خزاں ہی آ کر ٹھہر سی گئی تھی۔ گھر ایک دم ہی مردانہ آوازوں سے خالی ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ شوہر بچا تھا اور نہ ہی بیٹے' حادثے کے کتنے ہی دن بعد تک تو وہ کام پر جانے کے قابل بھی نہیں ہوئی تھی' حفیظ کے دیئے روپوں سے اب تک گھر کا دال دلیا چل رہا تھا۔ عرصے بعد آخر وہ جی کڑا کے نکلی بھی تو ہمت ہار کر وہیں بیٹھ گئی بھلا اسے چلنے کی عادت ہی کہاں تھی' فیکا اسے سارا سارا دن ریڑھی میں بٹھائے رکھتا ہر جگہ اور دی جانے والی صدا میں اسے فیکے کی ہی آواز سنائی دیا کرتی اور وہ یونہی بس خوامخواہ مڑ مڑ کے پیچھے دیکھنے لگتی کہ جیسے لوگوں کے اس ہجوم میں فیکا بھی اسے پکارا چلا آ رہا ہے۔

اکثر تو سڑک پر چلتے چلتے ناجی کو یاد ہی نہ رہتا کہ اس کے اطراف ٹریفک رواں دواں ہے وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ گاڑیاں ہارن پر ہارن دینے لگتیں ورنہ تو اچھا خاصا دیکھ بھال کے چلنے والوں کو بھی ڈرائیور حضرات کسی خاطر میں نہ لایا کرتے۔

آنکھوں میں آنسو لیے بس وہ ہونق سی کبھی ایک جگہ کھڑی ہوتی تو کبھی دوسری جگہ نہ صرف شوہر بلکہ دو بیٹے آن کی آن میں راکھ بن گئے تھے۔ یہ بات اس کے ذہن سے نکالے نہ نکلتی اور پھر وہ تینوں تو چلو دنیا میں نہ رہے مگر جانی..... جو جیتے جی انہیں جدائی کا روگ لگا گیا تھا۔ آتے جاتے لوگوں میں جانی کے چہرے کو کھوجتی ناجی کی سفید بے رونق آنکھیں ہر وقت حرکت میں رہتیں لیکن حقیقتاً اب وہ' وہ ناجی نہیں رہی تھی نہایت کمزور دل اور بڑی کم ہمت ہو گئی تھی اب وہ.....

گڈی تو یوں بھی پیدائشی کمزور تھی لیکن ان دنوں بھوک نے تو اس کی حالت مزید ابتر کر دی تھی۔ پتلی پتلی کمزور ہڈیاں اور اندر کی طرف بتدریج دھنستی آنکھیں' سارا سارا دن بھوک پوری نہ ہونے پر روتی رہتی

نہ تو گود میں اٹھانے پر چپ ہوتی اور نہ ہی بہلانے پر اور بھلا چپ ہوتی بھی تو کیسے؟

اگر دو روٹی کی بھوک پر محض دو لقمے کھانے کے نام پر ملیں تو بڑے تو جیسے تیسے صبر کر لیں مگر بچوں کو کون سمجھائے؟ اس دن بھی ناجی کام پر گئی تو ضرور لیکن گڈی کی چڑچڑاہٹ اور رونے سے تنگ آ کر وقت سے پہلے ہی لوٹ آئی اور آتے ہی اسے گھر کے کچے فرش پر گیند کی طرح پٹخ دیا۔

''چپ کر..... اب آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گی تیرا۔ اری تم دونوں بھی مر جاتیں تو اچھا تھا' جان عذاب میں ڈالی ہوئی ہے میری۔'' ناجی نے جھنجلاہٹ میں گڈی کو اس کے نحیف کندھوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجوڑا تو وہ ڈر کر چپ ہونے کے بجائے بلک بلک کر مزید رونے لگی۔

''اماں..... اماں اس میں گڈی بے چاری کا بھلا کیا قصور ہے؟'' پینو بوکھلا کر باہر نکلی اور گڈی کو اٹھا کر آغوش میں لیتے ہوئے گلے سے لگا لیا جب کہ رانی وہیں کمرے ہی سے جھانکتے ہوئے ماں کو آج پھر غیظ وغضب کے عالم میں دیکھتی رہی۔ ناجی نے گڈی کو پیار کرتی پینو کو گھورتے ہوئے دیکھا۔

جب سے ناجی نے دوبارہ سے دھندے پر جانا شروع کیا تھا جان بوجھ کر پینو کو گھر چھوڑ جایا کرتی' گورنمنٹ کی طرف سے لواحقین کو دی گئی امداد کے روپے کچھ تو دوسری بستی کے استاد کا ادھار لوٹانے اور گھر میں ہی کھڑی ریڑھی کو کرائے سمیت واپس کرنے میں خرچ ہو گئے اور کچھ گھر میں کھانے پینے پر۔ اب اس کا خیال تھا کہ پینو کو خود اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ گھر کو اس کی ضرورت ہے اور اسے اپنی ماں اور چھوٹی بہنوں کے لیے کچھ کما کر لانا چاہیے مگر پینو کو ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر اسے مزید طیش آ جاتا لیکن جس طرح چوٹ تازہ ہو تو اس کے درد اور اس کے نتیجے میں جسم میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا بالکل اسی طرح انسان کو بھی اپنے ساتھ ہونے والی کسی کی بدی' بدنیتی یا اپنے ہی کیے گئے کسی فعل کے مضر اثرات کا اندازہ بھی فوری طور پر نہیں ہوتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیاز کی پرتوں کی طرح جب سارے خسارے ایک ایک کر کے کھلتے ہیں' حقیقت کا ادراک تب ہی ہوتا ہے مگر آئندہ ایسا نہ ہونے کی حکمت عملی تو ترتیب دی جا سکتی ہے لیکن ہاتھ آئے خسارے سے جان چھڑانا بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا اور پینو بھی ضمیر پر خسارے کا منوں بوجھ لیے آئندہ آنے والے وقتوں میں کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے ناجی کی چڑچڑاہٹ' بات بے بات گالی گلوچ اور دھندہ نہ ہونے کے باعث بھوک کا رونا سن کر بھی ان سنی کر دیتی۔ باوجود اس کے کہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب دہائیاں وہ اس کے سامنے دے کر آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔

''چپ کرا اسے ورنہ.....'' ناجی نے ابلتی آنکھوں سے پینو اور پھر گڈی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں! اس سارے معاملے میں گڈی بے چاری کا کیا قصور؟ کیوں اسے ہلکان کر رہی ہو؟''

''ہاں ہاں تم سب تو بے چاریاں ہی ہو ناں' ظالم تو ہوں میں' قصور وار تو میں ہوں کہ کیوں تم تینوں

اناج کی دشمنوں کو پیدا کیا؟ اب بتا کہاں سے کھلاؤں تم سب کو؟ اپنے تن کے ٹکڑے کاٹ کر بیچ آؤں' بول؟'' چلاتے چلاتے ایک دو قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس نے پینو کی کمر پر دھموکا جڑ دیا تھا۔ دبلی پتلی پینو اس اچانک افتاد پر محض ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھی۔

''وہ فیکا.....'' فیکے کا نام آتے ہی لہجہ ذرا دھیما بھی ہوا اور آواز میں بھی ٹھہراؤ اترتا محسوس ہوا۔ ''کبھی اس نے مجھے سارا سارا دن زمین پر پاؤں نہیں رکھنے دیا تھا' ایک ہاتھ سے میری ریڑھی پکڑے سارا دن مجھے بٹھائے رکھتا' کیا کروں اب نہیں رہی مجھے عادت سارا سارا دن چلنے کی اور ایک وہ جانی.....'' جانی کا نام زبان تک آتے ہی آواز میں غرّاہٹ شامل ہوتی محسوس ہوئی۔

''ناس مارا' جانے کیا سبق پڑھا گیا ہے تجھے' اچھے خاصے آتے رزق کو لات مارے بیٹھی ہے۔''

''اماں.....'' پینو نے زخمی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''خود تو جانے کہاں دفع ہو گیا اور ہم سے منہ کی نوالا تک چھین لے گیا۔''

''اس لیے کہ ابھی وہ اتنا بے غیرت اور بے شرم نہیں ہوا تھا کہ اپنی آنکھوں سے بہن کو عزت بیچتا دیکھتا۔'' پینو نے آج پہلی مرتبہ اس موضوع پر یوں دبنگ انداز میں بات کی تھی جس پر ناجی کا حیران ہونا لازمی تھا۔

''اور میں تو خوش ہوں کہ خدا نے ماں نہیں تو بھائی تو اتنا غیرت والا دیا ورنہ..... ورنہ میں تو شاید اب تک مر بھی گئی ہوتی۔''

''اچھا تو..... تُو مجھے بے غیرت کہہ رہی ہے؟'' ناجی کو پینو کے سانولے چہرے پر شدت جذبات سے دوڑتی سرخی ذرا نہ بھائی تھی۔

''ہونہہ..... مائیں تو اپنی بیٹیوں کی عزت بچاتے بچاتے مر جاتی ہیں مگر ان پر ذرا سی بھی آنچ آنے نہیں دیتیں پھر کیسی ماں ہے تُو کہ خود اپنے ہاتھ سے مجھے اس میدان میں اتارنے پر تُلی ہے' جہاں یہ بھوکے کتے چند روپوں کے بدلے تیری پینو کو نوچ ڈالیں گے' بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے یہ وحشی جانور..... مگر تُو.....'' پہلی دفعہ پینو کو یوں ماں کے سامنے بولتا دیکھ کر رانی بھی سہم گئی تھی اس لیے بھاگتے ہوئے آ کر اس کے ساتھ آ چمٹی تھی۔ روتی ہوئی پینو نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر گلے لگا لیا تھا اور پھر ان کے بالوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

پینو کے لہجے میں اس قدر تلخی' آواز کی تیزی اور ماں کے سامنے زبان درازی اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں گئی تھی مگر اس سب کے باوجود ناجی کے ذہن میں آیا فتور تھا کہ کم ہونے کا نام ہی لینے کو تیار نہ تھا بلکہ شرمندہ ہونے کے برعکس اس کا غصہ مزید بھڑک اٹھا تھا۔ دن بھر چلتے رہنے کی وجہ سے ٹانگوں کا درد بھی اب اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا اور گدی کو اٹھائے رکھنے کی وجہ سے دائیں بازو میں پڑی

اٹھن.....

''ارے میں کوئی اکیلی نہیں ہوں اس دنیا میں' بہت سی عورتیں ہیں جو اپنی مرضی سے یہ کام کرتی ہیں اور دوسروں سے بھی کرواتی ہیں' کتنوں کو تو میں خود بھی جانتی ہوں۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے اور ایک تُو نواب زادی ہے کہ ہونہہ.....'' ناجی نے اندر کا غبار نکالنے کے لیے اٹھ کر رانی اور گڈی کو پیٹنا شروع کر دیا۔

''بڑی بہنیں تو ماؤں کی جگہ ہوتی ہیں' اپنی چھوٹی بہنوں کی زندگی سنوارنے کا سوچ پینو! ایک تیری قربانی سے ان دونوں کی زندگی بن جائے گی' انہیں بھی اسکول بھیجا کریں گے' مس جی بنائیں گے انہیں۔ اری میری تو گزر گئی ان دونوں کا سوچ' ورنہ یہ دونوں عزت والی زندگی کیسے جئیں گی؟'' ان دونوں کو مارنا چھوڑ کر وہ پینو کو نرم لہجے میں سمجھا رہی تھی مگر اس کا کوئی بھی ردعمل محسوس نہ ہونے پر ایک بار پھر آواز کی لے بھی بدلی اور لہجے کی تال بھی۔

''مر جاؤ کہیں جا کر' دفع ہو جاؤ اور مجھے سکون سے مر ہی جانے دو۔ کہاں سے بھروں تم سب کے پیٹ کا دوزخ۔'' سر پر ہاتھ رکھے اب وہ بین کیے جا رہی تھی' پھٹی پھٹی آنکھوں اور پپڑی جمے ہونٹوں سے دہشت زدہ ہو کر یہ سب دیکھتی رانی اور گڈی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی پینو کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے تھے' ایک دم جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ ایک نظر اس نے ہذیانی کیفیت میں بین کرتی ماں کو دیکھا اور پھر دونوں چھوٹی بہنوں کو' جو اَب خود رونا چھوڑ کر آنکھیں پھاڑے بڑی ناسمجھی سے ماں کو دیکھے جا رہے تھیں۔

آنسو لمحہ بھر میں خشک ہو کر گرد آلود چہرے پر عجیب ٹیڑھی میڑھی سی سطریں بنا گئے تھے۔ پینو کو اپنی جانب متوجہ پایا تو فوراً دونوں اس کی طرف لپکیں اور اس کی بے جان ٹانگوں سے لپٹ گئیں۔ پینو نے لمحہ بھر کے لیے دونوں کو پیار کیا' ہتھیلی کی پشت چہرے پر رگڑتے ہوئے آنسو صاف کیے' کن اکھیوں سے ہلکان ہو کر بیٹھی ناجی کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ٹین کے صندوقچے میں رکھے خاکی رنگ کے لفافے میں موجود الائچیاں نکالنے چل دی۔ اپنی چھوٹی اور معصوم بہنوں کا مستقبل اور عزت اسے ہر حال میں محفوظ رکھنا تھی اور انہی کی خاطر اس نے ایک بار پھر درخت کی مانند خود کڑی دھوپ کا عذاب جھیلتے ہوئے ان ننھی کلیوں کو چھاؤں دینے کا سوچا تھا۔

❀---❀---❀

جانی کو حوالات میں بند ایک ہفتہ ہو گیا تھا لیکن پولیس والوں کی طرف سے اس کے کیس میں کوئی بھی پیش رفت نہیں کی گئی تھی' دن سے رات کا ہونا ایک مشکل ترین امر لگا کرتا۔

''اوئے.....'' ایک فربہ سے سپاہی نے حوالات کی سلاخوں کے اس پار سے آواز لگائی تو وہ بیٹھا بیٹھا

ہڑبڑا گیا۔

''چل بھئی تیری ضمانت آئی ہے۔'' آزادی کا پروانہ سناتے ہوئے اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور مقفل سلاخوں پر موجود سیاہ تالا کھولنے لگا۔

جانی نے چونک کر بے یقینی کے عالم میں جیل میں موجود دوسرے قیدیوں کو دیکھا کہ شاید وہ سپاہی کسی اور سے مخاطب ہے اور وہ محض خوش گمانی کے زیر اثر اس آواز کو اپنے لیے سمجھ رہا ہے۔

''ابے تُو..... تُو بڑا ماسٹر نکلا' ہمیں جھوٹی کہانیاں سناتا رہا کہ تجھے چھڑانے والا کوئی نہیں ہے پھر یہ ضمانت کس نے بھیجی ہے؟'' ڈکیتی کے الزام میں کل ہی لاک اپ میں قید ہونے والے نئے قیدی نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے استفسار کیا۔

''دیکھ لے..... یہ دو دن کا چھوکرا بھی اب ہمیں الو بنا گیا۔'' ساتھی نے بھی تائید کی تو وہ اس سے پہلے کہ وضاحت دیتا سپاہی نے اکتاہٹ بھرے انداز میں گھورا۔

''اوئے چل جلدی بھی کر' یہ پریس کانفرنس بعد میں کر لینا۔'' سپاہی نے خود اندر آ کر اسے بازو سے پکڑا اور باہر کی طرف دھکیل دیا۔ حیران پریشان جانی ایس ایچ او کے دفتر پہنچا تو ان کے عین کرسی پر موجود شلوار قمیص میں ملبوس ایک انجان شخص کو دیکھ کر مزید الجھ گیا۔

''سلام صاحب۔'' دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اس نے دونوں کو سلام کیا۔

''ہاں ہاں بس ٹھیک ہے لیکن زیدی صاحب کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں اگر آئندہ کوئی ایسی حرکت کی تو امید نہ رکھنا' کڑی سے کڑی سزا دوں گا' سمجھے؟'' ایس ایچ او نے اپنے پیشہ وارانہ انداز میں اسے تنبیہ کرنا لازمی خیال کیا تھا۔

''ویسے آپ صرف فون کر دیتے تب بھی کام ہو جاتا' اتنے چھوٹے سے کام کے لیے آپ کا خود آنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوا۔'' زیدی صاحب نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد کپ ٹرے میں رکھا اور سامنے رکھی بسکٹوں سے بھری پلیٹ کو پرے کھسکاتے ہوئے انسپکٹر کے الوداعی کلمات کو شانِ بے نیازی سے حوالہ سماعت کیا۔

''بس یہاں سے گزر رہا تھا سوچا ملاقات کا بہانہ ہی سہی۔'' کرسی ہٹا کر اٹھتے ہوئے انہوں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور پھر ایک اچٹتی سی نظر جانی پر ڈال کر اسے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔

''سلام صاحب۔'' دونوں کے الوداعی مصافحے کے بعد جاتے جاتے ایک بار پھر مڑ کر جانی نے ایس ایچ او صاحب کو سلام کیا اور زیدی صاحب کی تقلید میں تھانے کی حدود سے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے جہاں سیاہ چمکتی کرولا سے چار گز کے فاصلے پر کھڑی موٹر سائیکل پر بیٹھے بوبی کو دیکھ کر جانی کے جسم و جاں میں خوشی اور اطمینان خون بن کر یوں دوڑنے لگا گویا میلے میں بچھڑ جانے والا بچہ اپنے کسی قریبی عزیز کو

سامنے پا کر خوشی سے نہال اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہو۔
بوبی کو دیکھ کر ذہن میں بننے والا معمہ گویا ایک دم ہی جانی کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ گاڑی کے قریب پہنچنے پر زیدی صاحب نے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا اور خود سیاہ کرولا کا دروازہ کھلنے پر اس میں بیٹھ گئے۔

❀---❀---❀

''یہ حفیظ آخر خود کو سمجھتا کیا ہے تو دیکھنا پینو اب آئندہ اگر اس نے بلایا بھی ناں تو نہیں جانے دوں گی اور لوگ بہت ہیں' ہونہہ.....'' آخر کار آج پینو حفیظ کے پاس گئی تھی مگر اس نے الٹے پاؤں واپس بھیج دیا تھا بغیر کسی کام اور دام کے۔ جس پر ناجی کا چراغ پا ہونا پینو کی امید کے عین مطابق تھا۔
''بیوی جب روٹھ کر میکے گئی ہوئی تھی تب تو بڑی چاپلوسی کرتا تھا اور اب جب ہمیں ضرورت پڑی تو کیسا منہ پھیر لیا۔'' جواب میں پینو خاموشی سے کپڑے بدل کر دیوار کے سہارے ٹھنڈے چولہے کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ چہرے پر عجیب ویرانی اور گرمیوں کی دوپہروں سی سنسانیت کا راج تھا۔ رانی اور گڈی بھی ایک کونے میں بیٹھی خیالی چیزوں کے ساتھ دنیا آباد کیے کھیل میں مصروف تھیں۔
باہر سے دوسرے بچوں کے شور وغل کی آوازیں آتیں تو وہ دونوں بھی لمحہ بھر کے لیے رک کر حسرت سے دیوار کو دیکھا کرتیں جس کے اس پار کھیلتے بچے ان کے لیے بہت بڑی اور واحد کشش تھی مگر ناجی جس طرح پینو کو پہلے باہر نکلنے نہیں دیا کرتی تھی اسی طرح اب ان دونوں پر بھی باہر جانے پر پابندی تھی۔ یوں بھی اب جبکہ ناجی ان دونوں کو مس جی کے روپ میں دیکھنے لگی تھی اب تو وہ کسی بھی قیمت پر دوسرے بچوں کے ساتھ بھیج کر ان کا ذہن خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''ہیں پینو' میں کہتی ہوں کتنا بدمعاش ہے ناں یہ حفیظ! پہلے تو دیکھ بیوی کا جوڑا بھی دے دیا کہ صاف ستھری ہو کر آیا کر اور اب.....'' ناجی چولہے کو گھورتی پینو سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ ہنوز لاتعلق سی بنی بیٹھی رہی۔ ذہن کی پرواز شاید سوچ کے کسی اور ہی آسمان پر تھی۔
''کہیں واپس تو نہیں مانگ لیا ناں اس نے کپڑوں کا جوڑا۔'' ناجی نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے اسے ٹہوکا دیا' جس کے چہرے پر اتری شام میں شہر خموشاں کی ویرانی بڑی اداسی سے رقصاں تھی۔ ناجی کے بار بار مخاطب کرنے پر آخر اسے لب کھولتے ہی بنی۔
''کپڑوں کا جوڑا تو نہیں مانگا' پر کہتا ہے اب کبھی نظر نہ آنا ادھر' بڑی مشکل سے رخسانہ واپس آئی ہے اگر اسے ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو اس کا گھر اجڑ جائے گا۔''
''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر تُو رخسانہ کو بتا دینے کی دھمکی دے کر آخری دفعہ کچھ روپے تو لے آتی ناں کم

عقل! کبھی اپنا دماغ بھی چلا لیا کر' جتنا سکھاؤں بس اتنا ہی کرتی ہے۔'' پینو نے تڑپ کر ناجی کو دیکھا' جس کے ماں ہونے پر اب اسے قطعاً یقین نہ رہا تھا۔ ''گھر میں کچھ بھی نہیں ہے کھانے کو' یہ دونوں بھی تیری آس میں بھوکی کھیل رہی ہیں اس وقت سے' اب کیا کروں' کہاں سے لاؤں ان کے کھانے کو؟'' ناجی نے سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی پینو کو بے زاریت سے دیکھا۔

''فیکا بھی کمانے والے پُرزوں کو تو ساتھ لے کر مرگیا اور ان سوغاتوں کو میری جان کا عذاب بنا کر چھوڑ گیا۔'' منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے ناجی نے آخری جملہ ادا کیا۔

''ویسے اماں تُو نے کبھی سوچا نہیں کہ کیسی ماں ہے تُو جو اپنے ہاتھوں سے بیٹی کی چادر اتار کر اسے بھرے بازار میں کھڑا کر رہی ہے اور اپنے منہ سے لوگوں کو متوجہ کر رہی ہے کہ ہے کوئی جو میری بیٹی کے ساتھ چند گھنٹے گزار کر ہمیں کچھ روپے دے۔'' وہ باتیں جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھے اس کے ذہن میں لاوے کی مانند پک رہی تھیں بالآخر زبان پر آ ہی گئیں۔

''تُو جانتی ہے ناں کہ پیغمبروں کے بعد سب سے بڑا رتبہ ماں باپ کا ہے' پر تجھے کیا پروا تیرے لیے تو پیسہ ہی سب سے بڑا پیر ہے۔ اسی کی خاطر تُو نے ہماری عزت کے رکھوالے کو گھر سے باہر نکال دیا' صرف اس لیے کہ تیرے رستے میں کوئی کنکر پتھر باقی نہ رہے۔'' لہجے کا ارتعاش اپنی جگہ لیکن جب ضبط کا پارہ نہ رہا تو پینو نے گھٹنوں میں منہ چھپا لیا۔ پینو کی باتوں نے چند لمحوں پہلے گرجتی برستی ناجی کو چونکا دیا تھا۔

''پینو.....'' گھٹنوں پر جھکے سر کو ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے پکارا مگر پینو نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا۔

''اماں' جس طرح چکنے گھڑے پر پانی کی بوند نہیں ٹھہرتی یا بھربھری دیوار میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ کیل کو مضبوطی سے جکڑے اسی طرح فطرتاً بدنیت اور لالچی لوگوں پر بھی نہ تو کوئی بات اثر کرتی ہے اور نہ ہی انہیں وقت اپنی پکڑ میں لیتا ہے اور تُو انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔'' بات ختم کر کے وہیں رکے رہنے کے بجائے وہ اندر جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر جا بیٹھی تھی۔ رانی اور پینو بھی ناجی کے سامنے رکنے کے بجائے دوڑتے ہوئے پینو کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ ناجی کو لگا تھا جسے وہ دہری شخصیت کے ساتھ جیتی جا رہی ہے اور شاید اس کے اندر ایک اور انسان بھی موجود ہے جو بڑی زور زور سے اس کے دل کا دروازہ دھڑ دھڑ بجائے ہی چلا جا رہا تھا لیکن پاپی پیٹ کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں ایک بار پھر پینو کے لیے غصہ ابھرنے لگا تھا۔

اُدھر اپنی قسمت اور پھر مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے پینو کی آنکھوں سے جاری آنسوؤں کی لڑیاں اس کی قمیص کا دامن بھگونے لگی تھیں' وہ دامن جو کبھی میلا ہونے کے باوجود بھی بے حد اجلا اور بے داغ تھا لیکن اب معاملہ قدرے مختلف تھا۔

فلیٹ کیا تھا جانی کے لیے تو وہ محل سے کم ہرگز نہ تھا کچی زمین کے فرش پر جابجا تاریں نکلی چٹائی اور پائپوں اور فٹ پاتھ پر سونے والا جانی تو اس طرح کی زندگی کی خواہش تو دور تک تصور نہ کرسکتا تھا۔ صاف ستھرا کچن' خوب صورت کمرے' چمکتے باتھ رومز سبھی اس کی دسترس میں تھے۔ لمبی نیند سے جاگا تو نرم میٹرس پر بیٹھے بیٹھے کمرے کا جائزہ لینے لگا تھا۔

''ارے تُو کب سے جاگا ہوا ہے؟'' بوبی کسی کام سے کمرے میں آیا تو اسے یوں اِدھر اُدھر دیکھتے چونک گیا۔

''بس ابھی ابھی جاگا ہوں' کوئی پانچ سات منٹ پہلے۔'' بائیس انچ کے رنگین ٹی وی کی فلیٹ اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے وہ بولا۔

''اچھا چل ٹھیک ہے' یہ کپڑے اِدھر تیرے لیے رکھے ہوئے ہیں' میں بھی ادھر ہی ہوں تُو اچھی طرح ہاتھ منہ دھوکر آ جا۔'' بوبی نے کمرے میں موجود الماری سے ہینگر میں لٹکے استری شدہ کپڑے نکال کر کرسی کی پشت گاہ پر رکھے اور جاتے جاتے مڑا۔

''جلدی آ جانا' میں چائے بنانے لگا ہوں' مل کر پیتے ہیں۔'' جانی نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے جاتے ہی اٹھ بیٹھا' سامنے لگے وال کلاک پر نظر پڑی تو اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ پتا چلا کہ جیل سے آنے کے بعد جو وہ سویا ہے تو اب رات کے آٹھ بجے اس کی آنکھ کھلی ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد نہا دھوکر صاف ستھرے استری شدہ کپڑوں میں خود اپنے آپ کو وہ اجنبی لگنے لگا تھا۔ شیو کیا ہوا چہرہ' آئینے کے سامنے دھیان سے بنائے گئے بال سبھی کچھ تو اس کے سابقہ حلیے کے برعکس تھا اور اب وہ کہیں سے بھی اٹھائی گیرا اور چور معلوم نہیں ہو رہا تھا اب تو وہ بالکل اسی فلیٹ کا رہائشی معلوم ہو رہا تھا۔

''کیوں بھئی' کیسی لگی یہ تبدیلی؟'' بوبی نے سامنے صوفے پر بیٹھتے جانی سے دریافت کیا۔

''بہت اچھی لیکن میری اصل اوقات تو تم جانتے ہی ہو ناں۔'' ایک جھجک بہرحال جانی کے رویے میں ضرور موجود تھی مگر بوبی نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے جیب سے لائٹر نکالتے ہوئے بولا۔

''میں تجھے اپنی رہائی کے دوسرے ہی روز چھڑوا لیتا لیکن.....'' سگریٹ کو ہونٹوں میں دبانے کے بعد لائٹر سے سلگا کر ایک لمبا کش لیتے ہوئے بوبی نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا جہاں صرف اور صرف سچائی رقم تھی۔

''چل چھوڑ جانے دے۔'' دھوئیں کا مرغولہ ہوا میں چھوڑتے ہوئے بوبی نے کہا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ جانی کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کر پایا تھا۔

''کیا مجھ سے بھی چھپائے گا دوست' اپنے بھائی جانی سے بھی؟'' جانی کے لہجے میں بے پناہ مان اور آنکھوں میں ڈھیر سارا خلوص تھا۔

''جس طرح میرا دکھ کسی اپنے کی طرح سن کر تُو نے میرے دل کو ہلکا کر دیا تھا کیا میں تجھے اس قابل بھی نہیں لگتا کہ تُو اپنے دل کی بات کہنے کے لیے مجھ پر اعتبار کر سکے۔'' جانی کی بات پر بوبی نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

یوں بھی اس وقت وہ کسی ہمدرد' غمگسار اور کسی بے حد اپنے کی کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا' جس کے سامنے وہ اپنے تمام دکھوں کے ساتھ آئینے کی طرح عیاں ہو جائے۔

''اچھا رُک' میں پہلے چائے بنا لاؤں۔'' بوبی نے سوچا شاید چائے بنانے کے دوران وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکل پائے جبھی اٹھنے کی کوشش کی مگر جانی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''نہیں چاہیئے کچھ بھی' تُو بول' کیا کہہ رہا تھا۔'' بوبی نے گہری سانس لے کر دوبارہ ڈھے جانے کے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے جانی کو دیکھا۔

''اعتبار کر مجھ پر' میں اتنا بُرا نہیں ہوں۔'' اور پھر جانی کے بے حد اصرار پر اسے باپ کی وفات' بھٹے پر ہونے والی اپنی لڑائی اور پھر زینب کی عزت بچاتے ماں کا قتل ہونا' سب ہی کچھ بتاتا چلا گیا۔

اس کی تمام کہانی سننے کے دوران جانی اپنی اور اس کی ماں کا موازنہ کرتا رہا تھا اس کی ماں اپنی بیٹی کی عزت بچاتے بچاتے قربان ہو گئی جبکہ خود جانی کی ماں خوشی خوشی اپنی بیٹی کو دام بڑھوانے کے گُر سکھا رہی تھی۔ اس کے اپنے دل پر رفتہ رفتہ بوجھ بڑھ رہا تھا۔

''اچھا پھر کیا ہوا؟'' اپنی اندرونی کیفیات کو چھپائے وہ بڑے سکون سے بوبی کی تمام بات چیت سن رہا تھا۔

''ہونا کیا تھا' ڈاکٹر فروا خدا ترس خاتون تھیں اور انہیں بوا پر اعتماد بھی بہت تھا کہ وہ ایک عرصے سے ان کے ساتھ تھیں اور جس وقت اماں فراز کے سامنے گڑگڑا رہی تھیں وہ سب باتیں بوا نے سن لی تھیں اور ساری بات من وعن ڈاکٹر صاحبہ کو بتا دی تو انہوں نے ہی میری اور زینب کی ضمانت کروائی۔ ہوا میں جاتے سگریٹ کے دھوئیں کو بغور دیکھتا بوبی شاید اس وقت کسی اور ہی دنیا میں تھا سو جانی نے بھی مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا' کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولا۔

''تب سے اب تک زینب بوا کے ہی پاس ہے۔''

''اور فراز.....؟'' اپنے تئیں بات ختم کر کے جانی کی طرف دیکھنے پر اس کی طرف سے ایک اور سوال سامنے آیا تھا۔

''میں انتقام کی آگ میں جلتا فراز کو ختم کرنے کے لیے اس کے گھر تک پہنچا تو ضرور لیکن یار اس کی

ماں کے جوڑے گئے بوڑھے ہاتھوں نے میرے ہاتھ باندھ دیئے۔ تب سے لے کر اب تک مختلف قسم کی ذکیتیاں کرتا اور زندگی چلاتا آ رہا ہوں۔ ماں کے بغیر چین ہی نہیں آتا' بس ایسا ہی سمجھ لے کہ ایک پیاس ہے جو کسی بھی طرح بجھتی ہی نہیں۔'' سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اس نے انگلیاں بالوں میں پھنسالی تھیں۔ اضطراب اس کی ایک ایک حرکت سے جھلک رہا تھا۔

''اگر فراز کو مار ڈالتا تو شاید آج دل کی بے چینی اس قدر نہ ہوتی لیکن یہ خیال کہ میری بہن پر بُری نظر ڈالنے والا اور میری ماں کے خون سے رنگے ہاتھوں والا فراز اسی شہر میں زندہ گھوم پھر رہا ہے' مجھے جینے نہیں دیتا۔'' بے بسی سے اس نے ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کا مکا بنا کر مارا۔

''کاش کہ اس دن فراز کی ماں میرے سامنے نہ آئی ہوتی' اس کی گڑگڑاہٹ اور آنسوؤں میں مجھے اپنی ماں نظر نہ آئی ہوتی تو آج صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔'' جانی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیتے ہوئے تنہا نہ ہونے کا احساس دلایا تھا۔

''آج کل کے دور میں فراز جیسے انسانوں کی وحشت' ظالم اور کمینگی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذہن سے موت کا تصور نکل گیا ہے میرے دوست! بدکردار اور بدنیت لوگوں کے ہاتھوں شریف اور باکردار لوگوں کا وجود ایسا ہی ہے جیسے درختوں کی چوٹی سے پھل گرانے کے لیے بچے ان پر لمبی لمبی بانس نما لکڑیوں سے ضربیں لگاتے ہیں' انہیں جھاڑتے اور ہلاتے ہیں مگر بعض اوقات اس ساری تگ و دو کے بعد بھی پھل ہاتھ نہ آنے پر غصے سے جھنجلا کر ان کی ٹہنیاں تک توڑ دیتے ہیں اور پتوں تک کو نوچنا نہیں چھوڑتے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ماں..... کیا دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جس پر ماں کے رونے بلکنے کا اثر نہ ہو۔'' بات کرتے کرتے بوبی کا اپنا گلا رندھ گیا تھا۔

''ویسے ایک بات بتا یار! یہ ساری مائیں اتنی عظیم کیوں ہوتی ہیں؟ کیوں اولاد کی خوشی پر اپنی ہر حسرت قربان کر دیتی ہیں؟ خود بھوکا رہ کر اولاد کے منہ میں نوالہ ڈالنا یہ بھلا ماں کے علاوہ کوئی کر سکتا ہے کیا؟'' بوبی کی بات پر جانی ایک دم یوں چونکا جیسے بہت گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔

لفظ ماں گویا اس ایک لمحے میں کرنٹ بن کر اس کے جسم میں دوڑا تھا جبھی چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور ہاتھ پاؤں ساکت ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

❀---❀---❀

''ماں'' یہ کیسا سہ حرفی مختصر سا لفظ تھا جو اپنے اندر پوری دنیا سموئے ہوئے تھا جس کے بغیر گھر گھر نہیں لگتا اور جس کے نہ ہونے سے دنیا میں جی نہیں لگتا اور بوبی کو کس قدر عقیدت تھی اس سہ حرفی لفظ سے جڑے رشتے سے' جانی اس کے انداز سے سوچ میں پڑ گیا تھا۔

یہ سچ تھا کہ دونوں کا دکھ سانجھا تھا لیکن انداز بہر حال راوی کے دو کناروں کی طرح بالکل ہی جدا تھا اور شاید یہ دکھوں کی مماثلت جتنی جلدی دو انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتی ہے اتنی جلدی خوشی کے لمحات میں کھلنے والی پھلجڑیاں بھی نہیں کرتیں اور یہی وجہ تھی کہ اپنائیت کا ایک احساس دونوں کے گرد محبت کے مقناطیس کا ایک ہالہ سا بناتا جا رہا تھا اور جانی دل ہی دل میں اس کی ماں کی عظمت کو ہاتھ باندھے سلام کر رہا تھا۔

''یار میری ماں نے شروع سے ہی ہمارے لیے بہت قربانیاں دیں خود بھوکا رہ کر ہمیں کھلایا اور وہ بھی یوں کہ اپنی بھوک ہم پر ظاہر تک نہ ہونے دی مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا' کچھ بھی نہیں۔'' ہتھیلی سے آنکھیں مسلتے ہوئے وہ بچوں کی طرح رو دیا تھا پھر سامنے جانی جیسا ہمدرد اور مخلص دوست تھا' الفاظ ندی کے بہتے پانی کی طرح بغیر رکے بڑی روانی سے اس کے منہ سے نکلتے ہی جا رہے تھے بوبی اس وقت اپنے فرسٹریشن کی وجہ جانی کی سماعتوں کے حوالے کر رہا تھا۔

''اور ان دنوں جب تُو جیل میں تھا ناں' بہن کی شادی بھی بوا نے اپنے بیٹے سے کر دی۔ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے ملنے پہنچا تو اس نے مجھے الگ لے جا کر آئندہ وہاں آنے سے بھی منع کر دیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سسرال میں کسی کو بھی پتا چلے کہ وہ ایک چور اُچکے کی بہن ہے بلکہ میرے بجائے وہ صرف اور صرف ماں کے تعارف کا عظیم تمغہ ہی سجا کر جینے میں فخر محسوس کرتی ہے۔'' بوبی سے مزید بولنا ممکن نہ رہا' آنسو گولہ بن کر اس کے حلق میں آ پھنسے' باوجود اس کے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو متواتر بہہ رہے تھے مگر دکھ تو شاید اس سے بھی سوا تھا۔

''تو یار پھر تُو چھوڑ دے ناں یہ کام لعنت بھیج اس پر اور اپنی بہن کے ساتھ عزت کی زندگی گزار۔'' جانی نے تجویز دی تو وہ روتی آنکھوں سے ایک تلخ ہنسی ہنس دیا۔

''یار یہ حوالہ اب میری جان نہیں چھوڑے گا' پولیس والے بھی یار دوستوں کی طرح جب چاہے اپنا مہمان بنا لیتے ہیں اور ویسے بھی رہوں کہاں؟ اب میں بہن کے گھر جا کر تو رہنے سے رہا۔''

''ہوں.....'' جانی لاجواب ہو گیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا کہ تُو مجھے خود سے اتنا قریب کیوں لگا شاید اس لیے کہ تُو بھی اپنی ماں سے میری طرح بہت محبت کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دونوں کی مائیں واقعی عظیم ہیں۔'' آنسو بہنے سے دل کا غبار کسی حد تک وقتی طور پر ڈھل گیا تھا سو ایک بار پھر سگریٹ سلگا لی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے پاؤں پھیلا لیے لیکن جانی کا دل ایک دم چیخ اٹھا تھا۔

اس کی ماں اور بوبی کی ماں بھلا ایک جیسی کہاں تھیں اور ان دونوں کو ایک سا عظیم قرار دینے پر جانی کا دل احتجاجاً بلک ہی اٹھا تھا۔

کیا صرف ایک بچے کو جنم دینے سے ہی عورت ماں کی عظمت کو چھو جاتی ہے؟ کیا سات پردوں میں اپنا وجود ڈھانپنے والی اور گھنگھرو باندھ کر تماش بینوں کے سامنے رقص کرنے والی دونوں عورتیں ماں بنیں تو ان کے قدموں تلے جنت کا ہونا یقینی ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پیدا کرنے کے فوراً بعد بچے کو کچرے کے ڈھیر پر پھینک دینے والی ماں جن قدموں سے اس ننھے فرشتے کو روتا بلکتا چھوڑ جائے کیا ان قدموں تلے بھی جنت ہوتی ہے اور پھر کہاں اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کا پیٹ بھرنے والی کردار کی بلندیوں کو چھوتی عظیم ماں اور کہاں پیٹ بھرنے کی خاطر روح گروی رکھ کر خود اپنی اولاد کا جسم بیچنے والی عورت.....

یہ کیسا تضاد تھا اور کیا ایسی عورت کو ماں جیسے خوب صورت اور پاکیزہ لفظ سے پکارنا ٹھیک تھا؟ کیا وہ ماں کہلانے کے لائق تھی؟ دل تھا کہ اس نا انصافی پر بھڑک اٹھا تھا اور مجسم سوال بنا ہوا تھا کہ دو مختلف رویوں اور کردار کی مالک عورتوں کو ایک ہی منصب پر فائز کر دینا کہاں کا انصاف تھا؟

بوبی نے اسے کچھ دیر تک خاموش دیکھا تو گہرا کش لے کر سگریٹ کی راکھ ٹیبل پر رکھے ایش ٹرے میں منتقل کرتے ہوئے بولا۔

''جانی یار میں نے ایک بات سوچی ہے۔'' اس کا خیال تھا کہ جانی اس کی طرف دیکھے گا اور پوچھے گا کہ اس کے ذہن میں ایسی کیا بات آئی ہے مگر پوچھنا تو درکنار جانی نے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے بھی نہیں دیکھا۔ سو لمحہ بھر انتظار کے بعد بوبی نے خود ہی اپنا جملہ مکمل کرنا شروع کیا۔

''میں نے سوچا ہے کہ منزل تو میری اور تیری ایک ہی ہے ناں' تو کیوں ناں رستہ بھی ایک ہی ہو جائے اور اسی لیے آج سے ہم دونوں اکٹھے ہی کام کیا کریں گے۔'' بوبی اب یقیناً اس کی رائے جاننا چاہتا تھا مگر وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھا ماں کی کسک اس کا سینہ یوں جکڑنے لگی تھی گویا دمے کا کوئی پرانا مریض سانس لینے کی کوشش میں ہانپ چکا ہو اور کشادہ کمرے میں ایک دم قبر سی گھٹن کا احساس ہوا تو وہ خوامخواہ گلاس میں پانی ڈال کر غٹا غٹ پی گیا۔

''یار میری ماں تو اس دنیا میں رہی نہیں' پر تیری تو ابھی زندہ ہے ناں' اس کی قدر کر لے ورنہ بڑا پچھتائے گا۔'' اپنے سوال کے جواب میں خاموشی اور اس کا اضطراب بوبی کو یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ اس وقت اپنی ماں کی یاد سے نبرد آزما تھا سو اپنے تئیں سمجھانے لگا یہ جانے بغیر کہ ماں کا ذکر اس کے لیے کتنا تکلیف دہ ہے۔

❀---❀---❀

آگہی کا ایک لمحہ ہی تمام عمر پر بھاری ہوتا ہے اور خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو آگہی کے لمحے کے وقت نزول کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ پینو کے ساتھ بھی ہوا تھا اور ادراک رکھنے کے ہی باعث اس نے آگہی کو اس کی بلندی اور اپنی پستی سمیت کھلی آنکھوں سے قبول کیا تھا۔

حفیظ کے پاس چند مرتبہ جانے کا معاملہ تا حال بستی والوں سے پوشیدہ تھا اور اس کے مخفی رہنے میں ہی

حفیظ اوران کی بھلائی تھی یوں بھی ناجی کی عزت رکھنے کے لیے پینو نے حفیظ کے سامنے اسے لاعلم ہی ظاہر کیا تھا اور اس سب عمل کو اپنا انفرادی فعل قرار دیتے ہوئے اس کے سامنے اپنی ماں کو اعلیٰ رتبہ ہی دیا تھا۔ جانی کے گھر سے جانے کے بعد دو تین مرتبہ وہ ناجی کے زبردستی بھیجنے پر اور چھوٹی بہنوں کو اس کی بہیمانہ مار سے بچانے کی خاطر حفیظ کے پاس گئی تھی اور ہر مرتبہ ملامت کا بوجھ اپنے سینے پر لے کر واپس آئی اور پھر یہ سوچ کر کہ جانی صرف اس کی حمایت کرنے کے الزام میں ماں سے گالیاں کھاتا ہوا یہ گھر چھوڑ گیا تھا سو اب اسے بھی اپنی حفاظت خود ہی کرنا ہوگی اس نے ایک مضبوط اسٹیپ لیتے ہوئے ناجی کی گالیاں' جھڑکیاں اور یہاں تک کہ مار بھی کھائی لیکن وہ اب فیصلہ کر چکی تھی۔ یہ ذمہ داری خود رازق کی تھی جس نے اسے اور اس کی دونوں معصوم بہنوں کو دنیا میں بھیجا تھا اس لیے پیٹ کا خالی برتن جو ہر دو گھنٹے بعد پھر خالی ہو جاتا ہوا سے بھرنے کے لیے وہ خود کو نیلامی کا مال نہیں بنائے گی۔

لیکن ان تمام حالات اور واقعات کے باوجود اس کے ضمیر نے گوارہ نہیں کیا کہ وہ کسی کے بھی سامنے اپنی ماں کا بھرم توڑے۔ اس دن بھی جب سارا دن تھک ہار کر سورج اب آسمان کی سرمئی اور مٹیالی چادر میں منہ چھپانے کو بے تاب تھا اور بستی کے لوگ عین بستی کے درمیان موجود ایک کشادہ میدان نما جگہ پر اکٹھے بیٹھے اپنے دن بھر کی روداد سناتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے میں مصروف تھے جب ناجی کے کانوں میں کہیں سے یہ بھنک پڑی کہ حفیظ کی بیوی ایک بار پھر روٹھ کر میکے چلی گئی ہے اور نوبت اب طلاق تک جا پہنچی ہے خبر تھی یا کہ تقرری کا پروانہ۔

سب لوگوں کو محو گفتگو چھوڑ کر وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی اور کشاں کشاں گھر کے اندر قدم رکھتے ہی نہایت جوش و خروش سے پینو کو خبر سنائی اور کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن اپنے چہرے پر موجود خوشی کی چمک کے سامنے وہ پینو کی آنکھوں میں اترتے اس دریا کو بالکل دیکھ نہیں پائی تھی جو شاید طغیانی بپا کرنے کے بعد اب ٹھہر سا گیا تھا۔

''اب تُو دیکھنا پینو اب جب تو جائے گی تو وہ ہرگز واپس نہیں بھیجے گا بلکہ اس دفعہ پیسے بھی زیادہ مانگنا اور ہاں.....'' پینو کے مزید نزدیک ہو کر اس نے سرگوشیانہ انداز میں منہ پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

''ان لمحوں میں مرد سے جو چاہو منوالو' اپنے مطلب کے لیے مرد ذات بڑے دیالو بن جاتے ہیں بلکہ تُو اس دفعہ فرمائش بھی کر دینا۔''

اس نے اپنی چندھی چندھی آنکھیں پھیلاتے ہوئے پینو کو دام بڑھانے اور مراعات حاصل کرنے کے گُر بتائے تھے لیکن پینو خاموش رہی۔ جانتی تھی کہ اس پر کوئی بات اثر کرنے والی نہیں ہاں البتہ اس کے بات کرنے کے نتیجے میں رانی اور گڈی کو پچھلی دفعہ بھی اتنی مار پڑی تھی کہ دونوں رات کو سونے کے دوران بھی کراہتی رہیں جبکہ ناجی کا خیال تھا کہ وہ یہ سب انہی کے بھلے کے لیے کر رہی ہے اور اگر پینو چھوٹی

بہنوں کے بہتر مستقبل کے لیے ذرا سی قربانی دے دیتی ہے تو اس میں بھلا حرج ہی کیا ہے۔

''جا' ناں کس سوچ میں پڑ گئی؟ اٹھ تیار ہو جا' گلی کی نکڑ تک تجھے میں خود چھوڑ آتی ہوں۔'' ناجی نے سوچوں میں بھٹکتی پینو کا کندھا ہلایا تو جیسے وہ کسی خواب سے جاگ گئی اور اس لیے کہ وہ ایک بار پھر مزاحمتی رویہ اپناتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کرتی' رانی خالی ماچس کی ڈبیوں سے کرسی میز اور چارپائی بناتے بناتے اٹھ کر ناجی کے پاس آ کھڑی ہوئی اور سر کھجاتی ناجی کا ہاتھ پکڑ کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔

''اماں.....''

''بول' کیا ہے؟'' چند لمحوں پہلے پینو کے ساتھ لفظوں کی ریشمی ڈور میں یکدم بان کی رسّی کا کھردرا لہجہ پینو کو بُری طرح محسوس ہوا تھا مگر رانی ابھی شاید لہجوں کا فرق سمجھنے کے نہ تو موڈ میں تھی اور نہ ہی ابھی اس کی اتنی عمر تھی کہ ان باتوں کو محسوس کرتی۔

''اماں مجھے بھی پینو کی طرح حفیظ کے پاس بھیج ناں.....'' ناجی کے چپٹے اور میل سے بھرے ناخنوں والی پانچوں انگلیاں رانی کے ہاتھ میں تھیں اور وہ اس کا ہاتھ جھلاتے ہوئے اسی طرح ضد کر رہی تھی جیسے عمومی طور پر بچے ٹافی سکٹ لینے کے لیے کیا کرتے ہیں۔

''قسم سے' پینو سے بھی زیادہ پیسے لاؤں گی اور وہ مفت مجھے ٹافی بھی دے دے گا۔ رانی اپنے جانے کے فوائد گنواتے ہوئے پینو کی حیرت سے پھیلتی آنکھوں میں اترتی موت سی وحشت بھلا کہاں دیکھ رہی تھی۔

''اور اماں تجھے پتا ہے وہ حفیظ جو ہے ناں' وہ زیادہ پیسے کب دیتا ہے؟'' رانی نے ساکت بیٹھی ناجی سے پوچھا اور جواب نہ ملنے پر خود ہی بولی۔

''جب میں سرخی پاؤڈر لگا کر' منہ میں الائچی ڈال کر اس کی بیوی کا جوڑا پہن کر اس کے پاس جاؤں گی ناں' تو پہلے وہ اپنی دکان کا دروازہ بند کرے گا پھر میرے پیچھے کھڑا ہو کر میرے بال کھولے گا اور پھر۔''

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پینو سے کروائی گئی پونی کھولتے ہوئے وہ اپنی ہی روانی میں ہر ایک بات جوں کی توں عملی طور پر دہرا رہی تھی۔ وہی سب کچھ جو وہ دکان میں دیکھا کرتی تھی اور یہی نہیں بلکہ ناجی کو اپنی بہترین کارکردگی کا یقین دلانے کے لیے اس نے گڈی کو بطور خود استعمال کرتے ہوئے خود حفیظ کا کردار نبھایا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ حد سے بڑھتی ناجی کو جیسے ہوش آ گیا۔

''رانی..... بے غیرت..... بکواس بند کر اپنی۔'' اس نے حلق سے آواز لگا کر چلاتے ہوئے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے معصوم چہرے پر جڑ دیا تھا اس اچانک افتاد پر حواس باختہ رانی یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ غلطی کہاں پر ہوئی ہے اور اسی حیرت میں وہ نہ تو رو سکی اور نہ چیخی۔ بس گال پر دونوں ہاتھ رکھے اس کی

انگلیوں کے نشانات کو ڈھانپے سہم کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی جو اس کی سو فیصد کارکردگی پر خوش ہو کر اسے سراہنے کے بجائے مار رہی تھی۔

''اچھا اماں' میں اسے کچھ بھی کرنے نہیں دوں گی' میں اسے کہوں گی کہ میری اماں بڑی ہیں ناں تم پہلے انہیں بلالو اور تب تک مجھے تھوڑی سی افیم چٹادو' اماں قسم سے میں چپ چاپ سو جاؤں گی اور تم جب تک تمہاری مرضی ہو تم.....'' رانی بڑی ہی معصومیت سے انگلیاں مسلتے ہوئی اسے اپنے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلا رہی تھی۔ الفاظ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہچکیوں کی صورت منہ سے نکل رہے تھے مگر ناجی کا ردعمل اب کچھ عجیب سا تھا۔

''چپ ہوتی ہے کہ زہر دے دوں تجھے؟'' ناجی بولی ضرور مگر نہ تو آواز میں غراہٹ تھی نہ لہجے میں کوئی گھن گرج بلکہ محسوس ہوتا تھا یہ بات اس نے خود اپنے آپ سے کی ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ یوں چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے بینائی چھن گئی ہو اور وہ کوئی بھی منظر ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی حسرت میں گم ہو۔

رانی کی باتوں نے پینو کی آنکھوں میں ٹھہرے دریا کو بھی ٹھاٹھیں مار کر کنارے پار کرنے پر مجبور کر ڈالا اور آج تو دل کو ایسی گہری چوٹ لگی تھی کہ اس نے خود بھی لہروں کے اس منہ زور ریلے پر بند باندھنے کے بجائے کھل کر بہہ جانے کا موقعہ دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

چاندنی راتوں اور تپتی دوپہروں میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ بچپن سے گڈی کی طرح دانہ برابر افیم کھا کر سونے والی رانی کا معدہ اب اس خوراک کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ زیادہ مقدار کو بھی قبول کر لیتا تھا جبھی تو حفیظ کی دی گئی افیم سود مند ثابت نہیں ہو پائی تھی اور تجسس کے مارے اس نے بھی اسی طرح پلکوں کی جھریوں کی مدد لی جس طرح چاندنی راتوں میں پینو بازو کی اوٹ کا استعمال کرتی تھی اور چونکہ ناجی اور فیکا والدین تھے سو پینو کو لگتا کہ کچھ بھی قابل اعتراض نہیں اور والدین کبھی کچھ غلط نہیں کرتے۔ بالکل اسی طرح اور وہی کام رانی کے نزدیک پینو کا تھا اور اس کے کسی بھی عمل کو قابل گرفت نہ سمجھتے ہوئے ہی رانی نے بڑی دیدہ دلیری اور جوش و خروش کے ساتھ اپنا ٹرائل پیش کیا تھا۔

جائز اور ناجائز کے درمیان موجود ایک باریک سی لائن معدوم ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی لمحے وقت کا ناقوس اس شدت سے بجا کہ ناجی نے دھواں ہوتی آنکھوں کو زور سے بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے اپنے سائیں سائیں کرتے کانوں پر رکھ دیے۔ سرد ہوتا دماغ اب ایک دم بڑی شدت سے سن ہو رہا تھا اور پھر بیٹھے بٹھائے اس کے دماغ میں جانے کیا آئی کہ ایک دم بڑی شدت سے سینہ کوبی کرنے لگی۔ رانی اور گڈی یوں ناجی کے اس اچانک اور وحشت ناک عمل سے خوفزدہ ہو کر پینو کے پاس آ بیٹھی تھیں اور بڑی حیرت سے ماں کو سینہ پیٹتے دیکھنے لگیں مگر ناجی شاید اس بات سے بے خبر تھی کہ سینے میں ضمیر کی لگائی

ہوئی آگ یوں بھی کبھی بجھی ہے بھلا۔

❀---❀---❀

چھوٹی موٹی چوریاں کرنے والا جانی اب بوبی کے ساتھ باقاعدہ ڈکیتی کی وارداتوں میں شامل رہنے لگا تھا لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ آئے روز لوٹ مار کرتے ہوں ہاں البتہ جب ایک ڈکیتی سے حاصل کی گئی رقم ختم ہوتی تو دوسری کا منصوبہ بنایا جاتا۔

''یار بوبی!'' جانی نے پزا ختم کرنے کے بعد ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کیے اور کولڈ ڈرنک شیشے کے صاف شفاف گلاس میں انڈیلتے ہوئے سامنے بیٹھے بوبی سے مخاطب ہوا جو نئی لائی گئی ڈی وی ڈی کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

''ہاں بول۔'' جواب بھی مختصر ہی ملا تھا۔

''میں سوچتا ہوں جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہ سارا روپیہ پیسہ جو اکٹھا کرتے ہیں تو آخر کس لیے جب کہ نہ تو ہمارا کوئی گھر ہے اور نہ ہی گھر کا سکون۔'' ایک گھونٹ لے کر اس نے گلاس واپس رکھ دیا تھا بوبی نے ایک نظر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

''لگتا ہے آج پھر تجھے ڈپریشن کا دورہ پڑنے والا ہے۔'' اس نے بات کو ہنسی میں اڑانا چاہا مگر جانی مکمل طور پر سنجیدہ تھا۔

''اچھا چل اگر میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں تو بتا کیا بس یہی ہے ہماری زندگی؟''

''اب یار تُو بھی ناں' کبھی کبھار تو لمحہ بھر میں موڈ کا بیڑہ غرق بلکہ ستیاناس کر کے رکھ دیتا ہے بوبی نے خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ڈی وی ڈی ایک طرف رکھی اور اس کے چہرے پر اپنی پرسوچ نظریں ٹکاتے ہوئے بولا۔

''ہوں..... تو تجھے سکون چاہیے اور یہ جو روپیہ پیسہ ہے تو اسے اکٹھا بھی نہیں کرنا چاہتا۔'' جانی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا جو کچھ سوچ رہا تھا اور ایک دم جیسے ذہن میں کوئی آئیڈیا آنے پر اس نے چٹکی بجائی۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے آج تجھے ایک نئی دنیا کا نظارہ کرواتا ہوں اور تیرے طفیل خود بھی آج اس دنیا کو نزدیک سے دیکھتا ہوں۔'' دائیں آنکھ بند کر کے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بوبی نے کہا تو جانی اس کی معنی خیزی پر الجھ کر رہ گیا۔

''لیکن کہاں اور کون سی دنیا میں؟''

''او یار تُو اٹھ تو سہی' وعدہ کرتا ہوں مریخ پر نہیں لے جاؤں گا' اعتبار کر میرا۔'' اور پھر جانی نے مزید تکرار کرنے کے بجائے جوتے پہنے' موبائل جیب میں ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

❀---❀---❀

رقص کو اعضاء کی شاعری اور اداؤں کو قاتل کیوں کہا جاتا ہے' ابروؤں کی ہلکی سی جنبش پر گھروں کا سکون کیا غارت ہو جاتا ہے اور زلفوں کی گھنیری سیاہ رات بے چین مسافروں کو اپنی مدہوش پناہ اور پُرکشش سحر میں کس طرح جکڑتی ہے' ان تمام باتوں کا مفہوم ان پر آج یقینی طور پر آشکار ہونے جا رہا تھا۔

موٹر سائیکل پر تقریباً پون گھنٹہ کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ دونوں ایک گنجان آباد محلے میں داخل ہوئے تھے' تنگ گلیاں اور گھروں کے طرز تعمیر میں پرانے نقش و نگار کا نمایاں رنگ' ایک عجیب طرح کی فضا تھی یوں لگتا تھا کہ گلی کے اندر داخل ہوتے ہی وہ کسی کیمرے کی زد میں تھے اور کئی آنکھیں انہیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں اور آخر کار اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بوبی اور جانی ایک تین منزلہ گھر کے سامنے جا رکے۔ اطلاعی گھنٹی بجانے پر اندر سے ایک ادھیڑ عمر آدمی پان چباتا ہوا آن کی آن میں باہر نکلا اور ان کے ظاہری حلیے سے انہیں کوئی امیر آسامی سمجھ کر خوشامدی لہجے میں بولا۔

''جناب والا! اندر آئیں گے کیا؟'' بوبی نے یہ جتایا کہ وہ لوگ نئے نہیں ہیں ایڑی کے بل گھوم کر اردگرد موجود گھروں پر بھی اچٹتی سی بے پروا نظر ڈالی جہاں شام کے پھیلے ہوئے ہلکے ہلکے دھندلکے میں گھروں کے بیرونی دروازوں پر ننگے بلب کی زرد روشنی دیواروں پر شوخی کے بجائے مایوسی اور دکھ بکھیر رہی تھیں۔

''کیا خیال ہے جانی! چلیں اندر؟'' بوبی نے جانی سے رائے مانگی تو اس نے پینٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکالے بغیر ہی کندھے اچکا دیئے' جس طرح نوٹ کے اوپر یہ عبارت جلی حروف میں درج ہوتی ہے کہ حامل ہذا کو مطالبے پر ادا کیا جائے گا۔ اسی طرح بوبی نے بھی چند کھڑکھڑاتے نوٹ مطالبے کے جواب میں ادا کیے اور اسی کی پیروی میں تنگ سیڑھیوں کے ذریعے پہلی منزل تک جا پہنچے جہاں گلے میں سرخ مفلر لٹکائے سر پر دائیں طرف ٹوپی کا جھکاؤ رکھتے ہوئے اسی عمر کا ایک اور شخص موجود تھا۔

''سرکار خوش آمدید! بڑی قسمتوں والے ہو گئے ہم آج کہ آپ جیسے امیر زادے ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے۔'' جانی اور بوبی دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ اس بات کا اب کیا جواب دیا جاتا ہے مگر اس شخص نے ان کی الجھن کی سلجھن پیش کر دی۔

''سرکار اندر جا کر تو نوٹوں کی بارش کرتے ہیں آپ جیسے سخی شہزادے! تُو اگر آپ کو بڑے نوٹ کا کھلا چاہیے تو سرکار میں حاضر ہوں۔''

اس کی بات کا مقصد سمجھ کر بوبی نے پانچ ہزار کے نوٹ کا کھلا کرواتے ہوئے دس روپے کی چند گڈیاں لے کر کچھ اپنے اور جانی کے جیب میں ڈال دیں اور آخر کار سیڑھیاں عبور کرتے وہ تیسری منزل پر عین اس دروازے کے سامنے کھڑے تھے جس کے اندر ان کی منزل تھی اور اندر جا کر ان کی حیرانی کا جو عالم تھا وہ ان کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھا کہ وہ جو یہ سوچ بیٹھے تھے کہ شاید وہ ہی دونوں آج یہاں آئے

ہیں اس کشادہ مربع نما وسیع ہال کو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ نیم دائرے کی شکل میں دو لائنیں بنائے اور بھی کئی تماشائی ان سے پہلے وہاں بیٹھے تھے' کسی کو کسی سے شرمندگی ہو رہی تھی اور نہ ہی کوئی خود کو چھپانے کی کوشش میں تھا بلکہ ان کے اطمینان کا یہ عالم تھا گویا وہ اس وقت کسی ہوٹل کے پُرسکون گوشے میں موجود ہیں۔ جانی اور بوبی نے ایک دوجے کو دیکھا اور اپنی گھبراہٹ پر مکمل قابو پاتے ہوئے باقی تمام لوگوں کی طرح اس قاتل حسینہ کے انتظار میں بیٹھ گئے جو چند ہی لمحوں بعد ان پر بجلیاں گرانے کو تیار تھی سو اس منفرد اور انوکھے تجربے سے محظوظ ہوتے ہوئے ابھی انہوں نے گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کیا ہی تھا کہ ایک اونچ دار آواز پر چونک گئے۔

میک اپ سے لیس ایک ادھیڑ عمر عورت جارجٹ کی ڈارک بلو ساڑھی کا پلّو دانستہ اپنے نیم عریاں سڈول بازو کو ڈھانپنے کے بجائے بڑی ادا سے کندھے پر سے گراتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی' سبھی نظریں اس کی طرف تھیں تو یہ اطمینان ہونے کے بعد سب اسے دیکھ چکے ہیں پلّو بڑے محتاط انداز میں دوبارہ کندھے پر اس انداز سے ٹکایا کہ چند ہی لمحوں بعد اس کا پھر سے گر جانا شرطیہ تھا۔ اس پر سفید سلیولیس شارٹ بلاؤز پر ساڑھی کا ہمہ رنگ دبکے کا نفیس سا کام جسمانی خطوط کو واضح کرتے ہوئے واقعی بلا کا غضب ڈھا رہا تھا۔

''جی تو حضور! آپ سب کیا سنیے گا؟ مغنیہ اور سازندوں کو گوایا جائے یا پھر ریڈی میڈ فوڈ سے ہی کام چلایا جائے۔'' ہونٹوں سے زیادہ آنکھوں سے باتیں کرتے ہوئے اس نے سامنے رکھے ڈیک اور اس کے دونوں طرف بڑے خوب صورت سے ریک میں رکھی لاتعداد سی ڈیز کو ریڈی میڈ فوڈ کہہ کر رائے چاہی تو اکثریت نے سی ڈیز کے استعمال کو ہی ترجیح دی۔

''جو آپ کا حکم۔'' بڑی ادا سے پیشانی تک ہاتھ لے جا کر پلکوں کو جھکاتی ہوئے اس نے تعمیل ہو جانے کا عندیہ دیا اور دعوتِ نظارہ دیتی بڑے ردھم سے چلتی ہوئی منظر سے غائب ہو گئی۔

دائیں طرف موجود سنگِ مرمر کے تخت پر ستار' طبلہ اور ہارمونیم وغیرہ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہوئے یہاں کی دوپہروں کی طرح خاموش اور سنسان معلوم ہوئے۔ اس خاتون کے چلے جانے کے بعد بوبی اور جانی نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر وہاں اسی ماحول میں گم ہو گئے۔

اسی دوران سفید چوڑی دار پاجامے' چھوٹی سی قمیص اور سر پر کپڑے کی ٹوپی جمائے ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا ہاتھ میں اسٹیل کا بڑا سا تھال لیے اندر داخل ہوا اور سب کو فرداً فرداً آداب کرنے کے بعد تھال ان کے سامنے پیش کرتا گیا جس میں حاضرین کی تعداد سے زائد مقدار میں میٹھے پان بڑی خوب صورتی سے سجائے جانے کے ساتھ ایک جانب سونف' گل قند' زعفران اور چند دوسری اشیاء چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کی صورت میں موجود تھیں تاکہ اپنی اپنی پسند اور ذائقے کے حساب سے پان میں شامل کر لی جائیں۔ تواضع

کرنے کے بعد اس نے تھال ہارمونیم کے قریب رکھتے ہوئے سفید جالی دار پوش سے ڈھانپا اور خود جس طرف سے آیا تھا وہیں لوٹ گیا جب ہی میرون اور ہلکے سرمئی رنگ کے امتزاج سے والے سلک کے بھاری پردوں سے گھنگھروؤں کی ہلکی ہلکی گنگناہٹ کے ساتھ موسیقی کے ردھم کی طرح لچک دار انداز میں قدم اٹھاتی ایک خوب صورت دوشیزہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ سب کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔

وہ خاتون بھی اس کے ساتھ ہی ستائشی نظروں سے ماحول کو دیکھتیں تو کبھی اپنی پروڈکٹ کو اور پھر وہ ان کے بیچ قطعی طور پر حائل ہونا نہیں چاہتی تھیں جبھی سنگِ مرمر کے تخت کی جانب بڑھ گئیں اور اپنی مخصوص جگہ سنبھالی۔

وہ ساحرہ جس کی اداؤں سے فیض یاب ہونے کے لیے وہاں بیٹھے تمام تر لوگ اپنی نیندیں تج کیے اس کے دربارِ حسن میں انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہے تھے' پیرٹ گرین گھاگھرے اور سرخ مختصر سی کُرتی میں اس کی چھب دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

سی ڈی آن کی گئی تو نازک کمر کو سائے کی طرح ڈھکنے والے ریشمی بال رقص کے دوران یوں لہروں کی طرح بکھرتے کہ دیکھنے والے دم بخود رہ جاتے۔ ذومعنی گیت اور پھر اس کے مخصوص مصرعوں پر وہ تماشائیوں کے بے حد نزدیک آ کر حنائی ہاتھوں اور کاجل لگی آنکھوں سے انہیں جو پیغام دیا کرتی اس پر ان کا آپے سے باہر ہونا ایک فطری عمل تھا اور یہی ردعمل تو ان کی پرفارمنس کے کامیاب ہونے کی دلیل اور دام بڑھنے کی ضمانت تصور کیا جاتا تھا۔

بوبی اور جانی بھی دم بخود بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے جا رہے تھے اور شاید اسی طرح سانس روکے دیکھتے ہی رہتے کہ اس حسینہ نے آنٹی کی طرف سے اشارہ ملنے پر گھاگرا گھماتے ہوئے لمحہ بھر ان کے سامنے قیام کیا اور بوبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کندھے سے کندھا مار کر ٹھوکا دیتے ہوئے شاید جگایا تھا۔ بوبی سر کھجاتے ہوئے خجل ہو کر مسکرایا تو رہی سہی کسر اس حسینہ کے آنکھ مارنے پر پوری ہوگئی۔

اور بس پھر تو جیسے اس کی یادداشت واپس آ گئی' گلی کی نکڑ پر موجود کھوکھے سے خریدے گئے پھولوں کی پتیاں سفید مومی لفافے میں دونوں کے درمیان رکھی تھیں سو بوبی نے بھی اٹھ کر وہ پتیاں اس حسینہ پر نچھاور کر دیں' کچھ آدمی گھٹنوں کے بل حسینہ کے پیچھے پیچھے نوٹ نچھاور کیے جا رہے تھے۔ ان کی اسی جدوجہد پر خوش ہو کر گڑیا اب ان تین چار آدمیوں کے دائرے میں انہی کے بتائے گئے انداز میں رقص کر کے انہیں مزید خوش کرتے ہوئے نوٹوں کے نچھاور کرنے کی رفتار میں تیزی پر اکسا رہی تھی۔ چاروں تماش بین ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں اب تک نوٹوں کی برسات جاری رکھے ہوئے تھے۔ جانی نے بھی جیب سے تازہ نوٹ نکالے اور اس برسات میں اپنا حصہ ڈالنے لگا۔

ایک کے بعد ایک گانا نان اسٹاپ بج رہا تھا' مگر گڑیا کے جسم میں بھری بجلی اسے لمحہ بھر کو تھکاوٹ کا شکار ہونے نہیں دے رہی تھی یا شاید اس کا عزم تھا کہ جب تک سامنے موجود لوگوں کی جیبوں میں ایک نوٹ بھی باقی بچے گا وہ تھک کر نہیں بیٹھے گی اور یہی وجہ تھی کہ اس کی توجہ کا مرکز اب وہی لوگ تھے جن کے پاس مال باقی تھا لیکن یقیناً وہ بھی گھاگ تھے جبھی کچھ رقم بچائے اسے آخر شب تک محو رقص دیکھ کر اپنی آنکھوں کی تسکین چاہتے تھے۔ کسی بھی قسم کے دنگے فساد کے ڈر سے مزید کسی بھی چیز کے پینے پلانے کا انتظام نہیں کیا گیا تھا یوں بھی گڑیا کے ہوتے ہوئے ان میں سے کسی کو بھی ہوش ہی کہاں تھا کہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچا بھی جاتا۔

ہوس کی حدت میں تھرتے لمس' نفسیاتی خواہشات کی پکار پر جا بجا رکتی آنکھیں' کھلم کھلا ہوتی اخلاقی چوریاں اور ہیجان انگیز ان کہی خاموش پیاسے ہونٹوں کی پکاریں رات بھر بھرپور اظہار کرتی رہی تھیں۔ ایک عجیب سی بھوک تھی جو اُن تمام تماش بینوں کی نظروں میں تھی اور شاید ساری دنیا کو یہ بھوک ہی تو متحرک کیے ہوئے ہے کہیں روٹی کی بھوک ہے تو کہیں اقتدار کی' پیسے کی' جاہ ونسب کی' ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کی' پیار کی' دولت اور عورت کی.....

ساری دنیا اپنی اپنی بھوک کے پیچھے دیوانہ وار' ہر چیز تج کیے بس بھاگتی ہی جا رہی تھی' بغیر کسی اکتاہٹ اور بیزاریت کے۔

مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ پھر بھی یہ بھوک ہے کہ مٹتی ہی نہیں' رفتار مدھم ہونے ہی نہیں دیتی کہ قدم روکے جانے کا سوچا بھی جائے اور پھر آخر کار اشرف المخلوقات جیسا اعلیٰ رتبہ پانے والا انسان اس بھوک کے پیچھے بھاگتا شل ہوتے جسم کے ساتھ کہیں جو گا نہیں رہتا۔

حاصل کی گئی پرچی کی ادا کردہ رقم کے مطابق آج کا وقت اب طلوع سحر کے آس پاس بس ختم ہی ہوا چاہتا تھا۔ گڑیا نے بڑے موہنے انداز میں آداب کرنے کے بعد اداؤں ہی کے ذریعے تمام حاضرین کو دوبارہ بھی آنے کی دعوت دے ڈالی اور ایک بار پھر انہی پردوں کے پیچھے جا چھپی جہاں سے وہ ظاہر ہوئی تھی۔ آنٹی جو اس سے کچھ دیر پہلے منظر سے غائب ہوگئی تھیں اب دوبارہ ان سب کے سامنے تو تھیں مگر اس مرتبہ وہ اکیلی نہ تھیں بلکہ گرٹل کے پھول کی طرح سرخ چہرہ اور مہاتما بدھ کی لمبی کنپٹیوں تک جاتی خوابیدہ آنکھوں والی' نرگس کے ڈنٹھل میں اولین پھول کی طرح شگفتہ ایک اور کم عمر دوشیزہ بھی ان کے ساتھ تھی جسے دیکھ کر ادیب لوگوں کو یقیناً گاستھ لڑکیوں کی یاد ستائی' وہی جسم اور ہو بہو ویسا ہی قد کاٹھ.....

اسے دیکھتے ہی سب کو لگا جیسے دسمبر کی شام میں آتش دان کے سامنے بیٹھے بیٹھے اچانک کسی نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی ہو اور تازہ یخ بستہ ہوا کا نرم سا جھونکا آن کی آن میں گدگداتا جا رہا ہو۔ خود جانی کے دل میں ان ادھ کھلی آنکھوں کو بہت قریب سے دیکھنے کی خواہش جاگی تھی۔ یوں بھی کوئی لڑکی کبھی بھی مکمل

خوب صورت نہیں ہوتی لیکن وہاں وہ ایک لمحہ جب وہ مرد کے دل کو چھو جائے تو پھر اس کی زبان بیان ظاہر باطن کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ وہی ایک لمحہ تمام زندگی پر محیط لگنے لگتا ہے اور جانی بھی اسی ایک لمحے کی قید میں گرفتار ہو گیا تھا۔

وہ لڑکی جسے آنٹی چندا کے نام سے متعارف کروا رہی تھیں شاید اپنے تاثرات میں خود ہی الجھی ہوئی تھی۔ اداس ہوتے ہوئے ذرا ذرا مسکرانے والی اپنے نام کا عکس لگتی تھی' خاموش لبوں پر جیسے ہی مسکراہٹ تیرتی اسی طرح محسوس ہوتا گویا بدلیوں میں سے چند جھانکنے لگا ہو۔ چند منٹوں بعد ہی آنٹی نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی استفہامیہ نظروں سے آنٹی کی جانب اس نوخیز کلی کے بارے میں جاننے کے لیے لپکے جو صنفِ مخالف کو آکٹوپس کی طرح بڑی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ ہال سے کیا رخصت ہوئی جانی کو اپنے دل کی دھڑکن مدہم ہوتی محسوس ہوئی اور اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرتا بوبی بھی چونکے بغیر اس لیے نہ رہ سکا کہ پہلے گڑیا جو سب کے بیچوں بیچ دستیاب تھی' جانی نے ایک بار بھی اوروں کی طرح اس کی طرف لپکنے کی کوئی حرکت نہیں کی تھی اور اب چندا کے لیے اتنی بے تابی کہ اس کے جانے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے خود جانی کی کوئی قیمتی چیز پُرہجوم جگہ پر گم ہو گئی ہو۔

رقص کے دوران حفاظتی تدبیر کے طور پر زینے والا لڑکا بھی آہستگی سے ہال سے نکل چکا تھا' البتہ آنٹی ابھی تک سب کو الوداع کہنے کے لیے موجود تھیں۔ جن کی ساڑھی کا پلّو اب کچھ زیادہ ہی ریشمی ہو چلا تھا۔

''واہ آنٹی! آج تو تم نے حیران کر دیا آخر میں' پہلے تو کبھی چندا کو نہیں دیکھا۔'' کلف کے کڑکڑاتے بادامی رنگ کے شلوار سوٹ پہنے اس شخص نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ''کہاں کہاں سے نکال لاتی ہو ایسے ہیرے کہ خبر ہی نہیں ہوتی اور ہیرا سامنے آ کر بس دل کے آر پار ہو جاتا ہے۔''

''ابھی ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہی تو منہ دکھائی کی تھی اس کی اور تم تب سے آئے ہی نہیں دیکھتے کیسے۔'' آنٹی نے ایک نظر بان والے لڑکے کی طرف دیکھا جو تمام گاؤ تکیے سمیٹ کر اب کارپٹ پر سے بکھری اور مسلی ہوئی پتیاں صاف کر رہا تھا۔ نوٹ البتہ پہلے ہی احتیاط سے چُن لیے گئے تھے۔

باقی تمام لوگ جو پہلے سے اس بھاؤ تاؤ کی دوڑ میں آؤٹ ہو چکے تھے' آہستہ روی سے نہ چاہتے ہوئے بھی رخصت ہونے پر مجبور تھے۔

''چلو تب نہیں آیا تو کیا ہوا' اب تو آ گیا ہوں ناں اور اگر اب اسے دیکھنا چاہوں تو؟'' آنٹی کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی اور طنز کی دبیز چادر تلے چھپ گئی۔

''منہ دکھائی تو بے شک تم ڈیڑھ ہفتے سے کر رہی ہو گی لیکن یاد رکھنا پہلا حق میرا ہے۔'' آنٹی نے

ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ ''تب سے تمہارے پاس آتا ہوں جب یہ دو پونیاں کر کے گھومتی تھی اب اگر میرے علاوہ تم نے کسی اور کا ایڈوانس پکڑا تو زیادتی ہوگی۔'' مکمل طور پر ایک تماش بین کا سا انداز اپناتے ہوئے اس نے حق جتایا اور زبان کی مدد سے اوپری مسوڑھوں سے سونف ہٹا کر ذرا سا آنٹی کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''چلو اب بتاؤ بھی ناں' اس پھول کے کتنے لوگی؟''

''دے نہیں پاؤ گے میاں! اس لیے نہ ہی پوچھو۔'' اس کے تیور واضح طور پر بدلتے نظر آئے تھے۔ ''اور پھر ابھی تو ریٹ لگ رہا ہے دیکھو کہاں جا کے رکتا ہے' ویسے بھی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے' میں کوئی پنجوں کے بل تھوڑی بیٹھی ہوں کہ بس جلد از جلد اسے مارکیٹ میں لے آؤں۔'' کندھے اچکاتے ہوئے ٹالنے کے انداز میں کہا گیا اور جانی جو کھلے دروازے کے عین بیچ میں بیٹھے جاگرز پر جھکا جان بوجھ کر تسمے الجھائے ہوئے تھا اس کا دل اس زور سے دھڑکا جیسے پسلیاں توڑ کر ابھی باہر آئے گا۔ خود بوبی بھی ان دونوں کی باتیں سننے کے دوران جانی کے تاثرات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا جونہی بات ختم ہوئی اس نے جانی کو ٹہوکا دیا اور وہ تسمے جو اتنی دیر سے الجھے ہوئے تھے ایک دم سے بندھ بھی گئے اور وہ لوگ سیڑھیاں اترنے لگے۔

❀---❀---❀

احساسِ جرم' ارتکاب جرم سے زیادہ بلکہ کہیں زیادہ خلش کا باعث بنتا ہے کیونکہ ارتکاب جرم تو وقت کی چند گھڑیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اس کے برعکس احساس جرم دل میں زندہ ہو جائے تو پھر مرتا نہیں بلکہ مرتکب کی زندگی کو بھی گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ جرائم کی عملی سزائیں بھی اسی احساس کو ہی جگانے کا ایک ذریعہ ثابت ہوتی ہیں کیونکہ احساس زندہ ہو تو روح بھی زندہ ہوتی ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

جب سے ناجی پر اس ایک پل کے طفیل آگہی کا در وا ہونے کی صورت میں اپنے فعل قبیح کا احساس ہوا تھا' ایک آگ سی اس کے جسم و جاں میں بھونچال اٹھائے رکھتی تھی۔ ضمیر کی عدالت نے مجرم پینو یا رانی کو نہیں بلکہ خود اس کی ذات کو ٹھہراتے ہوئے جو زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا تھا وہ اسے حقیقتاً حواس باختہ کر گیا تھا' آگ کی حدت اتنی تھی کہ لگتا اس کی پلکیں تک جل گئی تھیں۔

کمر پر برسائے جانے والے کوڑوں کی شدت اتنی تیز تھی کہ کمر کے بل لیٹ نہ پاتی' دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتی تو بلبلا اٹھتی۔ سنگساری چاروں طرف سے اس رفتار سے تھی کہ وہ کہیں بھاگ ہی نہ پاتی' اپنا کوئی بھی عضو بچا ہی نہ پاتی نتیجتاً سارا جسم لہولہان حالت میں تڑپتا رہتا۔

گڈی تو ابھی ناسمجھ تھی اور رانی کم سن' مگر خود پینو کے لیے یہ تمام صورت حال بے حد حیران کن تھی کہ آخر سب کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ ناجی کبھی تو کمر پر ہاتھ رکھے چلانے لگتی تو کبھی دیوانہ وار چھپ چھپ کر ستر

ڈھانپنے کی کوشش کرتی، لیٹتی تو بان کی چارپائی میں اسے رسیوں کی جگہ جابجا سانپ لٹکتے محسوس ہوتے۔ زمین پر بیٹھتی تو لگتا کہ کوئی اسے دونوں ہاتھوں سے زمین کے اندر دھنسا دینا چاہتا ہے، سو بیٹھے بیٹھے فضا میں ہاتھ بلند کر کے چیخنے چلانے لگی۔

''بچالو مجھے، کھینچ لو، اوپر کھینچ لو۔ زمین نیچے دھنس رہی ہے، کوئی مجھے زمین کے اندر کھینچ رہا ہے، خدا کے واسطے مجھے بچالو..... دھنس گئی تو..... تو میرا سانس گھٹ جائے گا۔ ایسے میں پینو بے چارگی کے عالم میں انگلیاں مسلتی بس اسے دیکھے جاتی جو بیٹھے بیٹھے فضا میں معلق ہو جانے کی خواہش میں خود کو زمین سے دور کرنا چاہ رہی تھی۔

''یہ دیکھ..... دیکھ کتنی زور سے پکڑا ہوا ہے مجھے، میری ہڈیاں تک ٹوٹنے کی آواز آ رہی ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہ کرو، میں یہیں ٹھیک ہوں، زمین سے کہو لرزنا چھوڑ دے، مجھے نہ جھنجوڑے۔'' پینو اسے سمجھاتی، سنبھالتی مگر وہ اس کی سنتی ہی کب تھی، ایسی دلدوز آواز میں التجائیں اور فریاد کرتی کہ اردگرد والوں کا دل بھی خوف سے کانپ جاتا۔ رانی اور گڈی کبھی کونوں میں دیکھتیں تو کبھی پینو سے آ لپٹتیں اور تب پینو کے گالوں پر رواں آنسو ان دونوں کے بال بھگوتے رہتے، وہ جیسی بھی تھی آخر ان کی ماں تھی جس کے بغیر اب بھری دنیا میں ان کا کوئی نہ تھا اور پھر وہ دنیا والوں کے سامنے کمزور رہی مگر ڈھال تو تھی، جانی کی یاد ایسے میں دل میں ہمکتے ہوئے کسی سائل کی طرح، دل کا دروازہ زور سے پیٹنے لگتی اور پینو رہ رہ کر کوئی معجزہ ہو جانے کی دعا مانگا کرتی۔ وقت کا چابک بلاشبہ ان پر بڑی زور سے برسا تھا۔

قرب و جوار میں رہائش پذیر بستی کے زیادہ تر لوگوں کی رائے یہی تھی کہ ناجی پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے، ان کی رائے کی وجہ یقیناً ان کی لاعلمی ہی تھی کیونکہ پینو اچھی طرح جانتی تھی کہ رانی کے نادانستہ فعل نے ایک ہی پل میں آگہی کا دروا کرتے ہوئے اس کی تیسری آنکھ کھول دی تھی اور وہ، وہ سب کچھ ہوتا ہوا محسوس کر رہی تھی جس کی شاید مستقبل قریب میں ہونے کی وعید کی گئی ہے۔

کئی دن اسی حالت میں گزر گئے تھے، گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا بس ایک دو بار تو ترس کھا کر کسی نے روٹی دی مگر کب تک؟ وہ سب بھی ان ہی کی طرح روز کمانے اور کھانے والے لوگ تھے۔ شہر کے مخدوش حالات کے باعث بمشکل اتنا ہی مل پاتا کہ بیوی بچوں کو روکھی سوکھی کھلا پاتے کجا کہ کسی اور کی مدد کرنا اور پھر یہی سب نہیں بلکہ پینو کے لاکھ سمجھانے اور کوشش کرنے کے باوجود ناجی غسل خانے میں قدم نہ دھرتی۔ اسے لگتا جیسے اندر داخل ہوتے ہی چاروں اطراف سے دیواریں اور اوپر نیچے سے چھت اور زمین آہستہ آہستہ سکڑتے ہوئے اسے اپنے شکنجے میں لینے لگے ہیں، یوں بھی وہ اپنے حواسوں میں تھی ہی کب کہ حوائج ضروری کا خیال رکھ پاتی۔

اس دن بھی پینو نے بمشکل ناجی کی غلاظت سے بھرے کپڑے بدلوا کر انہیں غسل خانے میں پھینکا اور

دوسرا جوڑا جو اس نے ابھی صبح ہی دھو کر ڈالا تھا' اسے گیلا ہی پہنا کر چارپائی پر بٹھایا کہ دو ہی جوڑے تھے اور مجبوراً یہی پہننا تھا۔ رانی اور گڈی کو ناجی سے خوف آتا تھا اور وہ حتی المقدور کوشش کرتیں کہ اسے نہ دیکھیں اس وقت بھی دونوں کمرے کے ایک کونے میں تصوراتی کھلونوں سے کھیل رہی تھیں۔ پینو نے دروازے کی جگہ استعمال کیے جانا والا لان کا دوپٹہ ہٹایا اور ناجی کی طرف پشت کیے اس کے بدبودار کپڑے دھونے لگی' ایسے میں ناجی چارپائی سے اتری اور اکڑوں بیٹھ کر زمین پر یوں ہاتھ پھیرنے لگی گویا اپنی کوئی گمشدہ چیز ڈھونڈ رہی ہو اور یونہی ڈھونڈتے ہوئے وہ کب دہلیز پار گئی پینو کو پتا ہی نہیں چلا۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی ناجی دیوانوں کی طرح دائیں بائیں دیکھتی اور کبھی خاموش کھڑی ہو کر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کھڑی ہو جاتی اور پھر جانے کیا ہوتا کہ اس کا دل بھر آتا اور وہ رونے لگتی کبھی سسکیوں سے تو کبھی ہچکیوں سے اور اسی طرح سسکیوں سے رونے کے دوران وہ گلی گلی گھوم کر برتن قلعی کرنے والے رانجھن کو دیکھ کر رک گئی۔

وہ دیگچیوں اور دوسرے برتنوں پر گیلی مٹی لگانے کے بعد دھونکنی فٹ کر کے اپنے چمڑے کو باندھتا' انہیں ذرا سا دھو کر کوئلوں پر سکھانے کے بعد کالی سیاہ دھونکنی سے ہوا دے کر قلعی کی ایک خراش دیتا اور لوگڑ کو لوشادر کے ساتھ لگا کر اس کا یوں مانجھا دیتا کہ دیگچی ہو یا کوئی اور برتن ان کی سب کی کالک شرطیہ دور ہو جاتی۔

''رانجھن او رانجھن' دیکھ یہ میرے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ' میری بھی کالک ہٹا دے ناں۔ اس لوگڑ سے میری بھی سیاہی ہٹا دے' قلعی کر دے ناں مجھے' ہیں بول..... کرے گا ناں۔'' دونوں ہاتھ جوڑے وہ رانجھن کے سامنے التجا کرتی' گڑگڑاتی اور پھر رو دی۔ رانجھن نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''ہاں کر دوں گا کسی دن۔'' تاسف سے گردن ہلاتا ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر وہ آگے بڑھ گیا تو ناجی کی التجائیں رانجھن کی عدم توجہ پر شدت اختیار کر گئیں۔

''یہ دیکھ رانجھن! میرا دل کیسا کالا اور بدبودار ہے اور..... اور مجھے نہیں پتا کہ کیا لیکن تُو میرا یقین کر' اس میں کچھ رینگتا محسوس ہوتا ہے مجھے' ایسا لگتا ہے کہ اس کی سرسراہٹ نہیں ہے بلکہ کوئی کند چھری سے میرا سینہ کاٹ کر دل نکال لینا چاہتا ہے' یہ دیکھ.....'' مخبوط الحواس بنی ناجی کھردرے ہاتھوں سے قمیص پھاڑ کر اسے یہ سب عملی طور پر دکھانا چاہتی تھی کہ رانجھن اس کا اگلا فعل سمجھ کر وہاں سے یوں غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ وہ اب تک گریبان کے بٹنوں میں الجھی ہوئی تھی کہ اچانک کچھ خیال آتے ہی چور نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور سسکتے ہوئے گھٹنوں میں سر دے لیا۔

دل میں احساسِ جرم کا تیز لانبو بھک بھک جل اٹھا تھا اور پھر وہ اٹھی اور اس پیلی بدرنگ بلی کی طرح جو بے چاری نالیوں اور گلیوں میں جان بچائے پھرتی دکھائی دیتی ہے ایک گلی سے دوسری گلی کا راستہ ناپنے

لگی۔ آنکھوں سے آنسو بے ساختہ یوں بہہ رہے تھے کہ اس کے حلق میں کسیلے گھاس کی دھونی ہونے کا گماں ہوتا۔ اُدھر پینو ابھی دھلے ہوئے کپڑے نچوڑ کر غسل خانے سے باہر نکلنے ہی والی تھی کہ رانی نے اسے ناجی کے گھر پر نہ ہونے کی اطلاع دی۔

''نہیں ہے تو کہاں گئی؟ میں نے کہا تھا ناں تجھے دھیان رکھنے کا' پھر کہاں گئی؟'' پینو نے جھنجلاہٹ میں رانی کو اس کے کمزور کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا تھا لیکن ظاہر ہے اس کے پاس پینو کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا سو ٹکر ٹکر کر منہ نیچے کیے زمین کو دیکھتی رہی۔

''اوہ میرے خدا' اب میں کہاں ڈھونڈوں؟'' پریشانی کے عالم میں وہ فوراً گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی' رانی اور گڈی بھی ایک دوسرے کی انگلی کو مضبوطی سے تھامے حیران پریشان اس کی طرف لپکی تھیں' بوکھلاہٹ' پریشانی بے چارگی تینوں ہی کے چہرے سے ہویدا تھی۔

کوئی مخصوص جگہ تو تھی نہیں جہاں وہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتے پہنچ جاتی' سو ادھر اُدھر یونہی ممکنات کے سہارے ڈھونڈتے ہوئے اچانک ہی اس کی ترستی سماعتوں سے ناجی کی لرزتی کانپتی آواز یوں ٹکرائی کہ دل کے آر پار ہوگئی۔

''صرف ایک بار مجھے اللہ سے معافی لے دو' بس ایک بار میرے گناہ دھو دو' یہ دیکھو..... یہ دیکھو میرا ماتھا سیاہ اور ہونٹ کیسے نیلے ہو رہے ہیں یا شاید میرا پورا چہرہ نیلا ہوگیا ہے ناں اور سنو یہ جو بدبو اور تعفن میرے اندر سے اٹھ رہا ہے ناں' یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا' اس اوپر والے ربّ سے..... بس ایک دفعہ.....'' ناجی مسجد کے صحن کے بیچوں بیچ نمازیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے مسلسل معافی دلوانے پر تکرار کیے جا رہی تھی۔

''او مائی! چل باہر نکل' گندے کپڑے' گندے پاؤں' گندا جسم..... لاحول ولا..... کچھ تو مسجد کے تقدس کا لحاظ کیا ہوتا۔ جا پہلے جا کر صاف ستھری ہو جا' معافی تو بعد کی بات ہے۔'' امام صاحب نے مسجد کی طہارت اور پاکیزگی کا خیال کرتے ہوئے دائیں ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔

''اگر وہ بس صاف لوگوں کی ہی سنتا ہے تو ہم گندے لوگ کہاں جائیں؟ وہ پاک ہے تو کیا صرف تم جیسے پاک لوگوں کا ہی ربّ ہے؟ میرے جیسے پلید کس کے پاس جائیں' ہمارا ربّ کون ہے پھر؟'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے سوال پر سوال کیے جا رہی تھی اور اردگرد لوگ یوں کھڑے ہونے لگے تھے جیسے عموماً بچے بندر کا تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

''اور پلید بھی مجھ جیسی' جس نے اپنے ہی جسم کے پاک ٹکڑوں کو پلید کر بیچا تو اب کیا وہ مجھے معاف نہیں کرے گا اور اس کی معافی کے بغیر میں کیسے صاف ہو سکتی ہوں؟''

یہ بات ہم میں سے کوئی بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثر انسان کی زندگی غلطیوں'

خطاؤں اور گناہوں کا پلندہ ہے اور اگر کبھی یہ غلطیاں' یہ خطائیں اور یہ تمام گناہ کسی مجسم ٹھوس شکل میں ہماری اپنی نظروں کے سامنے آجائیں تو احساس ہوگا کہ ہم تن تنہا دشمنوں کے ہجوم میں گھر گئے ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود ہم صرف اپنی ہی ذات کو برتر سمجھنے پر تلے رہتے ہیں سو اب بھی مسلسل گریہ زاری سے ناجی کی آواز بیٹھتی جارہی تھی لیکن سب ہی لوگ محض معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے وہاں موجود تھے۔ نماز ختم کر کے جوتیاں پہننے والے نمازی بھی رک کر اسے دیکھنے لگے جو اپنے بڑھے ہوئے گندے ناخنوں سے اپنا ہی جسم چھیل دینے پر تلی تھی۔

''میں تو رگڑ رگڑ کر بھی اتاروں تو یہ میل' یہ گند' یہ بدبو جاتی ہی نہیں۔ مجھے چین نہیں آتا تم صاف ہو ناں' مولوی جی تم ہی معافی دلوادو ورنہ..... ورنہ میں تو جل جاؤں گی۔'' آسمان کی طرف اشارہ کر کے آنکھیں پھاڑتے ہوئے وہ خوف میں لپٹی ہوئی بولی۔

''وہ..... وہ دے گا ناں معافی؟ اگر میں.....'' جملہ ادھورا چھوڑ کر ناجی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے وحشت سے آنکھیں پھیلا کر دیوانہ وار بھاگتے ہوئے مسجد کے ستونوں کے اردگرد چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ چیخ کر سب کو اس آگ کی بابت بتانے لگی جو اسے آہستہ آہستہ آسمان سے زمین کی طرف بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔

''اچھا اچھا دلا دوں گا معافی' جا نکل ابھی یہاں سے۔'' مولوی صاحب نے مسجد کے کھلے دروازے سے باہر گزرتے لوگوں کو اندر آتا دیکھا تو معاملہ ختم کرنا چاہا۔

''نہیں..... تب تک تو میں اس بدبو سے مرجاؤں گی یہ..... یہ سرخ دہکتی آگ مجھے جلادے گی' مجھے ابھی معافی دلا کر دو۔'' مولوی صاحب نے اسے آس دلائی جو ناجی کے لیے ہرگز قابل قبول نہ تھی اس کے خیال میں آس میں رکھ کر مارنے سے بہتر پیاس میں رکھ کر مارنا تھا۔

لفظوں کی تکرار جاری تھی پینو نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسلیں اور اس کی طرف بڑھی یوں بھی ہم میں کچھ لوگ پانچ وقت نماز ادا کر کے دوسروں کو روکنے ٹوکنے' ان پر تنقید اور خود کو اعلیٰ و ارفع سمجھنے میں خود کو حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں ایسے میں ایک باریش بزرگ جو کافی دیر سے اسے ترحم کے بجائے حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے آخر کار بول ہی پڑے۔

''ارے نجانے کون کون سے گناہ لادے خانہ خدا کو ناپاک کر رہی ہے یہ عورت' نکالو اسے باہر اور مسجد کو صحن برآمدے سمیت دھوؤ۔''

خود نجانے کتنے گناہ کیے ہوں گے لیکن ناجی کا یوں اعتراف کرنا اس کے لیے ان کے دل میں نفرت جگا رہا تھا' جبھی تو اپنے گناہوں خطاؤں اور غلطیوں کو حتی الامکان خلق خدا سے مخفی رکھنے اور صرف اللہ ہی کے سامنے ظاہر کرنے اور توبہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے یعنی ظاہر کیا جائے تو اس کے سامنے جو معاف کر

دینے پر قادر ہو جو ہمارا رونا دیکھ کر ہمیں اپنی رحمت کی نرم گرم آغوش میں سمیٹ کر رحمت کی تھپکی سے ہمیں ایسا پرسکون کرے کہ لب خود بخود مسکرانے لگیں لیکن جو منہ سے ادا کیے گئے الفاظ کے ساتھ تلوار اٹھالیں ان کے سامنے ممکنہ تضحیک سے حتی المقدور بچنا ہی بہتر ہے۔

یوں بھی تو ہر کسی بھی فعل پر وہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچ کر آنسوؤں میں ڈھل جاتی ہے اور یقینی طور پر ہی آنسو قبولیت کی دلیل بھی ہوتے ہیں کہ ربّ العزت کی رحمت کو یہ بات گوارا ہی نہیں کہ کوئی اس سے معافی طلب کرے اور وہ سمیع و بصیر ہوتے ہوئے بھی توجہ نہ کرے۔ رحمٰن و رحیم ہونے کے باوجود اس کی رحمتِ خداوندی جوش میں نہ آئے کہ اس ذاتِ اقدس کے ننانوے نام رحیم و کریم ہی کی صفت کو بیان کرتے ہیں جبکہ صرف ایک نام اس کے قہر اور غضب کو ظاہر کرتے ہوئے ''قہار'' کہا گیا ہے اور اسی حساب سے اس کی بخشش و کرم ہم گناہ گاروں کے لیے ننانوے فیصد اور پکڑ محض ایک فیصد ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس ایک فیصد کی کروڑوں جھلک بھی ہمارے لیے قابل برداشت نہیں ہے اور اسی ایک فیصد کی پرچھائیں..... محض پرچھائیں ناجی کے ذہن کے پردے پر اپنا عکس دکھا رہی تھی۔

''اماں.....'' پینو نے رانی اور گڈی کو باہر ہی کھڑا رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود دو قدم آگے بڑھ کر اسے آواز دی تو اردگرد کھڑے سبھی لوگوں کی گردن میں ہلکی سی جنبش ہوئی' رخ موڑ کر اسے دیکھا تو ابروؤں میں خود بخود خم آیا تو وہ سکڑتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔

''سنبھال اس گناہوں کی پوٹ کو' جانے کس کس کا گناہ چھپانے کو اس چھت تلے آسرا لینے آ گئی ہے۔'' سر جھٹک کر مسجد سے نکلتے ایک شخص نے بے حد نخوت سے نتھنے پھیلاتے ہوئے کہا جو خود بھی یقیناً دانستہ اور نادانستہ گناہوں سے معافی کے لیے اسی چھت کے آسرے میں پانچ وقت گڑگڑایا کرتا تھا۔ پینو سب کی نظروں کا بمشکل سامنا کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم لے کر پہنچی تو ستونوں سے لپٹی ناجی آن کی آن میں ستون چھوڑ کر پینو کے پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''پینو..... پینو یہ دیکھ' یہ لوگ مجھے اللہ سے معافی لے کر نہیں دیتے..... اس سے ملنے نہیں دیتے جو اس گھر میں رہتا ہے' سن وہ تو سب کا ہے ناں' میرا بھی ہے پھر یہ مجھے کیوں نکال رہے ہیں؟ یہ تو صاف ستھرے ہیں ناں پھر یہی معافی دلا دیں.....'' پینو نے بڑی دل گرفتگی سے سب کے سامنے تماشہ بنی ناجی کو دیکھا جو اب اس کے پاؤں چھوڑ کر دونوں ہاتھ باندھے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔

''چل چھوڑ انہیں' تُو معاف کر دے مجھے صرف ایک بار..... بس ایک دفعہ..... معاف کر دے..... معاف کر دے..... معافی دلوا دے' بس ایک مرتبہ۔'' وہ ایک مرتبہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی' فلک شگاف آواز میں چیخ رہی تھی اور پینو کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے کہ وہ آخر اب کیا کرے۔

''ختم کر یہ تماشہ اور چل نکل یہاں سے۔'' مؤذن کے فرائض سرانجام دینے والے نبی بخش نے جب

ارامہ ختم ہونے کا کوئی امکان نہ دیکھا تو قریب آ کر گرج دار آواز میں یوں دھاڑا کہ ناجی ٹھٹک کر سہم گئی' پھٹی پھٹی آنکھوں سے نبی بخش کو دیکھتے ہوئے اس نے منہ پر انگلی رکھ لی تھی۔ پینو نے بھی اپنی آنکھیں پونچھیں اور اسے کھڑا کر کے اپنے ساتھ باہر چلنے پر آمادہ کیا۔ ان دونوں کے جانے کے ساتھ ہی ہجوم منتشر ہوا اور نبی بخش نے دریاں اٹھائیں اور مسجد کا گلابی اور فیروزی ٹائلوں والا فرش برآمدوں اور ستونوں سمیت دھونے لگا تب پینو کے ذہن میں بھی یہ سوال ضرور ابھرا تھا کہ کیا اس کی ماں کو معافی اسی صورت مل سکتی ہے جب کہ وہ پاک صاف اور نہا دھو کر آئی ہو؟ یہ ہم جیسے ہی عام سے لوگ ربّ تک پہنچنے کا رستہ اتنا کٹھن اور مشکل کیوں بناتے ہیں جبکہ وہ تو خود ہمارے دلوں کا مکین ہے۔

❀---❀---❀

ایک مدت ہوئی اسے دیکھے
ایک مدت سے کچھ نہیں دیکھا

جانی جب سے اس منقش دروازے کے اندر کی دنیا دیکھ آیا تھا' دن رات بڑے بدلے بدلے محسوس ہونے لگے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے ذہن میں وہ خوابیدہ سی آنکھیں یوں خواب جگاتیں کہ اسے اپنے دل پر قابو نہ رہتا۔ چندا کا پُرکشش چہرہ چاند کی طرح اس کی راتوں کو منور کر دیتا تو وہ اپنی اس کیفیت پر خجل ہو کر خود بخود ہنس دیتا اور اس کی ذات میں دھیرے دھیرے سے اس تبدیلی کا ہونا تو خود بوبی نے بھی محسوس کیا تھا اور وہ اس تبدیلی کی وجہ بھی بخوبی جانتا تھا مگر پھر بھی وہ جانی کے منہ سے اعتراف سننا چاہتا تھا جبھی الماری میں ہینگ شدہ کپڑوں کے سامنے کھڑے جانی کے کمرے میں دبے پاؤں پہنچ کر اس کا کندھا شرارتی سی مسکراہٹ کے ساتھ تھپتھپایا تو وہ جو باہر جانے کے لیے کپڑوں کے انتخاب میں گم تھا' ایک دم چونک گیا اور اس کے اسی ردعمل کا بوبی نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

''اوہو' اتنا گم کس سوچ میں تھا کہ ہاتھ لگانے سے اُچھل پڑا؟''

''ارے نہیں یار' تجھے تو بس موقع چاہیے ہوتا ہے۔'' ہینگرز میں لٹکے ہوئے کپڑوں میں سے اس نے وائٹ ٹی شرٹ اور ڈارک بلیو جینز نکال کر الماری بند کر دی اور بڑی کامیابی سے چہرے پر ابھرتے تاثرات کو اس خیال سے چھپایا تھا کہ بوبی کو کچھ بھی علم ہو گیا تو وہ بس دن رات اسے چھیڑتا ہی رہے گا۔

''خیر تو ہے ناں' یہ تیار ہو کر آج تُو جا کہاں رہا ہے؟''

''تجھے جانے پر اعتراض ہے یا تیار ہونے پر؟'' ادھر اُدھر کی کرنے کے بجائے جانی نے بھی اب براہ راست بات کرنے کا سوچا تھا۔

''نہ جانے پر نہ تیار ہونے پر' مجھے تو تیرے چھپانے پر اعتراض ہے۔'' بوبی نے آنکھ مارتے ہوئے مسکرا کر کہا مگر جانی بھی اس وقت ڈھیٹ بننے کے مکمل موڈ میں تھا سو دونوں ہینگرز بیڈ پر رکھے اور اس کے

سامنے جا کھڑا ہوا۔

''مثلاً کیا چھپانے پر؟''

''وہی جو خوشبو کی طرح چھپتا ہی نہیں۔''

''او چل بک نہ یار.....'' یہ جان کر کہ بوبی کو اندازہ ہو گیا ہے وہ جھینپ سا گیا تھا۔

''ہاں تو چھپا کیوں رہا ہے؟ سیدھی طرح بتا دے کہاں جا رہا ہے۔ قسم لے لے' میں نہیں جاؤں گا تیرے ساتھ' کباب میں ہڈی بننے کے لیے۔'' بوبی نے غیر مشروط آفر بھی کر ڈالی تھی مگر جانی اتنی آسانی سے اُگلنے کے موڈ میں نہیں تھا جبھی مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں گھس گیا۔

''نہیں بتا رہا ناں بچو' یاد رکھنا مجھے پتا چل گیا ناں جب تُو دیکھنا تیرا کیا حال کروں گا۔'' کوئی جواب نہ آنے پر بوبی نے اس کی ڈھٹائی پر دل ہی دل میں سلام پیش کیا اور باہر نکل گیا یوں بھی آج کل دونوں ہی فارغ تھے جس کی پہلی وجہ تو شہر کی سخت سیکورٹی اور دوسری فی الحال وافر مقدار میں راشن پانی کا موجود ہونا تھا۔ اسی لیے جانی نہا دھو کر اب دل بے قرار کے سکون کے لیے ایک بار پھر وہیں جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جہاں وہ اپنے چین و قرار سب کھو آیا تھا۔

اے میرے دل کے چین
چین آئے میرے دل کو
دعا کیجیے.....

دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے پہلی دفعہ یوں دل لگا کر تیار ہونے کے بعد اچھی طرح پرفیوم کا اسپرے کر کے وہ سیدھا آنٹی کے پاس جا پہنچا تھا اور بلا تمہید چندا سے ملنے کا ارادہ ظاہر کر دیا وہ سنگ مرمر کے تخت پر ستار سنبھالے مالکونس درباری اور پٹ دیپ کا ریاض کر رہی تھیں۔ یوں بلا جھجک اس کی فرمائش پر انہوں نے ستار پر سے انگلیاں ہٹا کر اسے ایک طرف رکھا اور اپنی سنہری زنجیر والی عینک کے اوپری حصے سے دیکھتے ہوئے حیرت سے بولیں۔

''چندا سے ملنا چاہتے ہو مگر اس وقت؟''

''جی ہاں' اس وقت۔'' انداز بالکل حتمی تھا۔

''میاں شاید تم جانتے نہیں ہو کہ اس مکان میں راتیں جاگتی ہیں اور ابھی تو سورج مکمل طور پر ڈھلا بھی نہیں۔'' کچھ دیر پہلے ہی چندا جاگی ہے اسے تیار ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا ناں۔'' اس وقت وہ مکمل طور پر ایک گھریلو خاتون کے حلیے میں تھیں' میک اپ اور ساڑھی کے ریشمی پلوؤں کے بجائے بریزے کی ہلکی سبز شلوار قمیص پر جوڑا بنائے آج ان میں ایک گریس فل خاتون کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

''اور ویسے بھی آج تو چندا کی منہ دکھائی ہے ناں' پہلی مرتبہ کسی کے سامنے پیش کر رہی ہوں اسے۔''

ان کی بالی کو انگلی سے جھلاتے ہوئے آنٹی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی ہے میں انتظار کرلوں گا لیکن یاد رکھنا آنٹی پیسوں کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔'' کھلے دروازے سے برآمدے کے موزیک پر نظر گاڑھتے ہوئے اس نے کہا تو آنٹی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھرتی محسوس ہوئی۔ جبھی انہوں نے کارپٹ پر چادر ڈال کر بیٹھے ''بندو'' کو دیکھا جو دنیا سے بے نیاز سوئی دھاگے کی مدد سے موتیے اور گلاب کے پھول ہار کی صورت میں ایک تناسب کے ساتھ پروتا جارہا تھا۔

''آہم.....'' انہوں نے گلا صاف کرنے کے بہانے بندو کو پکارا اور اس کے دیکھنے پر بغیر لب ہلائے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور لمحہ بھر میں وہاں سے غائب بھی ہوگیا۔

''بوبی کے ساتھ کب سے ہو؟'' آنٹی نے بھی اسی کا انداز اپناتے ہوئے سیدھا اور دوٹوک انداز اپنایا تھا جبکہ جانی اس کے منہ سے بوبی کا نام سن کر حیران رہ گیا تھا۔ آنٹی گول میز پر سامنے ہی موجود سروتے کی مدد سے تھوڑی سی چھالیہ توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے اس کا یوں حیران ہوتا دیکھ نہیں پائی تھیں۔

''ہم دونوں بہت گہرے دوست ہیں اور ایک ساتھ ہی رہتے ہیں۔'' وہ آنٹی کے ساتھ کوئی لمبا چوڑا تعارف یا بے تکلفانہ گفتگو نہیں چاہتا تھا اس لیے اپنی دانست میں ایک ہی دفعہ تفصیلی جواب دے کر جان چھڑاتے ہوئے انہی دبیز سلکی پردوں کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے متوقع طور پر چندا کو آنا تھا لیکن اس وقت وہ سخت کوفت سے دوچار ہوگیا جب انہی پردوں کے عقب سے بندو ہاتھ میں چائے کی ٹرے لے کر ظاہر ہوا اور ان کی طرف بڑھنے لگا۔

''اور کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا مجھے؟'' بندو کے ہاتھ سے سبز چائے کا کپ بددلی سے تھامتے ہوئے اس نے پوچھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ابھی لین دین طے کرنے میں بھی بہت وقت لگ جائے گا لیکن اس وقت جانی کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آنٹی منہ میں چھالیہ گھماتے ہوئے بے فکری سے بولیں۔

''ارے میاں دیر کس بات کی' ابھی تو سورج چھپا ہے مگر رات تو پوری باقی ہے ناں' ایسی بھی کیا جلدی؟'' آنٹی کے یوں کہنے پر فوری طور پر اس سے کچھ بولا نہیں گیا تھا جبھی کھسیا کر چائے کا پہلا گھونٹ لینے کے لیے کپ کو ہونٹوں کے قریب لے گیا کہ جانتا تھا آنٹی کی بات کے پیچھے کیا مفہوم پنہاں ہے۔

''اور ویسے بھی تمہارے سب معاملات تو بوبی پہلے ہی طے کرکے جاچکا ہے اس لیے تم بے فکری سے چائے کی چسکیاں لو۔'' منہ میں چھالیہ گھماتے ہوئے وہ بولیں تو جانی ایک دم ہکا بکا انہیں دیکھنے لگا۔

وہ تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ بوبی اس کے اندر پنپتی اس خواہش کو جان سکتا ہے اور پھر اگر وہ جان ہی گیا تو اسے بغیر بتائے جانے کب وہ یہاں آیا اور یقیناً آنٹی کو منہ مانگی رقم ادا کرکے ایڈوانس بکنگ بھی کرگیا کہ جب بھی وہ آئے اسے آنٹی کی طرف سے کسی بھی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا

پڑے' احسان مند تو یقیناً پہلے بھی وہ تھا مگر اب ایک بار پھر بوبی کا مزید شکر گزار ہو گیا تھا اور آنٹی جو بار بار اس پر چندا کی منہ دکھائی کا ہونا جتا رہی تھیں' جانے کتنے میں رضا مند ہوئی ہوں گی۔

ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑے وہ اب تک اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ آنٹی کی آواز ابھری۔

''جس طرح سخت سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہوئے پانی کا پہلا مگ انسان کو بوکھلا دیتا ہے' چوری چکاری کرنے والوں کے پہلی دفعہ چوری کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہوتے ہیں ناں' یہی کچھ یہاں بھی ہوتا ہے.....'' جانی' آنٹی کی باتیں یوں دھیان سے سن رہا تھا جیسے امتحان ہال میں پرچہ حل کرنے سے پہلے ہدایات دی جا رہی ہوں۔

یہاں آنے جانے والے تو اس کے بارے میں جانتے ہیں مگر تم یوں سمجھو جیسے تم یہاں نئے ہو ویسے ہی چند سال پہلے یہ بھی ہمارے پاس آئی' اس لیے اگر کچھ خلافِ توقع مزاحمت کا سامنا ہو تو اگلی دفعہ میں تمہیں اپنی پسند کا آئٹم دوں گی..... سمجھے ناں؟''

چمکیلی کٹاری سی آنکھ مارتے ہوئے ہنسی کے دوران آنٹی نے بڑی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر ہلکا سا دبایا تھا اور تب ہی جانی کو ایک عجیب سی کراہت محسوس ہوئی تھی اس عورت سے' جو احساس گناہ کے باوجود اسے لذتِ گناہ کی ترغیب دیتے ہوئے ہر طرح سے اپنی بات کو دو آتشہ بنانے پر لگی تھی اور تبھی جانی کی آنکھوں کے سامنے ناجی اور آنٹی کا چہرہ گڈمڈ ہونے لگا۔ کبھی ناجی آنٹی کے گیٹ اپ میں نظر آتی تو کبھی آنٹی ناجی کے حلیے میں پینو کو سونف پھانکنے اور سرخی لگانے کا مشورہ دیتی۔ ناجی اور سامنے بیٹھ کر جانی کو یہ نہیں اور نہیں کا اشتہار دکھاتی آنٹی میں اسے ایک پیسے کا فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔

''بندو..... او بندو ماسٹر!''

جانی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر آنٹی نے بندو کو پکارا تو ایک بار پھر دبلا پتلا' لمبا' سانولا سا بندو کسی مجسمے کی طرح مؤدب انداز میں انہی پردوں کے پیچھے سے آن حاضر ہوا۔

''چندا تیار ہے تو انہیں کمرے تک چھوڑ آؤ۔''

''جی بہتر..... آیئے۔'' بڑے ادب کے ساتھ بندو نے آنٹی کو مختصراً جواب دے کر جانی کو اپنے پیچھے آنے کا کہا تو یکایک اسے محسوس ہوا کہ شاید اس کے ہاتھ میں پرومیتھیوس کی آگ آ گئی ہے۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہیں کھڑے کھڑے ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتائے کہ دیکھو پیسے میں کتنی طاقت ہے' اس نے جو چاہا سو پا لیا ہے۔

چند لمحوں پہلے ذہن و دل پر چھائی تلخی کہیں دور جا چھپی تھی اور خوشی کی انتہا تو یہ تھی کہ وہ آنٹی کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی دیا۔ جواباً وہ اس سے بھی گہری مسکراہٹ سے اسے الوداع کہنے کے بعد ایک بار پھر اب ستار کے بجائے تان پورے کے سُروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی تیاری کرنے لگیں کہ آج رات آنے

ا لے مہمانوں کی طرف سے پچھلی دفعہ ہی بلمپت اور دُرت کے سُروں پر رقص کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔
ہائے کا کپ سامنے گول میز پر رکھنے کے بعد بندو کی رہنمائی میں اس ہال نما وسیع کمرے سے نکلتے ہوئے
الی دبیز پردوں میں گم ہونے سے پہلے بوبی ان پھولوں کے پاس سے گزرا جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی بڑی
ہت اور احتیاط کے ساتھ ایک ایک کر کے دھاگے میں پروئے جا رہے تھے اور کچھ دیر تک اپنا آب و تاب
لھانے اور خوشبو بکھیرنے کے بعد جنہیں یقینی طور پر تماشائیوں کے ساتھ ساتھ رقاصاؤں کے پیروں تلے
لے جانے کے بعد آخر کار گندگی کے ڈھیر کی یوں زینت بن جانا تھا کہ ان کی اپنی شناخت وجود اور حیثیت
تم ہو کر صرف اور صرف گندگی رہ جاتی اور یہی حال یہاں کے مکینوں کا بھی تھا۔

ہر پھول کی قسمت میں کہاں بزم عروسی
کچھ پھول تو کھلتے ہی مزاروں کے لیے ہیں

ریشمی پردوں کو عبور کرنے کے بعد ایک طویل مگر کشادہ راہداری کے سب سے آخری کمرے کے سامنے آ کر بندو رک گیا تھا۔

''صاحب یہ کمرا بے بی کا ہے اور آپ صبح تک یہاں قیام کر سکتے ہیں' البتہ یہ کوئی لازمی نہیں ہے آپ چاہیں تو کسی بھی وقت واپس جا سکتے ہیں۔ ویسے وقت سے پہلے واپس جاتا کوئی دیکھا نہیں آج تک۔''
سنجیدگی سے بات کی شروعات کرتے ہوئے بندو لہجے سے ٹپکتی ہوس کی پوٹلی کو زیادہ دیر تک مخفی نہیں رکھ پایا تھا۔ جانی نے جواباً خاموشی اختیار کرتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ بات بدل گیا۔

''پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ باورچی خانے میں نان' کلچے' سندھی پراٹھے' خمیری اور فطیری روٹیوں کے ساتھ مختلف طرح کے پکوان رات کے مہمانوں کے لیے تیار ہوتے ہیں اگر کسی بھی چیز کی طلب ہو تو فرما دیجیے۔''

''کچھ نہیں چاہیے بندو! بس تم چلے جاؤ اب یہاں سے۔'' جانی کا لہجہ ہنوز کھردرا تھا۔

''یعنی تخلیہ.....؟'' آنٹی کے سامنے مجسمہ بنا بندو بھی گنوں کا پورا تھا لیکن جانی کی طرف سے متوقع ردعمل سامنے نہ آنے پر تھوڑی بہت سن گن تو اسے بھی مل گئی تھی کہ یہ بندہ عام گاہکوں جیسا تماش بین نہیں ہے جبھی ترنت واپس پلٹ گیا کہ جانی کے تیور اسے کچھ اچھے معلوم نہیں ہو رہے تھے اور اس کے جاتے ہی جانی نے بغیر دستک دیئے اس تیسری دنیا میں قدم رکھ دیا جہاں صرف دولت کام آتی ہے' جہاں ذہنی سکون اور کامیابی کا رستہ نہ شرافت نجابت سے کھلتا ہے نہ میرٹ سے۔ بس ہتھیلی گرم کرنے پر ہی کھل جا سم سم کا اثر یوں ہوتا ہے کہ ہر چیز قدموں تلے بچھی چلی جاتی ہے اور ہر انسان سینڈریلا کے بارہ بجنے تک جیسے اس وقت تک اس دنیا کا شہزادہ بن کر لاڈ اٹھواتا ہے جب تک اس کی ادا کی گئی رقم مکمل نہ ہو جاتی اور جانی کے لیے بوبی کی طرف سے ادا کی گئی رقم کے مطابق آج طلوعِ صبح تک کے لیے چندا اس کی دسترس میں اور

اس کا ہر حکم ماننے کی پابند تھی۔

افلاس نے بچوں کو بھی تہذیب سکھادی
سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے

پینو کسی طور ناجی کو گھر تک لے آئی تھی اور اب وہ صحن کے بیچوں بیچ اکڑوں بیٹھے دونوں بازوؤں کو ٹانگوں کے گرد لپیٹے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔ گڈی اور رانی ایک کونے میں دیوار سے چپکی ہوئی چپ چاپ اپنی ہی ماں سے وحشت زدہ ہوکر خوف محسوس کررہی تھیں اور جب تک ناجی جاگتی رہتی وہ یونہی کونے میں دبکی رہتیں' پینو غسل خانے کی بوسیدہ دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر ناجی کو دیکھ رہی تھی اور سوچ میں تھی کہ جب وہ اپنے ہوش وحواس میں تھی تب بھی گڈی اور رانی اس سے خوف زدہ رہا کرتی تھیں اور اب جب وہ اپنے حواسوں میں نہیں تب بھی وہ دونوں اس سے دہشت زدہ تھیں کہ اسی طرح اکڑوں بیٹھے بیٹھے جب ناجی دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر یہاں سے وہاں کچھ ڈھونڈنے کے انداز میں بڑھتی تو وہ دونوں نہایت خوفزدہ ہوکر دیوار کے ساتھ مزید چپکتی جاتیں۔ یونہی بلا مقصد اِدھر اُدھر دیکھتے دیکھتے ٹین کے ڈبے سے سہارا لے کر ناجی بیٹھی تو نیند نے آلیا یوں بھی وہ ہر ممکن طریقے سے خود کو جگائے رکھتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے ہی وہ سوئے گی لوگ اسے مُردہ جان کر گہری اندھیری اور وحشت سے بھرپور قبر کے حوالے کر آئیں گے۔ اسی لیے تو وہ آنکھوں کو ہر ممکنہ حد تک پھیلائے رکھتی کہ یہ بند نہ ہونے پائیں مگر نیند کو آخر کب تک ٹالا جاسکتا ہے یوں بھی نیند ہی تو ایسی چیز ہے جو بھوکے پیٹ میں بھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

چارپائی پر لیٹنا تو درکنار اب تو وہ بیٹھنے سے بھی گریزاں تھی کہ اسے سانپوں کے ڈنک باقاعدہ اپنے جسم پر نظر آنے لگتے۔ دیواروں سے ٹیک تو کیا وہ ان کے قریب بھی نہ جاتی تھی کہ کہیں سب دیواریں اسے اپنے اندر جکڑ نہ ڈالیں اور اس کے سوجانے پر پینو نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ بیٹھے بیٹھے کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر سو تو گئی' جبھی رانی اور گڈی دبے پاؤں اٹھیں اور پینو کے دائیں بائیں بیٹھ کر ہمیشہ کی طرح خود کو محفوظ خیال کرنے لگیں۔

''کیا سوچ رہی ہے رانی؟'' پینو نے محض ان دونوں کو ذہنی طور پر ذرا ہلکا پھلکا کرنے کے ارادے سے بات شروع کی۔

''سوچ تو نہیں رہی' بس دعا مانگ رہی تھی۔'' اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا تو پینو کو اس پر بے حد پیار آ گیا' صرف یہ سوچ کر ہی کہ وہ ناجی کی صحت کے لیے دعا مانگ رہی ہے۔ خوراک کی کمی کے باعث پچکے ہوئے گالوں پر پینو نے بے اختیار ہوکر بوسے لے ڈالے اور

اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا اور دونوں ہاتھ گڈی کے بالوں میں پھیرنے لگی جو بھوک سے بے حال ہونے کے باعث بیٹھے رہنے سے بھی قاصر تھی جبھی ایک ہاتھ سے اس نے پینو کی ٹانگ سیدھی کی اور اس پر سر رکھ کر لیٹ تو گئی مگر کھانے کو پھر بھی کچھ نہ مانگا۔

''کیا دعا مانگی تُو نے؟'' اسے خود سے الگ کر کے پینو نے پوچھا' اس کا خیال تھا کہ وہ جب ناجی کی صحت اور زندگی کے متعلق مانگی جانے والی دعا کے بارے میں بتائے گی تو وہ گڈی کو بھی ماں کے لیے دعا مانگنے کو کہے گی۔

''میں نے دعا مانگی ہے کہ ہماری بستی میں بہت بڑا خودکش دھماکہ ہو جائے اور اس میں اماں بھی مر جائے اور میں بھی.....'' پینو اس کی دعا کے الفاظ سن کر سکتے میں آ گئی تھی۔

''پھر سرکار سب مرنے والوں کے وارثوں کو پیسے دے گی ناں تو جو پیسے میرے اور اماں کے مرنے پر ملیں گے وہ لے کر تم دونوں کہیں دور چلی جانا' جہاں کوئی دھماکہ نہ ہو' پھر تم مس جی بن جانا اور روز شام کو جیسے مسجد کے مولوی جی کھانا سامنے رکھ کر مرنے والوں کو بھیجتے ہیں ناں' تم لوگ بھی ہمارے لیے ٹھنڈا پانی' تندور کی روٹی اور بوٹیاں بھیج دینا۔''

''رانی.....'' بمشکل پینو کے منہ سے نکلا۔

''اچھا چلو بوٹیاں نہیں مسور کی دال بھیج دینا بس۔ لیکن کچھ بھیجنا ضرور' قسم سے اب بھوک نہیں برداشت ہوتی مجھ سے۔'' رانی نے منہ بسورا تو پینو کا تو جیسے کلیجہ منہ کو آنے لگا' چت لیٹی گڈی نے بھی کروٹ لی' چہرے کے تاثرات انتہائی غصیلے تھے۔

''تجھے پتا بھی ہے کیا کہہ رہی ہے اور تُو نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا؟'' پینو نے گہری سانس کے ذریعے آنسو روک کر گڈی کی طرف دیکھا' خیال تھا کہ شاید اس کے دل میں ابھی ماں کے لیے پیار موجود ہے لیکن اس خوش فہمی کا دورانیہ لمحہ بھر سے زیادہ ہرگز نہیں تھا۔

''اگر تُو مر گئی تو میرے ساتھ کھیلے گا کون؟ اتنے پیسے نہیں لینے ہمیں' تُو صرف اماں کو مرنے دے دھماکے میں بس ہم تینوں کے لیے اتنے ہی پیسے ٹھیک ہیں۔ ویسے بھی اماں تو اب کسی کام کی بھی نہیں رہی ناں۔'' گڈی نے تائید حاصل کرنے کے لیے پینو کی طرف دیکھا جس کا دھواں دھواں چہرہ عجیب سوگواریت بیان کر رہا تھا مگر دکھ کیا تھا اور وہ یوں بیٹھے بیٹھے کیوں اس قدر غمزدہ دکھائی دینے لگی ہے' اس بات سے وہ دونوں ہی لاعلم تھیں اور بے خبر تو خود پینو بھی اب تک رہی تھی' ان دونوں کے سیل بند دل کے اندر سے یہ سب الفاظ اسے قے کی مانند باہر نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔

پہلے آج تک تو تفکرات' گمان وسوسے سب گونگے تھے مگر اب جو زبان نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کی تھیں تو سب کچھ جیسے اتھل پتھل سا ہو گیا تھا اور معاملہ برخاک مالیدن کا سا ہو چلا تھا۔

پینو کی سماعت اور رانی اور گڈی کی گویائی لنکا کوٹھ ٹاپو بنے ہوئے تھے' گڈی اور رانی اس کی خاموشی پر یوں خوفزدہ ہوگئی تھیں جیسے طوفان آنے سے پہلے ہواؤں کی چاپ سن لی ہو۔ پینو ان دونوں کو سمجھانا چاہتی تھی کہ ہوش وحواس سے بے گانہ ہی سہی لیکن ناجی کا یہ بچا کھچا وجود بھی ان کے لیے اس معاشرے میں کس قدر اہم ہے جیسے غسل خانے کے دروازے کی جگہ لٹکایا جانے والا دوپٹہ جو اَب نہایت خستہ حالت میں تھا لیکن اسے بھی نیچے گرا کر اس کے ایک کونے پر اینٹ رکھ دی جاتی تو سب خود بخود جان جاتے کہ اندر کوئی ہے اور تب نہ تو کوئی آگے بڑھ کر منہ اٹھائے اندر داخل ہوتا اور نہ ہی آواز لگاتا۔ بس یہی آسرا اور سہارا اب ناجی کی صورت میں ان تینوں کے پاس بھی تھا۔

پینو نے بڑی دلدوز نظروں سے اب تک پاؤں پر بوجھ ڈال کر سرٹین کے ڈبے سے ٹکائی دنیا و مافیہا سے بے خبر اس عورت کو دیکھا جو اس کی ماں تھی اور اس ابتر حالت میں اسی ایک لمحے کے زیر اثر تھی جس نے محض چند ہی ساعتوں میں اس کا منطقہ البروج ہلا کر رکھ دیا تھا جسے ربّ نے تو عرشی سیڑھی پر اعلیٰ ترین مقام سے نوازتے ہوئے ماں کا درجہ دیا مگر اپنی ہی کرنی کے باعث وہ معاشرے تو دور کی بات اولاد ہی کی نظروں میں یوں گندے نالے میں جا گری تھی کہ وہی بیٹیاں جنہیں وہ مس جی بنانے کی خواہش میں پینو کا دام لگائے چوک چوراہے پر کھڑی تھی وہی اب پینو کی پناہ لیے اس کے مرجانے کی دعا کر رہی تھیں۔

ٹکر ٹکر پینو کو دیکھتی گڈی اور رانی سے پینو کی نظریں ملیں تو جذبات سے مغلوب ہو کر ان دونوں کو بازوؤں میں بھینچتے ہوئے پینو نے بہت زور سے آنکھیں بند کر لیں۔

❀---❀---❀

کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی سامنے بیڈ پر گیشا گرل کی طرح بیٹھی چندا کو دیکھ کر جانی کیا کوئی اور بھی ہوتا تو دم بخود رہ جاتا۔ سائیڈ ٹیبل پر موجود سانچی کے پان' موتیا کے گجرے' بیڈ کے بالکل سامنے موجود قد آدم آرائشی آئینے کے ذریعے جانی کی آنکھوں تک پہنچے۔

کمرہ بے شک اتنا کشادہ نہ تھا لیکن پھر بھی ایک ایک چیز اپنی جگہ یوں سلیقے سے موجود تھی کہ لگتا یہ چیزیں کمرے کے لیے نہیں خریدی گئیں بلکہ کمرا ان چیزوں کو ہی رکھنے کے لیے وجود میں آیا ہے' قطعی نظر اس کے کہ یہ ایک پرانا تعمیر شدہ کمرا اور آرائش کی چیزیں نئی تھیں۔ جانی ٹھہر ٹھہر کر چلتا اس سے پہلے کہ آگے بڑھتا' کچھ یاد آنے پر ایک مرتبہ پھر واپس پلٹا' کمرے کے دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور موڑھا گھسیٹ کر بیڈ پر بیٹھی چندا کے عین سامنے رکھنے کے بعد گھٹنے جوڑے اس کے سامنے ٹک گیا۔

چنبیلی کی کلیوں سے ملائم رنگ میں اس وقت زرد رنگ ہی نمایاں محسوس ہو رہا تھا' قیدیوں سی خوف زدہ چندا کے بستر پر یقیناً کوئی تیز خوشبو چھڑکی گئی تھی جس کی وجہ سے جانی کو اپنے ملبوس پر لگائی گئی ہلکی فرانسیسی خوشبو بے وقعت اور غیر محسوس لگنے لگی تھی۔ سفید ٹی شرٹ جسے خاص طور پر اوپر لکھی عبارت کی وجہ سے ہی

پہننے کے لیے منتخب کیا گیا تھا چندا کی لمبی پلکوں کے اٹھنے کی منتظر تھی کہ وہ اسے دیکھے اور بن کہے ہی سارا پیغام سمجھ جائے مگر وہ تو جیسے چپ چاپ اپنی ادھ کھلی خوابیدہ آنکھوں کو یوں جھکائے بیٹھی تھی جیسے اس وقت وہ اپنے کسی پیرومرشد کے پاس موجود ہو۔

اس رات ہوا قدرے ٹھہر ٹھہر کر مگر بھرپور انداز میں یوں چلتی کہ کھلی کھڑکی کے آگے موجود پردے بھی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ بن پاتے اور وہ سیدھے چندا کے دوپٹے کو یوں چھیڑتی ہوئی کمرے میں بکھرتی کہ کلاسیکی تصویروں میں پینٹ کی گئی لڑکیوں کی طرح اس کی ڈھاکہ کی ململ سی پتلی کمر سمیت جسم کے تمام خطوط واضح ہونے لگتے۔ کپڑے اس قدر چست تھے کہ خود جانی کو نظریں جھکانی پڑیں۔

جس طرح انگریز حکمران دیانت داری کو اپنی پالیسی کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں بالکل اسی طرح ان گلیوں میں ملاقاتیوں کے سامنے آنے کے لیے بھی چست اور باریک کپڑوں کو شاید پالیسی کے طور پر ہی اپنایا گیا تھا۔ اس پر یوں نظریں جھکائے چہرے پر موت کا سا سناٹا طاری کیے چندا..... جانی کو لگ رہا تھا جیسے کسی نازک اندام پری کو شیشے کے جار میں بند کر کے اس کے سامنے بٹھا دیا گیا ہو اور اسے اس پر مکمل دسترس بھی دی گئی ہو مگر اس سے پہلے کہ دل میں کروٹ لیتی انوکھی خواہشات اسے اپنا احساس دلاتیں جانی نے بڑی خوب صورتی سے نفس کے ننھے سے پودے پر خواہشات کے رنگ میں پھولوں کو تکریم اور پاکیزگی کی شبنم سے ڈھانپ لیا۔

''اگر باتھ روم آپ کے کمرے کے ساتھ ہے تو مہربانی کر کے اپنے کپڑے بدل لیں اور اپنی پسند کے کوئی مناسب سے کپڑے پہن آئیں۔''

جانی کی بات پر پہلی مرتبہ چندا نے پلکیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا' معصومیت تو تھی ہی مگر آنٹی نے جس انداز میں اسے تیار کیا تھا وہ اس کے حسن کو کہیں زیادہ دو آتشہ کیے دے رہی تھی اس پر خوابیدہ آنکھوں میں سانس لیتی حیرت' جانی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بس اسے یونہی دیکھ دیکھ کر اپنی روح کو سیراب کرتا رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ تو رہے تھے مگر دونوں ہی کی نظروں میں جذبات کے ذخیرے مکمل طور پر متضاد تھے' چندا کی آنکھوں میں خوف جبکہ جانی کی نگاہوں میں محبت تھی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ کپڑے یہاں موجود دوسری لڑکیوں کے لیے تو شاید مناسب ہوں لیکن آپ کے لیے بالکل بھی موزوں نہیں ہیں۔ آپ بس کوئی دوسرا ڈریس پہن آئیں جو آپ کو پسند ہو۔'' وہ اسے سمجھانا اور بتانا چاہ رہا تھا کہ ایسے کپڑے شریف لڑکیاں نہیں پہنا کرتیں اور وہ اسے یہاں پر موجود دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں سمجھتا بلکہ اسے تو وہ سحر القلوب کا وہ تعویذ سمجھتا ہے جسے ہر کوئی اپنے سینے کے ساتھ لگا کر رکھنا چاہتا ہے' کالی ڈوری کے ساتھ گرہ لگائے تاکہ اگر کبھی کسی کی نظر پڑ بھی جائے تو وہ منظر حسد یا رشک کے

آئینے سے منعکس ہو کر نظر بد اسے چھو بھی نہ پائے لیکن کیا کرتا لفاظی اس کے بس کی بات نہیں تھی سو سیدھا سادا جو ذہن میں آیا کہہ دیا اور چندا جو پہلے ہی تمام خدشات کے برعکس اس کے یوں محتاط ہونے پر حیران تھی مزید حیرت زدہ ہوتی لیکن قابل اطمینان بات یہ تھی کہ جانی کا انداز چندا کے ذہن پر چھائے خوف کے بادل ہٹانے میں غیر محسوس طریقے سے اثر انداز ہو رہا تھا۔

چندا آہستگی سے اٹھی اور دیوار میں نصب پیپل کی لکڑی کی بنی چھت کو چھوتی الماری کا پٹ کھول کر سامنے ہی ہینگر میں موجود کپڑے لیے اور باتھ روم میں جا گھسی۔

جانی وہیں پر اسی انداز میں بیٹھا اس کے ایک ایک نقش کو ذہن میں مسلسل دہرائے جا رہا تھا کہ ایک بار پھر باتھ روم کا دروازہ کھلا' بے اختیار جانی نے گردن موڑی تو جیسے حیرت سے دنگ رہ گیا' لمحہ بھر کو تو اسے لگا کہ باتھ روم میں داخل ہونے والی لڑکی کوئی اور مگر باہر آنے والی لڑکی کوئی اور ہے۔

کچھ دیر پہلے پہنے ہوئے ہیجان انگیز کپڑوں کے بجائے اب وہ کاٹن کے شلوار قمیص میں اسی ڈیزائن کا دوپٹہ لیے کس قدر باعزت لگ رہی تھی۔

اس کے برعکس جس حلیے میں وہ اب جانی کے سامنے موجود تھی' شیطانی اذہان کے علاوہ جو بھی دیکھتا بے اختیار نظریں جھکا کر عزت کرنے پر مجبور ہو جاتا اور پھر جانی نے تو کپڑے بدلنے کا کہا تھا مگر وہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھتے ہوئے چہرہ بھی دھو آئی تھی اور اب فجر کے وقت کھلتی چنبیلی کی طرح تر و تازہ معلوم ہو رہی تھی۔

''معاف کیجیے گا آپ نے ہی کہا تھا ناں کہ جو مجھے پسند ہو.....تو میں اس لیے.....'' وہ جانتی تھی کہ یہاں آنے والوں کی توقعات ان سے کئی طرح کی ہوتی ہیں اسی لیے جانی کو ششدر دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی کہ یقیناً اس سے یہ سب غلط ہوا ہے اور اس کی شخصیت کا سحر خود اس کی آواز سے ہی ٹوٹا تو جانی جیسے اپنے حواسوں میں آ گیا۔

''ارے نہیں نہیں' معافی کیوں بلکہ میں نے خود تمہیں یہ سب کرنے کو کہا تھا۔'' کپڑے کیا بدلے گئے تھے اس کی حیثیت بھی شاید اب بدلی گئی تھی۔ آپ سے تم تک کا فاصلہ بھی اسی لمحے طے ہوا کہ اب چندا اسے اپنی ہی دنیا کی باسی لگنے لگی تھی' اپنوں کی طرح دل کے بہت قریب۔

''اور تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟ ادھر آؤ ناں' یہاں بیٹھو مل کے باتیں کرتے ہیں۔'' اتنا دوستانہ لہجہ اور وہ بھی اس کے ساتھ؟ یہ کیسا مرد ہے بھلا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک بے انتہا خوفزدہ تھی اب جانی کے دوستانہ روّیے پر الجھن کا شکار تھی۔ وہ تمام داستانیں جو وہ یہاں موجود دوسری لڑکیوں سے سن چکی تھی اور جو ساری باتیں آنٹی اسے سمجھا کر اپنے تئیں روپے دگنا کرنے کی مشین بنا گئی تھیں جانی کے رویے سے تو ہر ایک بات کی نفی ہوئی تھی بلکہ اسے تو لگتا تھا جیسے کسی پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی : اور وہ اب مل بیٹھ کر وہ

ب کچھ بیان کرنا چاہتا ہو جو اس کی غیر موجودگی میں بیتا۔

''میرا نام جانی ہے اور میں صرف تمہاری خاطر تم سے ملنے اور صرف باتیں کرنے کے لیے یہاں تک آیا ہوں' مجھے پیشہ ور یا باقاعدہ تماش بین نہ سمجھ لینا۔'' چندا صوفے پر بیٹھی تو سورج مکھی کی طرح مکمل رخ موڑتے ہوئے جانی نے اپنا تعارف کروایا اور مختصراً اپنے بارے میں بتایا۔

''کیا تم بھی اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟ میرا مطلب ہے تمہارا کوئی رشتے دار وغیرہ؟'' جانی کی باتیں اس کا انداز اور اس کے لہجے سے چاروں طرف بکھرتی محبت اور سچائی کی نرم پھوار' چندا کے دل میں جگہ بناتا اس کا اعتبار بغیر کسی رکاوٹ کے یقین کی راہداریوں سے ہوتا وثوق کے ایوان میں داخل ہو گیا تھا۔

کھلی کھڑکی سے اندر داخل ہوتی اوائل شب کی ٹھنڈک اور فضا میں جگنوؤں کی جلتی بجھتی بارات میں ایک دوسرے کے قریب آنے کے کئی ڈھکے چھپے اشارے تھے لیکن تنہائی اور قدرت ہونے کے باوجود احترام کی دیوار کو دونوں اطراف سے بڑے پُر وقار انداز میں بلند رکھا گیا۔

''ہم جیسی لڑکیوں کے رشتے دار نہیں گاہک ہوتے ہیں اور ہمارا مکان گھر نہیں کوٹھا کہلایا جاتا ہے' اس لیے مجھ سے اس طرح کا کوئی بھی سوال بے کار ہے۔'' اس کی سوئی سوئی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے چارگی تھی' سومناتھ کا مندر کھودنے والے پجاریوں جیسی۔

''ہماری قسمت تاش کے پتوں کی طرح بھانت بھانت کے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور سبھی لوگ ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو کوئی بھی جواری ان پتوں کے ساتھ کرتا ہے کہ جب تک ان کی مرضی کا نتیجہ دیتے رہیں وہ سینے سے لگا کر آنکھوں سے چومتے ہیں اور دوسری صورت میں..... ہونہہ.....!'' بے بسی کے عالم میں اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا تھا اور وہ آنسو جو اس کی اداس آنکھوں سے نکل بھی نہیں پائے تھے جانی نے اپنے دل پر گرتے محسوس کیے۔

''ہر بندہ ایک جیسا تو نہیں ہوتا ناں' تم مجھ پر اعتبار تو کر کے دیکھو۔''

پہلی پہلی محبت کے زیر اثر چندا کو خوش دیکھنے اور خوش کرنے کی آرزو اس کے ہر دوسرے جذبے پر مکمل حاوی ہو چکی تھی یوں بھی اس عمر کی محبت میں انسان خود کو سپر مین گردانتے ہوئے سب کچھ کر گزرنے اور اپنی محبت کو حاصل کر لینے کے لیے اتنا ہی پُرعزم اور ثابت قدم ہوتا ہے جتنا شاید سکندرِ اعظم اپنی فتوحات کے سفر میں ہوتا ہوگا۔

''کب تک..... ایک دن' دو دن' ہفتہ..... مہینہ اور پھر.....؟'' چندا کی رت جگوں سی آنکھوں میں ان گنت سوال تھے۔

''یہ بات تو آپ کو آنٹی نے بھی بتائی ہوگی کہ پروفیشنل لائف میں آج میرا پہلا قدم تھا' یہ میری خوش نصیبی کہ آپ جیسے اچھے انسان سے ملاقات ہوئی جس نے بھاری رقم دے کر بھی نفس کے شیطان کو اس کی

حد سے تجاوز کرنے نہیں دیا لیکن صرف ایک رات سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے آج نہیں تو کل مقدر کی سیاہی کو پھیلنے سے بھلا کون روکے گا۔''

دل میں تم پیدا کرو پہلے میری سی جرأت
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں

جانی چنبیلی سی اس پاکیزہ لڑکی کی معصومیت برقرار رکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا مگر مسئلہ چندا کا تھا کہ وہ جس ماحول میں موجود تھی وہاں اعتبار کا مطلب کسی متعفن نالی سے بڑھ کر ہرگز نہیں لیا جاتا تھا۔

''آپ نے دیکھا تھا جب ہال میں داخل ہونے پر میرے اوپر پھولوں کی سرخ پتیاں نچھاور کی گئی تھیں؟ ہونہہ..... وہ میرا استقبال نہیں تھا بلکہ ان کے اپنے شیطانی جذبات کی تسکین کی طرف پہلا قدم تھا اور بس۔''

''میں تمہیں اس ماحول میں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا اور میں جو کہتا ہوں یقین کرو، کر کے بھی دکھاؤں گا۔'' اس کی باتیں سن کر جانی بے حد جذباتی ہو رہا تھا کبھی دل و دماغ غصے کی شدت سے سن ہوتے محسوس ہوتے تو کبھی اضطراب سے کان کی لوئیں تک جلنے لگتیں اور پپوٹے بھاری ہوتے محسوس ہوتے۔

''میری مانیں تو آج کے بعد اس جگہ کا کبھی رخ نہ کیجیے گا جہاں سے مہاراجہ بھی خالی ہاتھ اور جیبیں جھاڑتے ہوئے نکلتے ہیں ویسے بھی یہ کوٹھے اور ہم طوائفیں صرف اور صرف نامردوں کے ٹھکانہ اور خواہش ہوتی ہیں اور آپ تو مجھے اچھے خاصے مرد معلوم ہوتے ہیں۔ ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کی غرض سے چندا اداس آنکھوں سے ذرا سا مسکرائی۔

''میں نہیں مانتا.....'' وہ کسی ضدی بچے کی طرح اپنی بات پر اڑا تھا اور اس کا مستحکم انداز دیکھ کر ہی چندا کو اس پر ترس آنے لگا سو اسے بات مکمل کرنے کی بھی اجازت نہ دی اور بیچ میں بول پڑی۔

''کیا نہیں مانتے اور کس بنیاد پر یہ جو سارے بڑے عزت دار لوگ یہاں آتے ہیں ناں یہ سب مردوں کے نام پر دھبہ ہیں جس کوکھ میں جنم لیتے ہیں اسی کو ذلیل و خوار کرتے ہیں اور..... اور کیا سمجھتے ہیں آپ کہ.....''

''مجھے باقی سب کی طرح کیوں سمجھ رہی ہو تم؟'' اس مرتبہ جانی نے بھی اسے بات مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

''مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے سوائے اعتبار کے' تم صرف میری باتوں کا اعتبار کرو اور بھروسہ رکھو کہ میں

تمہیں عزت دینا چاہتا ہوں اور گناہ کی اس دلدل سے کہیں بہت دور لے جانا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات پر چندا چونکی۔

اس کی ساری ہی باتیں باری باری چندا کو حیران کیے دے رہی تھیں' آنٹی کی منہ مانگی رقم ادا کر کے وہ ساری رات ہی بس اس سے باتیں کرتا اور اس کی سنتا رہا تھا اور چندا یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ کیا واقعی یہ بھی مردوں کی کوئی قسم ہے؟ بھلا ایسے بھی مرد ہوتے ہیں کیا؟

آنٹی کی مہربانی سے وہ ایف اے مکمل کیے ہوئے تھی اور تب اس کے ذہن میں یہ خواہش بڑی شدت سے ابھری تھی کہ جس طرح فزکس کے اصولوں کے تحت عام مادے کے خواص معلوم کر لیے جاتے ہیں بالکل اسی طرح کاش کوئی ٹھوس اور مستند اصول ایسا بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی بھی شخص کی نیت معلوم کی جاسکتی لیکن ایک بار حقیقت اور خواہش کا فرق اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

وقت مٹھی میں بند ریت کی طرح آہستہ آہستہ ہاتھ سے نکل رہا تھا اور صبح صادق بس ہونے کو تھی' جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ بس اب بچھڑنا ناگزیر ہے۔

''تمہیں معلوم ہے چندا! نہ تم سے پہلے اور نہ تمہارے بعد میری زندگی میں کوئی نہیں ہے۔ جس جگہ پر میں تمہارے ساتھ اس وقت موجود ہوں جانتا ہوں کہ یہاں عورتوں کا بازار ہے ان کی قیمت لگتی ہے' گاہک آتے ہیں خریدتے ہیں لیکن مجھے اس سوچ سے بھی نفرت ہے' میں..... میں تمہیں خریدنا نہیں چاہتا چندا کیونکہ خریدی ہوئی عورت کا بندہ استعمال تو کر سکتا ہے اس سے محبت نہیں کر سکتا اور مجھے تم سے محبت ہے' ایسی محبت کہ میں یہاں کسی اور کا تمہاری طرف دیکھنا بھی برداشت نہیں سکتا۔'' جانی کی باتیں چندا کے وجود پر پتے کے آخری سرے پر ٹکی بارش کی بوند کی طرح رک گئی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے جانی کی باتوں سے اس کے دل کے سمندر میں جذبات کے بڑے بڑے بھنور نمودار ہونے لگے تھے۔

رات ختم ہو چکی تھی اور صبح کی کرنیں دھرتی پر مکمل طور پر پھیلنے سے پہلے اسے یہاں سے جانا تھا۔ کچھ دیر ٹھہر کر اس نے چندا کے جواب کا انتظار کیا لیکن ان سوئی جاگی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت دیکھ کر اٹھا اور گہری سانس لے کر بولا۔

''جب تک میرے جسم میں سانس باقی ہے تمہیں کسی اور کا نہیں ہونے دوں گا لیکن اگر تم چاہو تو کیونکہ زبردستی کرنا محبت کے اصولوں میں کہیں نہیں ہے۔''

جس طرح کچھ لوگ مچھلی کھانے کے بعد دودھ پینے سے ڈرتے ہیں عین اسی طرح چندا بھی اس کی محبت کے یوں آشکار ہونے پر خوفزدہ ہو کر کچھ بھی کہنے سے گریزاں تھی سو ہونٹ بھینچے ہوئے جانی دروازے تک جا کر پھر پلٹا انتہائی کرب انگیز نظروں سے چندا کو دیکھا جیسے شاید مہاتما بدھ نے آخری بار اپنی رانی اور بچے کو دیکھا ہوگا اور سوچا ہوگا کہ بچھڑنا اٹل ہے۔

اور بغیر کچھ بھی کہے دروازہ کھول کر باہر تو نکل گیا لیکن چندا کو لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے دل کا مکین بن گیا ہو۔ سارا ماحول' موسم' باتیں ایک پرزم دکھائی دینے لگی تھیں اسے لگا جیسے آنکھوں کے سامنے ایک خاص قسم کا زوم لینس آ لگا ہو کہ چاروں طرف جانی کی باتیں مجسم صورت میں نظر آنے لگی تھیں اور تب ایک عجیب قسم کا بوجھ دل پر آن پڑا تھا اور اسے اس بات کا بے حد رنج تھا کہ اگر اس کا دل جانی کی سچائی کی گواہی دے رہا تھا تو زبان کیونکر بے یقینی کے حصار میں مقید رہی اور جس بے بسی سے جاتے ہوئے جانی نے اسے دیکھا وہ نظریں گویا دل کے ساتھ چپک ہی تو گئی تھیں۔

اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا

❀---❀---❀

پینو' گڈی' رانی اور ناجی چاروں ہی کئی دنوں سے محض پانی پر زندہ تھیں ایسے میں ہمت تو کرنا ہی تھی پھر ناجی کی ذہنی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ اسے گھر چھوڑ کر پینو کوئی مزدوری ہی ڈھونڈ پاتی۔ وہ اچانک ہی بیٹھے بٹھائے گریہ وزاری اور معاف کر دینے کی تکرار شروع کرتی تو پینو سے سنبھالی ہی نہ جاتی سو پہلے تو وہ دوسری بستی جا کر استاد کے سامنے منت سماجت کر کے ریڑھی لے کر آئی پھر ناجی کے ہی طریقے کو آزماتے ہوئے اسے افیم چٹائی اور محلے سے ایک عورت بلا کر اس کی مدد سے بمشکل ریڑھی پر ڈال کر اللہ کی اس وسیع زمین پر اس کا فضل تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئی۔

اس کا بھی ارادہ بھیک مانگنے کے بجائے جانی کی طرح کوئی مزدوری کرنے کا تھا لیکن بھوک کے مارے جو اُبکائی آتی تو لگتا انتڑیوں سمیت سب کچھ باہر آ جائے گا۔ نقاہت کے مارے اس سے دو قدم چلنا محال ہو رہا تھا' وہیں رانی اور گڈی کی حالت اس سے بھی ابتر تھی۔ گڈی اور رانی تو اِدھر اُدھر سے مٹی کی ٹکڑیاں اٹھا کر اسی طرح کھانے بھی لگی تھیں جس طرح عام طور پر کچھ ناخن کھاتے ہیں لیکن پینو بھی آخر کیا کرتی بے بسی کا عالم تو یہ تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود ان کے لیے کچھ کر نہیں پا رہی تھی۔ بستی سے نکل کر مین روڈ پر آئی تو ٹریفک جام میں سامنے کھڑی گاڑی کو دیکھ کر گویا اس کا دل کٹ کر رہ گیا فرنٹ سیٹ پر موجود میاں بیوی جہاں خوش گپیوں میں مصروف تھے وہیں پچھلی سیٹ پر بیٹھا بچہ خشک گوشت کے ٹکڑے اپنے کتے کے منہ میں ڈالتا ہوا اس کے لچھے دار بالوں میں ہاتھ پھیرتا جا رہا تھا اور کتا بڑی بے نیازی سے اپنے اگلے دونوں پنجے گاڑی کے نیم وا شیشے پر رکھے آتے جاتے لوگوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی کلاس ٹیچر ایک پُرہجوم کلاس میں موجود بچوں کو دیکھا کرتی ہے۔ پینو کے دل پر پاؤں پسارے بیٹھا دکھ کا بوجھ بھیگی روئی کی طرح مزید وزن بڑھا گیا تھا۔

اس نے سر جھکا کر ایک نظر اپنے دائیں بائیں موجود رانی اور گڈی کو دیکھا جنہوں نے اپنی دانست

میں نہ رہا وہ مٹی کی ٹکڑے والا ہاتھ پیچھے کر کے خیال کیا کہ شاید پینو اب تک ان کے اس عمل سے انجان ہے اور وہ نے بھی جان کر انجان بنتے ہوئے ان کے بھرم کو قائم تو رکھا مگر دوسری نظر اس کی دور کہیں آسمانوں اس بلندیوں والے ربّ کی تلاش میں ضرور گئی جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی اور جس کی نظر میں بلاشبہ تمام انسان برابر ہیں لیکن اس لمحے پینو کا دل چاہا تھا کہ اگر ان بلندیوں میں وہ اپنے ربّ کو ڈھونڈ لے تو اس سے یہ شکوہ تو ضرور ہی کرے گی کہ اے اپنے بندوں کو سب سے زیادہ چاہنے والے ربّ! جب تیری دنیا میں اشرف المخلوقات بھوک سے مر رہی تھی اور جانور ولایتی غذائیں کھا رہے تھے تو تُو نے ان کی خبر گیری کیوں نہ کی؟

عجیب رسم ہے چارہ گروں کی محفل میں
لگا کے زخم، نمک سے مساج کرتے ہیں
غریبِ شہر ترستا ہے اک نوالے کو
امیر شہر کے کتے بھی راج کرتے ہیں

انہی باغی سوچوں کے درمیان ٹریفک کب رواں دواں ہوئی اور لذیز گوشت کے مزے اڑاتا سفید روئی سا خوب صورت کتا آنکھوں سے کب اوجھل ہوا اسے پتا بھی نہیں چلا' احساس ہوا تو تب جب باسی روٹی خریدنے والے کا بڑا سا تھیلا رش کی وجہ سے اس سے ٹکرایا' وہ ادھیڑ عمر شخص بھی شاید جلدی میں تھا اور تھیلا بھرا ہوا تھا اس میں سے پھپھوندی لگی روٹی کے چند ٹکڑے نیچے جا گرے جس پر گڈی اور رانی کی نظریں گویا چپک کر رہ گئیں تب دل نے بڑی خواہش کی کہ کاش یہ روٹی کسی طرح اسے مل سکتی اور وہ اپنی ننھی بہنوں کو کھلا پاتی لیکن دیکھنے میں یہ بے وزن سی روٹی اگر انسان کی زندگی کے پلڑے کے ایک طرف رکھ دی جائے اور دوسری طرف باقی تمام ضروریات تو بھی اسی روٹی کا وزن اس قدر زیادہ محسوس ہوگا کہ انسان کی ساری زندگی کی بھاگ دوڑ کا مرکز ہی روٹی لگنے لگتی ہے۔

اپنا آپ گھسیٹتے ہوئے رزقِ حلال حاصل کرنے کی دھن میں آخر کار وہ بھٹے تک آن پہنچی تھی جہاں دلیق کی مانند بلند قامت اینٹوں کا سرخ سے سیاہ ہوتا بھٹہ منہ سے دھواں اُگلتا ان کی پستی کو اپنی بلندی کے زعم میں نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ سرخ زمین کربلا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ قطار در قطار کچی اینٹیں اپنی باری کی منتظر تھیں جبکہ پکی ہوئی اینٹوں کو مختلف مزدور گدھا گاڑیوں میں مطلوبہ تعداد کے مطابق رکھتے جا رہے تھے۔ کئی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کو دوپٹے کی مدد سے کمر پر باندھے بیس بیس اینٹیں ایک ہی وقت میں اٹھائے ہوئے تھیں اور تب ایک بار پھر پینو کا دھیان ریڑھی میں افیم کے زیر اثر غنودگی کی حالت میں پڑی اپنی ماں کی طرف چلا گیا۔ یہ بات ماننے میں اسے کوئی قباحت نہیں تھی کہ وہ لوگ ہر لحاظ سے مفلس تھے کہ مفلسی بھوک پیاس یا اشیاء ضرورت کی کمی کا نام نہیں بلکہ کاہلی اور بے غیرتی بھی اسی مفلس کے عنوان تلے

درج ہونے والے سب ٹاپکس ہیں۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خدا نے پتھر میں بھی کیڑے کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے لیکن پھر یہ بات بھی تو یاد رکھنی ہوگی کہ انسان پتھر کا کیڑا نہیں ہے بلکہ اشرف المخلوقات کا تمغہ سینے پر سجانے والی وہ مخلوق ہے جو بسا اوقات درندگی' حیوانیت اور بربریت میں صف اول پر کھڑی نظر آتی ہے اور پھر اشرف المخلوقات میں بھی سب سے افضل درجے پر فائز ہونے والی ماں..... سامنے بیس اینٹوں اور نوزائیدہ بچے کو اٹھا کر رزق حلال کمانے کی دھن میں مگن اس عورت اور ناجی کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی تھی' سامنے نظر آتے اس منظر نے پینو کے اندر موجود تمام غم' ذلتیں' رسوائیاں بھوک تنگ دستی ظلم بے عزتی سب کو ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا اور اپنی ذات پر لگے ان برص نما داغوں کا غم ہر چیز پر چھانے لگا تھا۔

اسے لگا جیسے وہ جاگتے ہونے کے باوجود سوئی ہوئی ہو..... زندہ کھڑی ہونے کے باوجود مر چکی ہو۔ غم کا دھارا ایک بار پھر نشیب سے فراز کی جانب راہ ماپنے لگا تھا کہ اسی دوران ٹھیکیدار کی نظر اس پر پڑی اور اس سے پہلے کہ کسی طور خود اس کی طرف جاتی' تفتیشی نظروں سے دیکھتا وہ ٹھیکیدار اپنا بے ہنگم وجود لیے خود اس کے قریب چلا آیا۔

عورتیں مرد نوجوان لڑکے لڑکیاں کم عمر بچے سبھی کام میں مصروف تھے' پینو نے بھی ہمت کر کے اس سے کام کی بابت پوچھا لیکن بغیر لگی لپٹی کے اس نے کام دینے سے صاف انکار کرتے ہوئے للچائی نظروں کے ساتھ اسے اپنے پاس آنے کی ڈھکی چھپی بات کی تو پینو کو سب امیدیں ایک بار پھر ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔ بغیر کچھ بولے دہشت زدہ ہو کر اس نے نفی میں گردن ہلائی تو ٹھیکیدار نے ریڑھی کو ٹھوکر مارتے ہوئے اسے بھٹے کے علاقے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ نظروں میں اب لالچ اور ہوس کی جگہ خشونت بھری تھی۔

چار و ناچار بھٹے کی حدود سے اپنا بے جان وجود گھسیٹتے ہوئے وہ سڑک کنارے پہنچی ہی تھی کہ پان سگریٹ کے کھوکے پر بیٹھے دو اوباش آدمیوں نے اس کے سڑک کو چھوتے دوپٹے کا کونہ پکڑا جو پینو کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ہی پل بھر میں ساتھ چھوڑ کر اسے بیچ سڑک میں بے حجاب کر گیا۔

''بڑی بے حال ہو رہی ہے لڑکی' خیر تو ہے ناں کہاں سے آ رہی ہے؟'' مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے لوفرانہ انداز میں آنکھ مارتے کہا۔

''چادر دے دے میری ورنہ میں شور مچا دوں گی سمجھا.....'' پینو نے روہانسا ہوتے ہوئے رانی اور گڈی کو خود سے لپٹاتے ہوئے اپنا آپ چھپاتے ہوئے کہا۔

''چل چادر بھی مل جائے گی' ادھر تو آ ایک دفعہ.....'' مکروہ ہنسی شیطانی تاثرات کے ساتھ بکھرتی گئی۔

''کیوں بے' کوئی ماں بہن نہیں ہے تیری؟ کیوں تنگ کر رہا ہے اسے؟'' موٹر سائیکل پر گزرتے بوبی

لے معاملہ بھانپتے ہوئے تیزی سے گزرتے موٹر سائیکل کو ریورس کیا تھا۔

''ماں بہن تو ہے یار پر اس کی کمی ہے۔'' دونوں نے ایک دوسرے پر ہاتھ مارتے ہوئے خباثت سے اسے دیکھا۔

''اور تجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے' چل تجھے ضرورت ہے تو تُو لے جانا۔ ہم اس چھوٹی پر ہی گزارا کر لیں گے۔'' چادر کا گولہ بنا کر بوبی کی طرف اچھالتے ہوئے بڑی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی اپنی پسند اور حق سے دستبردار ہو کر اب رانی کو منتخب کیا۔

''ابے تیری تُو میں.....'' چادر پینو کی طرف پھینکتے ہوئے بوبی فوراً موٹر سائیکل سے اترا اور گالی دیتے ہوئے اپنی شرٹ اٹھا کر پینٹ میں اڑستا ہوا ریوالور دونوں پر تان لیا۔

''تم لوگ مجھے بھول گئے ہو گے لیکن میں نہیں بھولا اور دیکھنا اس دن کا بدلہ آج لیتے ہوئے وہ حشر کروں گا کہ آئندہ اس قابل ہی نہیں رہو گے دونوں۔'' نسبتاً فربہ شخص کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بوبی نے کہا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور لہجے کی مضبوطی اور آہنی جسم کو دیکھ کر دوسرا پاس کھڑا گھگھیانے لگا۔

''اوئے بابر تُو.....؟'' کل اور آج کے بابر میں اس قدر فرق دیکھ کر وہ بے حد حیران ہوا تھا۔

جذباتی تو وہ تھا ہی اس پر آج موقعہ بھی تھا جبھی ریوالور صرف دکھاوے کے لیے استعمال کرتے ہوئے ان دونوں پر اپنی بازوؤں کی طاقت یوں آزمائی کہ انہیں ہاتھ باندھ کر بھاگتے ہی بنی لیکن اس کے ساتھ ہی پینو کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ ریڑھی پر کچھ دیر سہارا لینے کی خاطر کوشش کرتے کرتے اب وہ زمین پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ رانی اور گڈی بھی اس کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں تو بوبی کی بوکھلاہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی' ریڑھی میں بے ہوش پڑی ادھیڑ عمر عورت' سڑک کنارے گری پینو اور روتی چیختی سہمی ہوئی دونوں بچیاں..... آخر اب وہ انہیں کس کے سہارے پر چھوڑے؟ یہیں چھوڑے یا ساتھ لے جائے؟ ساتھ لے جائے تو کہاں؟ ان دونوں کے سامنے رعب اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرنے والا بوبی اس انوکھی صورتِ حال پر بُری طرح بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔

❀---❀---❀

یہ سچ تھا کہ پہلی مرتبہ ان رنگین کلیوں میں آنے سے پہلے بوبی اور جانی نے عہد کیا تھا کہ وہ صرف ایک ہی مرتبہ جا کر وہاں کی دنیا دیکھیں گے اور بس اس کو وہ اپنی عادت ہرگز نہیں بنائیں گے اور اس وعدے پر بوبی تو قائم رہا لیکن جانی اس وعدے سے کچھ مکر سا گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بوبی کے ساتھ گیا تھا اور گزری ہوئی شب بھی وہ گیا تو ضرور مگر ظاہر ہے کہ بوبی کے بغیر۔ باوجود اس کے کہ اس کے علم میں جانی کے بتائے بغیر بھی سب تھا اور آج پھر وہ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ بوبی عجلت میں گھر کے اندر داخل ہوا اور آتے ہی کپ بورڈ میں موجود لاکر کی چابی نکالنے لگا۔

''کیوں بھئی خیر تو ہے؟ نہ سلام نہ دعا..... لگتا ہے بڑی جلدی میں ہے۔'' جانی نے اندازہ لگایا۔

''ہاں یار دراصل نیچے ٹیکسی میں کچھ لوگ بیٹھے ہیں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ کچھ پیسے چاہئیں تھے بس اس لیے گھر آنا پڑا۔ تجھے کوئی کام تو نہیں' آ چل اکٹھے چلتے ہیں۔''

''نہیں یار تُو جا' میں ذرا چندا کی طرف جا رہا ہوں۔'' سر کھجاتے ہوئے اس نے کہا تو الماری میں گھسے بوبی نے سر باہر نکال کر اسے دیکھا اور شرارت سے سیٹی بجاتے ہوئے ہونٹ سکوڑے۔

''تُو مجھے غلط نہ سمجھ یار' میں کسی غلط کام کے لیے نہیں جا رہا۔'' بوبی کے معنی خیز انداز میں سیٹی بجانے پر جانی خجل سا ہو گیا تھا۔

''نہیں تو کیا تُو وہاں پر یتیموں کے لیے چندہ مانگنے جاتا ہے؟'' نوٹ گنتی کرتے ہوئے بوبی نے لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''یار بوبی! میں اس لڑکی کو وہاں کے بدبودار ماحول سے نکال لینا چاہتا ہوں' بس تُو دعا کر کہ وہ میرا ساتھ دے۔''

''اوئے تو سیریس ہے' سچ سچ بتا۔'' نوٹوں کو گنتی کے دوران ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتی انگلیاں تھم سی گئی تھیں۔

''سچ ہی تو کہہ رہا ہوں' اب کیا قسم لے گا مجھ سے؟'' اور بوبی جانتا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے کیونکہ اس کے چہرے پر بکھری سچائی خود سے اپنا ہونا بیان کر رہی تھی۔

''یہ پیسے تجھے پتا ہے ناں استعمال کرنے سے پہلے تجھے سوچنے کی ضرورت نہ پہلے تھی اور نہ اب ہو گی' سمجھا ناں؟'' بوبی لمحہ بھر کے لیے رکا تو جانی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''جتنا روپیہ چاہیے لے کر اسے وہاں سے نکال لا' میں ہر طرح سے تیرے ساتھ ہوں' لیکن سن زبردستی نہیں' ہاں.....''

''بالکل نہیں اگر آج پھر وہاں جانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں نہیں چاہتا آنٹی نما عورت اسے منہ مانگی رقم دے کر اب کسی اور کے حوالے کر دے اور میں اس دن تک روز جاؤں گا بوبی جب تک اسے وہاں سے نکال نہیں لاتا۔''

''ہوں' چل ٹھیک ہے کسی ایک لڑکی کی تو زندگی برباد ہونے سے بچے گی ناں۔'' روپے گننے کے بعد ان پر ربڑ چڑھاتے ہوئے بوبی نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور باہر نکل گیا۔

جانی بھی تقریباً تیار ہی تھا سو ان دو اداس خوابیدہ آنکھوں کا تصور ذہن میں لیے تنقیدی نظروں سے خود کو آئینے میں دیکھا اور سیڑھیاں پھلانگ کر پارکنگ میں کھڑی موٹر سائیکل تک پہنچا اور ہوا کی رفتار سے اڑاتا ہوا ایک بار پھر اس جگہ جا پہنچا جہاں خلافِ قدرت گویا سورج رات کو حاضری دینے آتا اور صبح ہوتے

ہی وقتِ مقررہ پر جھروکوں سے غائب ہو جاتا اور پردے گرادیئے جاتے۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد آج بغیر کسی تعارف کے وہ اسی وسیع ہال نما کمرے میں پہنچا تو آنٹی شاید کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اسے دیکھا تو حیران سی رہ گئیں اور اس سے کہیں زیادہ حیران اس وقت ہوئیں جب جانی نے آج پھر چندا کے ساتھ رات بتانے کے لیے طے شدہ رقم ان کے سامنے رکھ دی۔

''میاں لگتا ہے دل دے بیٹھے ہو ہماری چندا کو۔'' انگوٹھیوں والا ہاتھ بڑی ادا سے ماتھے تک لے جاتے ہوئے آنٹی نے آگے سے کٹے ہوئے بالوں کو پیشانی پر سے پیچھے دھکیلتے ہوئے پیشہ وارانہ انداز میں کہا۔

''ارے نہیں آنٹی! بس اپنا غم غلط کرنے کا وقتی بہانہ ڈھونڈا ہے اور بس..... ورنہ یہ دنیا تو ہماری دنیا سے کہیں مختلف ہے اور بھلا کیا تیل اور پانی کا بھی کبھی ملاپ ہو پایا ہے؟'' وہ آنٹی کو شک بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آنٹی کو چندا سے بڑی امیدیں ہیں کہ اس کی وجہ سے ان کی تجوری گوندنی کے پیڑ کی طرح بھر جائے گی اور اگر انہیں جانی کے ذہن میں پلتے کسی بھی خیال کی کوئی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ اسے چندا سے ملنے تو دور دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیں گی۔

''ہوں..... بڑے سمجھ دار لگتے ہو۔'' آنٹی اس وقت بوسنیا کے سربوں کی طرح ہر قسم کے اختیارات کے نشے میں ایک چیل صفت عورت کی مانند معلوم ہو رہی تھیں جبکہ دوسری طرف جانی میں بوسنیا کے مسلمانوں سا جذبہ تھا' خالص' بھرپور اور سچا۔

''ویسے بھی میں نے اس کی پرورش اور دیکھ بھال ہسپتال کے انوبیلیٹر میں رکھے سست ماہی بچے کی طرح بڑی مشکل سے کی ہے اور میں اسے کسی غلط انسان کے حوالے کبھی نہیں کر سکتی۔''

''جانتا ہوں آنٹی! اور میں اب تو یہاں کا پکا گاہک ہوں' اکیلی جان ہے میری نہ گھر نہ گھر والے۔ کچھ وقت چندا کے ساتھ گزاروں گا پھر کسی اور کے ساتھ اور پھر کسی اور کے.....'' ہال میں داخل ہوتی دو لڑکیوں کو جان بوجھ کر جانی نے تفصیلی نظروں سے دیکھا۔ ''البتہ پیسوں کی شکایت نہیں ہونے دوں گا کبھی۔''

''ہوں.....'' آنٹی نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کچھ سوچا اور بندو کو بلا کر چندا کو تیار ہونے کا پیغام بھجوانے کے بعد اسے انتظار کرنے کا کہا اور خود اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ روانہ ہو گئیں تو جانی نے ان کے جاتے ہی سکھ کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور کچھ ہی دیر بعد بندو کی ہمراہی میں رنگدار شیشوں کی ٹکڑیوں سے سجے روشندان کے اس پار جا پہنچا جہاں غیر متوقع طور پر آج پھر جانی کو اپنے سامنے موجود پا کر چند لمحوں کے لیے اداس اور خوفزدہ بیٹھی چندا کھل سی گئی تھی اور اس کے چہرے پر بکھرتے خوب صورت رنگ جانی کی آنکھوں سے چھپ نہیں پائے تھے۔

''آپ..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' وہ جو اس کے جانے سے اب تک دل کا بوجھل پن برداشت کر رہی تھی' برداشت نہ کر سکی تو پوچھ ڈالا۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا کہ تم میرے آنے پر یوں خوش بھی ہو سکتی ہو۔'' جذبات کا جواب جذبات سے ہی دیا گیا تھا۔

''دراصل مجھے لگتا تھا کہ اب آپ شاید واپس نہ آئیں اور اگر آپ آئے بھی تو اتنی جلدی یوں دوسرے ہی دن..... اس بات کا تو مجھے ہرگز یقین نہیں تھا۔'' ننھا سا دہانہ مسکراتے ہوئے کھل سا گیا تھا۔

''میں اس وقت تک آتا رہوں گا جب تک تمہیں میرا یقین نہ آ جائے۔'' حسبِ سابق اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھنے کے بجائے وہ ایک مناسب فاصلے پر موڑھا رکھ کر بیٹھ گیا اور اس کے جواب میں چندا کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور سنجیدگی نے اپنا وجود ظاہر کیا۔

گھٹنوں کے بل بیڈ کے کنارے تک پہنچ کر وہ نیچے اتری اور آج اس کے بغیر کہے ہی باتھ روم جا کر کپڑے بدل کر اور میک سے اٹا چہرہ دھو کر آئی تو ابھرتے سورج کا یہ منظر جانی بڑی دلچسپی اور شوق سے بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

''میں آپ پر کبھی بھی یقین نہیں کروں گی۔'' باتھ روم سے آنے کے بعد اس نے ہلکے ہاتھ سے اپنا گیلا چہرہ تھپتھپایا۔ کل کے مقابلے میں آج وہ ریلیکس تھی اور جانی سے ڈرے جھجکے یا خوفزدہ ہوئے بغیر بات کر رہی تھی اور اس کے یوں کہنے پر جانی کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر رک سا گیا تھا۔

''مجھے حیرت ہے چندا کہ اس ماحول میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے تمہیں اب تک انسانوں کی پہچان دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہونی چاہیے لیکن پھر بھی تم میرے جذبوں کی سچائی پر یقین کیوں نہیں کر پا رہی ہو۔''

''میں آپ پر کبھی یقین نہیں کروں گی کیونکہ آپ نے خود ہی تو کہا ناں کہ آپ اس وقت تک ہی آئیں گے جب تک میں یقین نہ کر لوں۔''

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔'' جانی نے گہری سانس لی۔ ''اگر کبھی جو میں نے آنا چھوڑ دیا تو یاد کرو گی مجھے.....؟''

''ہم بھلانے والوں میں سے نہیں ہیں بلکہ لوگ ہمیں بھلانے میں محض چند لمحے لیتے ہیں اور بس رات گئی بات گئی سمجھ کر اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں۔'' چندا نے سچائی سے اعتراف کیا۔

''اگر آپ نا آئے تو یقیناً کوئی اور ہوگا اور ہر کوئی آپ کی طرح ہو، یہ ناممکن ہے۔'' ایک مدھر سی مسکراہٹ جملے کے آخر میں اس کے گلابی گالوں پر بکھری تو ضرور مگر ان ادھ کھلی آنکھوں سے ویرانی کے موسم نے ہجرت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

''جبھی تو کہتا ہوں کہ میرا اعتبار کرو میں نہ تمہیں کبھی بھولوں گا اور نہ ہی تنہا چھوڑوں گا کیونکہ میں صرف ایک دو دن یا مہینے بھر کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنانا چاہتا ہوں اور اس دلدل سے باہر

ال لینا چاہتا ہوں۔'' جانی کے گمبھیر لہجے پر چندا ایک بار پھر چونک گئی تھی' الفاظ چیخ چیخ کر اپنے سچے ہونے کی گواہی دے رہے تھے لیکن چندا اب تک ذہنی طور پر خوفزدہ تھی اگر مگر لیکن ویکن مل کر اس کے قدم اگائے دے رہے تھے کہ ایسے کبھی نہ بھولنے والوں کے وعدے تو وہ پالنے سے ہی سنتی آئی تھی۔ لیکن پھر بھی جانی کے روّیے نے اسے چندا کے دل میں بالکل منفرد مقام بخشا تھا جس کی بڑی وجہ اس کا چندا کو عزت دینا تھا' اتنے روپے دینے کے بعد بھی نہ گانا نہ فسانہ..... وہ بھی اسے اسی بات پر آمادہ کرنے کی امن میں تھا کہ کسی طور وہ یہاں سے نکل کر نئی زندگی شروع کرنے کی ہمت کرے اور بس..... باہر سے آتی ہلکی سرد ہوا کمرے کے ماحول کو بوجھل کرنے لگی تھی' اپنے سچے جذبات کی بے قدری پر جانی بھی دل مسوس کر رہ گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ چندا نے اٹھ کر کھلی ہوئی کھڑکی بند کی' اسی دوران کمرے کے دروازے پر دستک کے ساتھ ہی بندو کی آواز ابھری۔

''چندا بی بی! کچھ کھانے کو لایا ہوں اگر موڈ ہو تو.....'' بندو کی آواز آئی تو دونوں کی نظریں باہم ملیں لیکن چندا کی سوالیہ نظریں جانی کی شکوہ کناں آنکھوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکی تھیں اور وہ خوامخواہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اور باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''ہاں بندو' آ جاؤ اندر۔'' چندا نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا ہی تھا کہ بندو کسی روبوٹ کی مانند ایک ٹرے میں گرما گرم آلو کے پراٹھے' دہی پودینے کی چٹنی اور لسی رکھے اندر لے آیا۔ ایک طرف رکھا چھوٹا سا میز گھسیٹ کر موڑھے پر بیٹھے جانی کے سامنے رکھا' برتن سجائے اور جس طرح نظریں نیچے کیے ہوئے آیا تھا اسی طرح چلا بھی گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد چندا نے باہر آ کر دروازے کو لاک کیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ مجھے یوں اس گھریلو حلیے میں دیکھ کر بندو آنٹی سے کچھ بھی کہتا اور وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگتیں اس لیے۔'' چندا نے وضاحت کی تو جانی نے بھی دل ہی دل میں اس کے محتاط روّیے کو سراہا۔

''لیکن اس وقت یہ پراٹھے؟''

''میں نے ہی بنوائے تھے لیکن جب پتا چلا کہ کوئی گاہک آیا ہے تو بھوک مر گئی اور میں نے کھانے سے انکار کر دیا' شاید اسی لیے پوچھنے آ گئے تھے۔''

''ہوں چلو پھر کھانا شروع کرو۔''

''اور آپ..... آپ نہیں کھائیں گے کیا؟'' چندا کو لگا شاید جانی اس سے ناراض ہے۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' چندا نے اٹھ کر ہاتھوں سے نوالہ بنا کر کھلانا چاہا لیکن جانی نے شائستگی سے منع کر دیا اور خود نوالہ بنا کر اس کا دل رکھنے کی غرض سے کھانے لگا۔

''ناراض ہیں مجھ سے؟''

''نہیں تو' تم نے یہ کیوں سوچا؟''

''بس مجھے لگا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں' اس لیے پوچھ لیا۔'' اس کے لیے بنایا گیا نوالہ چندا نے اپنے منہ میں ڈالا۔

''ہوں..... اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ تمہاری کوئی دوست ہے؟''

''بچپن میں تو بہت تھیں مگر جب سے یہاں آئی ہوں کوئی بھی اس قابل نہیں لگتی کہ انہیں دوست بناؤں۔''

''بچپن میں یعنی تم.....'' اس کی روانی میں کہی گئی بات پر جانی چونکا تھا مگر شاید چندا اس سے اپنا ماضی شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی جبھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنا چاہا تو جانی نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔

باہر رات کی تاریکی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور صبح کی سپیدی ظاہر ہونے تک محض چند ایک باتوں کے علاوہ وہ دونوں ایک دوسرے کو مکمل طور پر جان چکے تھے' چندا دل ہی دل میں اس کی احسان مند تھی کہ بھیڑیوں کے اس جنگل میں وہ اب تک اسے بچائے ہوئے تھا اور اسی کی بدولت وہ اب تک کسی کے بھی ہوس میں لتھڑے لمس اور بہکی ہوئی باتوں کے تعفن زدہ شیرے سے مکمل طور پر محفوظ تھی۔

جبھی تو اس رات دونوں کے درمیان فون نمبرز کے تبادلے بھی ہوئے اور جب وہ جانے لگا تو چندا نے خود کہہ کر بندو سے چائے منگوائی' یقیناً وہ اس وقت کے تھم جانے اور اس رات کی کبھی صبح نہ ہونے کی خواہاں تھی لیکن یہ وقت بھی کبھی تھا ہے بھلا.....!

❀---❀---❀

''اوہ اچھا..... اور پھر۔'' ٹیکسی کے ذریعے وہ ان چاروں کو کسی طور اسی گھر میں لے آیا تھا جہاں وہ خود پلا بڑھا تھا اور جس کی در و دیوار کے ساتھ اب بھی اسے اپنی ماں کی خوشبو لپٹی ہوئی محسوس ہوتی۔

''بس پھر کیا' باقی بھٹے سے واپسی تک کے حالات تو ویسے بھی آپ کے سامنے ہی ہیں۔'' پینو نظریں جھکائے اپنی انگلیاں مسل رہی تھی' ناجی پاس ہی چارپائی پر سوئی ہوئی تھی یوں بھی وہ بیمار تو تھی نہیں کہ اسپتال لے جایا جاتا اور یہ گھر کیونکہ بوبی خرید چکا تھا اس لیے انہیں پریشان حال سمجھ کر یہاں لے آیا تھا۔ پینو ٹیکسی میں ہی ہوش میں آ گئی تھی' گھر آ کر پیٹ بھر کر کھانا کھایا تو حواس بحال ہونے لگے اور اس نے اول و آخر اسے سب کچھ سچ سچ بتا بھی دیا۔

پینو کی آواز میں رچی اداسی خود بوبی کے دل کو گھائل کر رہی تھی اور ویسے بھی پینو کے حالات و واقعات سننے کے دوران مختلف سوال کرتے ہوئے کڑیوں سے کڑیاں ملاتے ہوئے بوبی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہونا ہو یہ جانی ہی کے گھر والے ہیں اور تب سے اس نے اس بچے کھچے گھرانے کی خوشیاں ہر ممکن طریقے

سے لوٹانے کا عہد کیا تھا لیکن اس کے لیے اسے سب سے پہلے پینو کو اعتماد میں لینا تھا جو اس کے یوں التفات برتنے پر بے حد حیران تھی' ابھی وہ اس پہلو پر سوچ ہی رہا تھا کہ ناجی سوتے سوتے ہی ایک دم ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''بچالو مجھے خدارا بچالو۔'' بوبی کو سامنے پایا تو اسی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور پھر چونک کر پینو کی طرف رخ کیا۔

''یہ دیکھ پینو میرے جسم سے خون رس رہا ہے' کیسے غلیظ زخم ہو گئے میرے جسم پر اور دیکھ تو کتنی بدبو اٹھ رہی ہے ان میں سے۔'' ناجی اپنے نادیدہ زخم پینو کو دکھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ میلے ناخنوں سے ان زخموں کو کھرچتی بھی جا رہی تھی جو حقیقت میں تھے ہی نہیں۔ پینو بھی اس کی تسلی کے لیے دل جوئی کرتے ہوئے اس کے جسم کو ہلکے ہاتھ سے سہلاتی جا رہی تھی۔

''اور..... اور یہ کمر تو دیکھ میری' کوڑوں کی ضربیں مجھے لیٹنے نہیں دیتیں' کیا کروں کوئی مجھے معاف ہی نہیں کرتا وہ جو اوپر بیٹھا ہے ناں وہ تو مجھے دیکھتا بھی نہیں ہے۔'' ناجی کی آنکھیں برسنے لگی تھیں کہ اچانک بڑی سرعت سے نیچے اتر کر پاؤں لٹکا کر بیٹھی پینو کے پاؤں پکڑ لیے تو گھبرا کر پینو اس کے ہاتھ ہٹا کر خود بھی نیچے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بوبی کے لیے یہ سب انتہائی حیرت انگیز عمل تھا سو وہ بھی ناجی کی حرکتوں پر ششدر رہ گیا۔

''تُو بھی تو مجھے معاف نہیں کرتی ناں پینو! تو پھر وہ اوپر والا کیسے کرے گا معاف؟'' گلوگیر لہجے میں ناجی نے بچوں کی سی معصومیت سے شکوہ کیا۔

''اماں تُو کیا کہہ رہی ہے؟ میں نے تجھے معاف کر دیا ہے آج نہیں بہت دنوں پہلے ہی اور تُو خود سوچ ناں کیا میں تجھ سے خفا ہو سکتی ہوں۔''

''اگر تُو راضی ہے تو یہ سرخ انگاروں سی آنکھوں والے لوگ کیوں میری طرف آ رہے ہیں اور..... اور اس کا کوڑا ابھی تو نہیں رکتا ناں پینو! انہیں روک دے خدا کا واسطہ ہے انہیں روک دے۔'' ناجی نے کمرے میں کسی نہ نظر آنے والی چیز کی جانب اشارہ کیا اور پھر ایک دم ناجی کی دلخراش چیخ جو کمرے میں ابھری تو وہ درد سے بلبلاتی محسوس ہوئی۔ بوبی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسے میں انہیں سکون پہنچانے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔

پینو نے آگے بڑھتے ہوئے تڑپ کر ناجی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹنا چاہا' گڈی اور رانی بھی ماں کی یہ حالت دیکھ کر بلکنے لگی تھیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود پینو ناجی پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ پا رہی تھی' نتیجتاً وہ بار بار پچھاڑیں کھانے لگتی۔

''انہیں کیا ہو رہا ہے پینو! اور یہ کیسے ٹھیک ہوں گی؟'' بوبی نے ناجی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا تو

پینو اس کی موجودگی کا سہارا جان کر فوراً ہی رو دی۔

یوں بھی تنہا حالات کا مقابلہ کرتے کرتے اب وہ تھکنے لگی تھی لیکن پھر بھی باوجود کوشش کے حالات تیز ہوا کی طرح قابو میں ہی نہ آتے اور پھر ناجی کی حالت اس کے لیے دُہری اذیت تھی۔

''لوگ کہتے ہیں شاید انہیں کسر ہوگئی ہے۔'' دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے لوگوں کا تجزیہ بوبی کے سامنے رکھ چھوڑا تھا۔

''کسر.....؟'' بوبی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

''مطلب کوئی جن وغیرہ..... دماغ کام نہیں کرتا ان کا۔'' بوبی کو باتیں کرتے دیکھا تو پینو کی گرفت سے خود کو ایک جھٹکے میں آزاد کرواتے ہوئے اب وہ بوبی کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور یہی وہ موقعہ تھا جب پینو نے موقع پاتے ہی جانے کیا عقب سے آ کر اس کے منہ میں ڈالا کہ وہ رفتہ رفتہ سست ہونے کے بعد غنودگی میں چلی گئی۔

بوبی کے لیے یہ طریقہ علاج انتہائی حیران کن تھا' کچھ دیر وہیں موجود رہ کر سوچتے ہوئے وہ اٹھا اور محلے کے امام مسجد کی طرف چل دیا کہ اس کے ذہن میں یہ بات بچپن سے نقش تھی کہ دنیا میں ظاہر ہونے والی کوئی بیماری' پریشانی یا آفت ایسی نہیں جس کا علاج اس کتاب برحق میں نہ ہو جسے ''قرآن کریم'' کہا جاتا ہے۔

❀---❀---❀

جانی تب سے مسلسل چندا سے ملنے کے لیے ہر رات جاتا رہا اور آنٹی بھی خوش تھیں کہ ان کی توقع کے عین مطابق چندا نے اسے اپنی زلفوں کا اسیر بنا لیا تھا۔ آنٹی کو ادا کی جانے والی بھاری رقم حاصل کرنے کے لیے ان کا طریقہ کار وہی تھا جو ان سے ملنے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ رات کو تو روزانہ دونوں کی ملاقات ہوتی ہی تھی مگر اکثر دن میں بھی میسجز کے ذریعے گپ شپ جاری رہتی۔ جانی بڑی سنجیدگی سے اسے وہاں سے نکال کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کا خواہاں تھا اور خود چندا بھی اس کے اب تک کے رویے کے باعث کسی بھی قسم کا رسک لینے کو تیار تھی۔

اس روز جانی چندا ہی سے ملنے کو تیار ہو رہا تھا جب بوبی نے ریموٹ سے ٹی وی چینل تبدیل کرتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

''ہم پر اللہ کا کتنا کرم ہے ناں جانی!'' بوبی نے زیر لب ہلکے سے مخاطب تو اسے کیا تھا لیکن یوں لگا کہ وہ خود سے ہی ہم کلام ہے جبھی جانی چونک گیا۔

''تُو خود سے باتیں کر رہا ہے یا مجھ سے کچھ کہا؟''

''سوچ رہا تھا کہ اللہ کی کتنی مہربانی ہے ہم پر' دنیا کی ہر آسائش ہے ہمارے پاس روپیہ پیسہ جتنا چاہیں

طرح کر سکتے ہیں۔'' کسی گہری سوچ میں گم بوبی بولے چلا جا رہا تھا۔

''ہاں یار! تُو نے تو وہی بات کی ہے ناں کہ ہم سے بھی بڑے لٹیرے یہ سرکاری افسران' رشوت' ملاسازی' غبن' ذخیرہ اندوزی' حق تلفی اور ٹیکس چوری سمیت خدا جانے کن کن طریقوں سے حرام کا پیسہ کماتے ہیں' عالی شان محل نما کوٹھیاں تعمیر کرتے ہیں اور اوپر جلی حروف میں ''یہ سب تمہارا کرم ہے آقا'' لکھ کر خود کو دنیا کا سب سے بڑا عاجز انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اپنی ہر کامیابی کو اللہ ہی کی دین سمجھتا ہو۔'' جانی نے اس کی گہرائی میں کی گئی بات کو یکسر ہنسی میں اڑا دیا تھا۔

''او میرے یار! حرام کے روپے جیب میں ڈال کر حلال گوشت ڈھونڈنے والے اس ملک کے کتنے سارے لوگ اسے اللہ ہی کی مہربانی اسی طرح سمجھتے ہیں جیسے آج تُو اس چوری ڈکیتی کے مال کو سمجھ رہا ہے۔''

''کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ ہم بھی اپنی ماں کے ساتھ پوش مکان میں نہ سہی کسی چھوٹے سے گھر میں رہ رہے ہوتے۔'' جانی کے طنز کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنی ہی دھن میں مگن بول رہا تھا۔

''ہونہہ' وہ ماں جو اپنی اولاد کو دو نوالے روٹی کے نہ دے سکے۔'' جانی کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''تو ظاہر ہے روٹی دینا ماں کی تو نہیں باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کے بعد ہم جیسے جوان بیٹوں کی۔'' بوبی کی بات کے جواب میں جانی چپ ہو گیا تھا کیونکہ اصل بات بوبی کو بتاتے ہوئے اسے خود اپنی ہی بے عزتی محسوس ہو رہی تھی اور ماضی بچھو کے ڈنک کی طرح لمحہ بہ لمحہ اسے اذیت دینے لگا تھا۔

''یار میری تو ماں چل ہے ہی نہیں لیکن کیا تُو نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ تیری ماں اور بہنیں انسانوں کے اس جنگل میں خود کو ان بھیڑیا نما انسانوں سے کس طرح بچا رہی ہوں گی؟ کیا تیرا دل نہیں تڑپا ان کے لیے۔'' لوہا گرم محسوس ہوا تو بوبی نے ضرب لگانے میں ہرگز دیر نہیں کی تھی اور وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی تر و تازہ محسوس ہو رہا تھا اب اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔

''یار میری زندگی تباہ کرنے والی صرف اور صرف میری ماں ہے..... سگی ماں۔'' ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے وہ صوفے پر اس کے قریب ہی ڈھے سا گیا تھا' جیسے لمبی مسافت عبور کرنے کے بعد ابھی آرام کرنا نصیب ہوا ہو۔ چہرے پر صدیوں کی تھکن طاری تھی۔

''میری ماں نے مجھے صرف اس وقت محبت کی نظر سے دیکھا جب میں ہاتھ میں پیسے لے کر گھر پہنچا' خالی ہاتھ گھر جانے پر شفقت بھری نظر' ممتا بھرے پیار کا لمس تو دور کی بات ہے بوبی! روٹی تک میرے حصے میں نہیں آتی تھی اور یہی میری ماں جانے کیسے میرے سامنے بیٹھ کر خود پیٹ بھر لیا کرتی تھی۔ مجھے خیال آتا ہے تو صرف اپنی بہن کا جو میری خاطر اپنی بھوک نظر انداز کر کے میری خاطر اپنی روٹی بچا دیتی تھی اور چھپ چھپ کر مجھے دیتی کہ میں کھا لوں۔'' بوبی کے سامنے اس نے اپنی ماں یا گھر والوں کا کبھی اس

زاویے سے ذکر نہیں کیا تھا مگر آج اس سے چھپایا نہیں گیا تھا اور وہ بولا تو بولتا ہی چلا گیا۔

''تجھے پتا ہے کہ میں نے حلال روزی کے لیے اپنی ماں سے کتنی گالیاں سنی ہیں؟ میں بھیک مانگنے کے بجائے خود محنت کر کے کمانا چاہتا تھا یار! لیکن کیا کرتا ہر بار ناکامی ہوتی اور مجھ سے زیادہ دیہاڑی ان سب کی لگتی جو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھے رہتے۔'' وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

''اور اسی بات پر میرا باپ مجھے مارتا تھا کہ میں مارا مارا پھرنے کے بجائے کیوں ان کی طرح بھیک نہیں مانگتا اور..... اور یہ جو میں چوریاں کرتا ہوں ناں اس کی بھی سب سے بڑی ذمہ دار میری ماں ہے جس نے پہلی مرتبہ ٹھیلے سے ٹکیاں چرا کر لانے پر مجھے اتنا پیار دیا ابا کے سامنے اس قدر سراہا کہ مجھے اپنی ماں کا وہ پیار حاصل کرنے کے لیے بار بار چوری کرنی پڑی۔ اگر وہ معمولی پر قناعت کر کے غیر معمولی کی خواہش نہ کرتی اور اگر وہ میری پہلی چوری پر ہی سرزنش کرتی تو میں کبھی بھی اس جرم میں ملوث ہو کر آج اس حد تک نہ پہنچتا۔'' بوبی اس کی باتوں کا پس منظر جان کر خود بھی دکھی ہو گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دونوں میں یہ قدر مشترکہ ہے کہ وہ دونوں ہی حلال روزی کمانے کی خواہش رکھتے ہیں۔

''جس طرح آم کی ایک گٹھلی میں تین چار سو آم چھپے ہوتے ہیں ناں بالکل اسی طرح ایک برائی سے اس سے بھی زیادہ برائیاں جنم لے سکتی ہیں۔'' پشت صوفے کے ساتھ ٹکا کر اس نے سر بھی پیچھے دیوار کے ساتھ لگا کر آنکھیں بند کیں اور ایک بار پھر گہرا سانس لیا' اتنا گہرا کہ جیسے وہ اندر کا سارا بوجھ باہر نکال پھینکنا چاہتا ہو۔''

''کبھی سوچتا ہوں میں کیا تھا اور کیا ہوں' کیا کیا سوچا کرتا تھا اور اب ہونہہ..... کیا کرتا ہوں محنت کی' حلال کی کمائی کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا لیکن آج وہی زندگی گزار رہا ہوں جس سے میں انتہائی نفرت کیا کرتا تھا اور پھر اگر تُو مجھے نہ ملتا تو میں آج جانے کس حال میں ہوتا۔ تیرے مجھ پر بہت احسان ہیں یار!'' باتوں کے درمیان ہی ایک دم اس تشکر آمیز نظروں سے بوبی کو دیکھا جو بڑے دھیان توجہ اور دلچسپی سے اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

''لیکن میں نے کیا کیا جس کنویں میں خود گرتا جا رہا تھا اسی میں ہاتھ پکڑ کر تجھے بھی گھسیٹ لیا۔'' بوبی تاسف سے بولا' ملال کا ایک گہرا رنگ اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھا۔

''اچھا چل جانے دے چھوڑ اب تُو گر ہی گئے ناں تو کیا غم اور ایسے بھی یہاں کون سا ہمارے لیے کوئی کنویں میں رسّی ڈالے بیٹھا ہمارے نکلنے کی دعائیں کر رہا ہے۔'' بوبی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر دل کا بوجھل پن ہنسی میں اڑانے کی کوشش کرتا جانی اٹھ کھڑا ہوا اور ٹی وی کے سامنے رکھا والٹ جیب میں ڈال کر گھر اور موٹر سائیکل کی چابی اٹھائی اور اس سے پہلے کہ کمرے سے نکلتا بوبی کی آواز پر رک کر پلٹا۔

''جانی اگر میں کہوں کہ کوئی ہے جو راتوں کو جاگ جاگ کر تیری واپسی کی دعائیں مانگتا ہے تو؟'' اس

ل ہات پر ٹھٹکتے ہوئے جانی کا دھیان فوراً چندا کی طرف گیا تھا کیونکہ بوبی اور چندا بس یہی تو اس کی دنیا تھی اب۔

''کون ہے ایسا؟'' اپنے اندازے کی تصدیق چاہنے کے لیے اس نے بوبی سے پوچھا کیونکہ چندا کے متعلق سب کچھ اس سے شیئر کرتا رہتا تھا۔

''ماں.....'' بوبی نے دھیرے سے رگ و پے میں سکون بخشنے والے اس رشتے کا نام ادا کیا۔

ایک ایسا لفظ جسے سنتے ہی جانی کی شریانوں میں دوڑنے والے خون نے ایک دم جوش مارا' جس کی محبت بھری صرف ایک نظر کو وہ ترستا رہتا تھا' وہ اب اس کے لیے تڑپ رہی ہے یہ کیسے ہوسکتا تھا اور اگر ایسا ہے بھی تو بوبی کو کیسے معلوم۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو بوبی؟''

''سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں یار! تیری ماں کی نظریں آج بھی ہر پل صرف تیرے انتظار میں چوکھٹ کا طواف کرتی رہتی ہیں۔''

''ماں اور میرے لیے؟'' جانی سے مزید کوئی بھی سوال نہ ہوسکا تھا' سو یونہی بالوں میں انگلیاں پھنسائے اضطرابی کیفیت میں تیزی سے باہر نکل آ گیا۔

❀---❀---❀

مقامی امامِ مسجد کے دیئے گئے تعویذوں اور کیے گئے دم درود سے ناجی کی حالت میں تبدریج بہتری آتی جارہی تھی' بوبی بلاناغہ وقتِ مقررہ پر انہیں اپنے ساتھ لاتا وہ قرآن کریم کھول کر بہ آوازِ بلند چند سورۃ مبارکہ کی تلاوت کرتے تو ان حروف کے ذریعے ناجی کو اپنے دل میں لگی آگ پر پھوار سی برستی محسوس ہوتی۔ یوں لگتا جیسے برسوں سے تپتی جھلستی ریت پر مینہ برس رہا ہو اور ریت بھی ایسی کہ سیراب ہو ہی نہ پاتی کہ ناجی کا تو یہ حال تھا کہ اس کا دل چاہتا بس امام صاحب اس کلامِ شیریں کو پڑھتے رہیں اور وہ چپ چاپ بیٹھی بس سنتی ہی چلی جائے۔

یوں بھی اس پر کسی جن کا سایہ تو تھا نہیں ہاں البتہ ضمیر کی خلش اور پچھتاوے کی دہکتی آگ نے اس کے دماغ میں انگارے ضرور بھر دیئے تھے۔ رانی کے عمل دانستہ سے بس ایک ہی لمحہ میں ناجی کی ساری دنیا پلٹ گئی تھی اور پھر یہ بھی تو اس ذاتِ پاک کی خاص عنایت ہی تھی کہ اسے ہدایت ملی ورنہ تو ساری ساری عمر لوگ آلودہ زندگی گزار دیتے ہیں اور غافل اس قدر کہ انہیں گناہ کے گناہ ہونے کا بھی احساس تک نہیں ہوتا۔

خود ربّ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے دل پتھر ہوجانے کے بارے میں پہلے ہی بتا رکھا ہے لیکن پھر انہی پتھروں سے نہریں جاری کرنا اور دلوں پر لگے گمراہی کے قفل توڑنا بھی بے شک اسی عالی مقام کا کمال ہے

کہ بے شک وہی ہے جو دہکتی آگ کو گل وگلزار میں بدل دیتا ہے تو کبھی کروڑوں سالوں سے قائم بلند
چٹیل پہاڑوں سے چشم زدن میں اونٹنی یوں ظاہر کرتا ہے کہ عقل کا دنگ رہ جانا بھی بے حد معمولی سا جملہ
محسوس ہوتا ہے۔ ناجی اب گو کہ پہلے کی طرح چیخ و پکار نہیں کرتی تھی نہ ہی دیوانہ وار مسجدوں کی طرف لپکتی
ہوئے آہ و بکا اور معاف کر دینے کی فریاد کرتی لیکن ہنوز ایک چپ تھی، جو اس کے سیاہی مائل ہونٹوں
بکل مارے ہوئی تھی۔

حسبِ معمول امام صاحب کو واپس مسجد میں چھوڑ کر آنے کے بعد بوبی آیا تو پینو ماں کے سرہانے بیٹھی
تھی' اسی جگہ پر آج ناجی لیٹی ہوئی تھی جہاں کبھی اس کی ماں آرام کیا کرتی تھی۔ ماں کی یاد آئی تو ایک
ہوک سے بوبی کے دل میں گھٹن محسوس ہونے لگی' ناجی میں اسے اپنی ماں کی روح محسوس ہونے لگی تھی'۔
اختیار چلتا ہوا وہ ناجی کے قریب آیا اور ناجی کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا لیکن تب اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا
کہ ماں سب کی سانجھی ہوتی ہے اور اگر اس کی ماں دنیا میں نہیں بھی رہی تو کیا جانی کی ماں تو ہے ناں
وہیں کھڑے کھڑے اس نے ناجی کو اپنی ماں کا درجہ دے ڈالا تھا۔

پینو اسے یوں خاموش کھڑے ناجی کے چہرے کو دیکھے جانے پر کبھی اسے دیکھتی اور کبھی ناجی کو۔
دوران بوبی کو بھی اس کا یوں حیرت سے دیکھنا محسوس ہوا تو احساسات کو نارمل کرتے ہوئے جیب سے اک
سفید کاغذ تہہ کیا ہوا اس کی طرف بڑھایا جو اسے یہاں کھڑا دیکھ کر اچھی طرح سر پر دوپٹہ جما رہی تھی۔

''لیکن یہ ہے کیا؟'' پینو نے الٹ پلٹ کر وہ سفید کاغذ دیکھا۔

''امام صاحب نے چند آیتیں لکھ کر دی ہیں جو پانی پر پھونک کر اماں کو دینی ہیں۔'' ناجی کے پاؤں
طرف طرح بیٹھتے ہوئے وہ بولا مگر ایک بار پھر پینو الجھ کر رہ گئی۔

''لیکن..... وہ.....'' بوبی کی سوالیہ نظریں پینو کے چہرے پر مرکوز ہوئیں۔

''وہ.....'' پینو نے انگلیاں مروڑتے ہوئے نظریں چرائیں۔ ''مجھے تو قرآن شریف پڑھنا نہیں
کسی نے کبھی سکھایا ہی نہیں۔''

اس کے یوں بے چارگی سے کہنے پر بوبی کو ایک بار پھر اپنی ماں کی یاد آئی جس نے بڑے جذ
لگن سے نہ صرف ان دونوں بہن بھائیوں کو کم عمری میں قرآن پاک مکمل پڑھا دیا تھا بلکہ دوسروں
اس کی تعلیم بڑے شوق سے دیا کرتیں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ خود انہیں قرآن پاک کی تعلیم دے
اتنی اتنی دیر گھر میں رہ کر محلے والوں کو کسی بھی قسم کی باتیں کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جبھی وہ
دورانیے کے لیے ان کے پاس آیا کرتا تھا سو اس مقصد کے لیے اس نے محلے میں ہی موجودہ زبید
سے درخواست کی تو وہ بڑی خوشی سے اس کارِ خیر کے لیے رضامند ہو گئیں اور رانی اور پینو دونوں
ہی رحمت و ہدایت کے اس سمندر سے چند قطرے لے کر اپنی روح کو سیراب کرنے لگیں کہ دنیاوی

اللہ تعالیٰ نے انہیں بوبی کی صورت میں جو غیبی امداد بھیجی تھی اس کے لیے وہ جتنا بھی شکر ادا کرتیں کم معلوم ہوتا۔

صاف ستھرے کپڑے، چھوٹا سا کچا پکا گھر اور سب سے بڑھ کر عزت کی زندگی۔ یہی سب کچھ تو پینو کا خواب تھا جو بوبی کے وسیلے سے حقیقت میں ڈھل گیا تھا اور یوں بھی بوبی کے علاوہ اس بھری دنیا میں اور کوئی ہمدرد تھا بھی تو نہیں جبھی آنکھیں بند کرنے پر ہمیشہ ہی پینو کو بوبی کا پرخلوص چہرہ نظر آتا تو وہ دل میں ساری باتیں اسے کہہ کر خود پرسکون ہو جاتی۔

❀---❀---❀

''ماں اور میرے لیے دعائیں.....؟'' یہ آخر بوبی نے آج کیسی بات کر دی تھی۔ جانی نے موٹر سائیکل کی اسپیڈ مزید تیز کرتے ہوئے خود سے سوال کیا لیکن جواب میں لامحدود حیرت کے سوا کوئی احساس کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔

وہ تو خود جانے کب سے ماں کی آغوش کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اب تک اس پیشے سے وابستہ ہوگی جس کی بناء اسے گھر سے نکالا اور تب سے خود جانی کا گھر سے ایسا دل اُچاٹ ہوا کہ دوبارہ وہاں جانے کی خواہش بھی نہ ہوتی۔

کراچی جیسے شہر میں موٹر سائیکل پر سڑکوں کو روندتے اکثر وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ان لڑکیوں کو غور سے دیکھا کرتا جو سڑک کنارے ہی تمام بھاؤ تاؤ کر کے وقتِ مقررہ پر مال لے جانے کی آمادگی ظاہر کرتے ہوئے ایڈوانس تھامتی نظر آتیں۔ جانے کیوں لیکن ان کے ساتھ موجود ادھیڑ عمر عورت میں جانی کو ناجی اور جوان لڑکیوں میں پینو کا چہرہ گڈمڈ ہوتا محسوس ہوتا تو نفرت کی شدت کا اظہار ہمیشہ ہی ایکسلیٹر پر دباؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے اسے احساس تک نہ ہوا کہ کب اس نے موٹر سائیکل بستی کی طرف جاتے رستوں کی طرف موڑی اور کیسے وہ بستی کے اندر داخل ہوتا گیا۔ حواس بحال ہوئے تو اسی مانوس سے ماحول کو دیکھ کر دل کا دھڑکنا بہت عجیب رخ اختیار کرتا گیا۔

سب لوگ وہی تھے اور ویسے ہی تھے، ننگ دھڑنگ بچے، مٹی اڑاتی زمین، شکستہ در و دیوار اور ان پر بال کھولے بین کرتی انتہائی غربت۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا سوائے اس کے۔

موٹر سائیکل بستی کے آغاز میں ہی لاک کر کے وہ اندر گیا اور اپنے گھر پہنچ کر حیران رہ گیا کہ وہاں تو ان کے گھر کا کوئی بھی فرد موجود نہیں تھا اور اردگرد موجود لوگ جو یقیناً اسے قطعی طور پر پہچان نہیں پائے تھے اس بابو کو اپنے درمیان پا کر اس سے زیادہ حیران تھے۔

''یہاں کہیں شوکے کا گھر ہوتا تھا، ناجی اور جانی وغیرہ۔'' وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید انہوں نے گھر بدل ڈالا ہو کیونکہ ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے پار جانی کو کوئی بھی جانی پہچانی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جبھی سب کا نام لے

کر پوچھا تو رانجھن نے پہلے تو ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی پھر بولا۔

''بابو کب کی بات کر رہے ہو؟ شوکا تو اپنے دو چھوٹے بیٹوں کے ساتھ عرس پر گیا تھا وہیں تینوں خدا کو پیارے ہوئے۔ جانی تو پہلے ہی کہیں گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور ناجی..... وہ بے چاری تو پاگل ہوگئی تھی' ایک دن چاروں ماں بیٹیاں گھر سے نکلی تو تھیں مگر آج تک واپس نہیں آئیں۔'' رانجھن نے مکمل معلومات دی تھیں۔

یہ سب سن کر جانی کو اپنے ہاتھ پاؤں سرد ہوتے محسوس ہوئے تھے گو کہ اتنا سارا عرصہ وہ ان سے ملا نہیں تھا لیکن ایک ہونے کا احساس ضرور تھا اور یہی احساس اکثر پینو اور دوسری چھوٹی بہنوں کی یاد آنے پر اسے سنبھالے رکھتا مگر آج تو وہ احساس ہی نہ رہا تھا ان کے ہونے کی کیفیت باسی پھول کی طرح مرجھا گئی تھی اور اس انوکھی موت پر جانی جی بھر کے رونا چاہتا تھا جبھی پہلے پہل تو دل چاہا کہ فوراً سے پہلے چندا کے پاس پہنچ جائے اور جی بھر کے اپنا دل ہلکا کرے لیکن مرد ہو کر اس کمزور لمحے میں ایک عورت کا سہارا لینا اس نے گوارا نہ کیا تھا۔

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے نہ روئے گا تو مرجائے گا

نہ باپ رہا نہ بھائی' ماں اور بہنیں نجانے اس وقت کس حال میں ہوں گی' یہ سوچ اسے کند چھری سے ذبح کرنے کے برابر تکلیف دے رہی تھی' موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یونہی یہاں وہاں دوڑانے کے بعد آخر وہ ایک پیڑ تلے آ بیٹھا تھا۔ دکھ سے گو کہ سینہ پھٹ رہا تھا لیکن یوں تنہائی میں آنسو بہانے سے اب اسے اپنا آپ کچھ ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا اردگرد علاقہ چونکہ سنسان تھا اور یوں مغرب کے بعد تو ویسے بھی وہاں آمدورفت اتنی نہ تھی اس لیے بغیر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے کھل کے رویا تھا۔ اِکا دُکا گزرنے والی گاڑیوں نے اسے دیکھ کر تعجب کا اظہار تو کیا مگر بغیر مداخلت کیے گزر گئے یوں بھی آج کل بھلا کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ کسی روتے ہوئے انسان کی لیے اپنی مصروفیات ترک کرے۔

شہر میں روشنیاں جگمگانے لگی تھیں لیکن اس کے اندر اندھیرا پنجے گاڑ رہا تھا اور اب جب کہ وہ رو لینے کے بعد کچھ بہتر حالت میں تھا تو خیال آیا کہ بوبی یقیناً ان کے بارے میں جانتا ہوگا اسی لیے اس نے یہ بات چھیڑی فوراً جیب سے موبائل نکال کر اس کا نمبر ملایا لیکن نیٹ ورک میں پرابلم تھی یا نمبر بزی۔ بات نہیں ہو پائی تو کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور سیدھا چندا کے پاس جا پہنچا اور دستک دینے کے بعد اندر داخل ہوا تو وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی سی چٹیا میں بیلے کی کلیاں سجائے کانوں میں بھی بیلے کی کلیاں ڈال رہی تھی۔ اسے دیکھا تو ہمیشہ کی طرح کھل سی گئی لیکن جانی کی طرف سے سابقہ گرم جوشی نظر نہ آنے پر چونکی تو ضرور مگر کریدنے کے بجائے بندو سے کہہ کر چائے منگوائی اور اس سے کسی بھی قسم کے سوالات کرنے

ے گریز برتا جبکہ جانی بھی بغیر کچھ کہے ایک طرف رکھی بید کی کرسی پر ڈھے سا گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد بندو چائے پہنچا کر واپس لوٹا تو چندا نے بھاپ اڑاتا کپ اس کی جانب بڑھایا لیکن جیسے ہی کپ تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چندا کی مخروطی انگلیوں سے ٹکرایا تو جیسے وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا' چندا نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور اپنا کپ اٹھا کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔

وہ جانی کو مکمل وقت دینا چاہتی تھی تاکہ اگر وہ چاہے تو خود اپنی پرابلم شیئر کرے' اسی لیے پوری توجہ جانی کے بجائے چائے کے کپ کی طرف مبذول رکھی۔ کتنے ہی لمحے محض خاموشی میں بیت گئے اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جب اس نے چندا کے سامنے سب کچھ دہرایا تو باوجود ضبط کے آنکھوں میں اترتی نمی کو مخفی نہ رکھ پایا۔ بے دلی سے جانی نے کپ واپس چندا کی طرف بڑھایا تو اس نے اپنا کپ بھی چھوڑ دیا اور میز پر رکھنے کے بعد بولی۔

''ابا اور بھائیوں کا صدمہ تو اپنی جگہ لیکن شکر کرو کہ تمہارے لیے دعا کرنے والے ہاتھ اب تک سلامت ہیں اور اس سے بڑھ کر مطمئن رہو' اس بات پر کہ اگر بوبی ان کے بارے میں جانتا ہے تو یقیناً تمہارے حوالے سے وہ ان کی بہت بہتر دیکھ بھال بھی کر رہا ہوگا۔'' جانی کا غم اسے اپنے سینے میں پناہ لیتا محسوس ہوا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن.....''

''مثبت انداز میں سوچو کہ اگر ان کے ساتھ ساتھ اماں اور پینو وغیرہ کو بھی کچھ ہو جاتا تو بھلا تم کیا کر لیتے جن کا تم کبھی نام لینا اور سننا نہیں چاہتے تھے آج ان کا نام پکار پکار کر رو رہے ہو۔ وہ جو دنیا سے جا چکے ان کے لیے تمہارا رونا کسی کام کا نہیں مگر جو اس دنیا میں موجود ہیں ان کے سامنے اپنی ماں کے سامنے جا کر آنسو بہاؤ تو تمہارے دل کو بھی کچھ سکون ملے۔'' چندا نے جانی کو تصویر کا بڑا مختلف رخ دکھایا تھا سو وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

یوں بھی یہ احساس کہ چندا اس کے دکھ میں دکھی ہے اور اسے سمجھاتے ہوئے اس دکھ بھری کیفیت سے باہر نکالنا چاہتی ہے' جانی کے لیے زخموں پر مرہم ثابت ہو رہا تھا۔ یہ احساس کہ کوئی آپ کے غم میں آپ کی خاطر غمگین ہے اور یہ غم دور کرنا چاہتا ہے انسان کا دکھ کئی گنا کم کر دیتا ہے۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اکثر اوقات زندگی میں ہم جنہیں ملنا تو درکنار دیکھنا اور ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے' انہی کی موت پر دھاڑیں مار مار کر یوں روتے ہیں کہ در و دیوار ہل جائیں اور کلیجہ منہ کو آنے لگے بھلا زندگی میں جنہیں دیکھ کر منہ موڑ لیا جاتا ہے ان کا آخری دیدار کرنے کی کوشش کیوں؟ مرنے کے بعد ان کی قبروں پر تازہ پھولوں کی نرم پتیاں نچھاور کرنا کہاں کی محبت ہے؟ کوئی آپ کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش میں دنیا سے چلا جائے تو آپ اس کے مرنے کے بعد اسے ایک نظر دیکھ لینے کو پہنچ جائیں' یہ کہاں

کا دستور ہے؟ اس لیے ہونا تو یہ چاہیے کہ بندہ زندہ لوگوں کی قدر کرے نہ معلوم کس وقت' وقت انہیں زمین کے اوپر چلتے چلتے زمین کے نیچے سلا دے۔'' اپنا دکھ بھول کر جانی اس کی باتوں میں مگن ہو گیا تھا جس کے اوپری ہونٹ کے اوپر ابھرتے ہوئے پسینے کے ننھے ننھے قطرے اسے مزید تروتازہ اور شاداب بنا رہے تھے۔ ایک ایک لفظ جانی کو اپنے افسردہ دل پر دستک دیتا محسوس ہوا تھا بظاہر مسکراتے ہوئے ہمیشہ جانی سے بات کرنے والی چندا اسی لیے شاید کبھی بھی اپنے چہرے کے تاثرات اور لفظوں کے درمیان ہوتی جنگ جیت نہیں پائی تھی لیکن آج جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس کا چہرہ اور آنکھیں بھی سو فیصد اس کی حمایت میں نظر آتی تھیں۔

''اب مجھے ہی دیکھ لیں یا میری جیسی دوسری تمام لڑکیاں جو اِن رنگین گلیوں میں زندگی گزارتی ہیں ہم سب اسی دن مر جاتی ہیں جس دن آنٹی جیسی عورتیں پہلی دفعہ کسی کے بھی سامنے نیلام کرنے کی نیت سے پیش کرتی ہیں لیکن جس طرح پھول ٹوٹنے کے بعد بھی بہت دیر تک تروتازہ رہتے ہیں اور کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ مر چکے ہیں اور پھول فروش اس پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے رنگ برنگی پیکنگ میں گاہکوں کے سامنے ان کے دام لگاتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی تروتازہ رکھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ دام لگوائے جاتے ہیں یہ جاننے کے باوجود کہ آنے والا ہر شخص ہمیں ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دے گا۔'' اپنے آپ پر استہزائیہ انداز میں طنز کرتے ہوئے اس نے گالوں کو چومتی بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے کیا۔

''تم اگر اب تک اس ماحول کی عادی نہیں ہو پائیں تو اس کا مطلب ہے تم یقینی طور پر کہیں اور سے آئی یا لائی گئی ہو؟'' چندا کو یوں جذباتی ہوتا دیکھ کر جانی نے بھی وہ سوال کر ڈالا جس کا جواب جاننے کو وہ خود بڑا بے چین تھا۔

''اماں ابا کے ساتھ رہتی تھی میں لیکن میرا ابا ذرا ذرا سی بات پر اماں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا' تو مجھے دنیا بھر میں سب سے قابلِ نفرت انسان وہی لگتا جو ہر وقت کاموں میں جتی اور ایک ایک پیسہ بچانے والی میری فرشتہ صفت ماں پر ہاتھ اٹھاتا حالانکہ اماں کھانے کے وقت سب سے بہترین حصہ ابا کے لیے نکالتی پھر ہم سب کو دیتی اور سب سے آخر میں خود کھاتی۔ میری طرف سے ابا کے لیے اظہار نفرت کے جواب میں ہمیشہ مجھے سمجھاتی' ابا کی طرف داری کرتی اور خود راتوں کو رو رو کر تکیے بھگویا کرتی مگر ہونٹوں سے کبھی اُف نہ کرتی اور پھر ابا فوت ہو گیا۔'' شفق کا منظر چندا کی آنکھوں میں بجھ گیا تھا اور اس آخری روشنی میں جانی نے چندا کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھا مگر خاموش رہ کر اسے بات مکمل کرنے کا بھرپور موقع دیا۔

''اماں نے ہم جوان بہنوں کی خاطر دنیا والوں کی نظر میں بے آسرا ہونے سے بچنے اور ہمیں ایک مضبوط سائبان مہیا کرنے کی خواہش میں دوسری شادی کر لی تو میں چپکے چپکے اپنے مرے ہوئے ابا کے

لیے رونے لگی' ایک ایک بات پر وہ اس قدر یاد آتا کہ سینے کے اندر سانس پھنس جاتی۔ اماں اب بھی ہمارے سامنے تو کچھ نہ کہتی لیکن اب اس کے تکیے کے ساتھ ساتھ دوپٹوں کے کونے بھی بھیگے رہنے لگے اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ جب ابا مرگیا تو مجھے اس کی بڑی قدر محسوس ہوئی' دل چاہتا اسے قبر سے نکال لاؤں' وہ کام سے آئے تو اس کے پاؤں دھلاؤں' تھک جائے تو کندھے دباؤں' گرم گرم روٹیاں بنا کر دوں' اس کے سلوٹوں بھرے کپڑے استری کروں۔'' لمحہ بھر رک کر اس نے اپنے آنسو پیچھے دھکیلے تو اس کی ننھی سی ناک سرخ ہوگئی۔

''جیسے تیسے وہ کما کر لاتا تھا تو جتاتا تو نہیں تھا ناں' اپنا جو تھا۔ ہماری ذمہ داریاں پوری کر کے فخر محسوس کرتا تھا اور اب ہمیں ایک ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا۔ نئے ابا کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا' چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے بھی وہ اتنی نکتہ چینی کرتا کہ دل چاہتا مرجاؤں تاکہ کم از کم میری وجہ سے اماں کو اس سے کوئی چیز مانگنا نہ پڑے اور تب پتا ہے میرے دل کا پہیہ الٹا چل پڑا پہلے اپنے ابا سے نفرت اور اماں سے پیار کرتی تھی مگر نئے ابا کے بعد اپنی اماں پر بات بے بات غصہ آتا اور ابا کو بیٹھی یاد کرتی رہتی۔ مجھے لگتا بس میری کوئی ماں نہیں اگر ہوتی تو ہمارے سروں پر اس مرد کو مسلط نہ کرتی۔'' اپنی نازک سی انگلی کی پور سے اس نے آنکھوں کی دہلیز پار کرتے آنسو کو بڑی سہولت سے اپنی جلد میں سمو لیا شاید اب وہ مزید رونا نہیں چاہتی تھی۔

''اور پھر میرے نئے ابا کے دل میں پڑھائی کی اہمیت اتنی جاگی کہ وہ مجھے داخل کروانے کے لیے فارم پر لگائی جانے والی تصویر کھنچوانے کے بہانے اس جگہ لا کر بیچ گیا تو اب میں اپنی ماں کے لیے روتی ہوں کہ وہ کس قدر مجبور ہے جسے نہ صرف اولاد کو مطمئن بلکہ شوہر کو بھی خوش رکھنا پڑتا ہے اور شوہر بھی ایسا جو مجھے تو یہاں بیچ کر روپے بٹور چکا' اب جانے گھر جا کر اماں کو کون سی کہانی سنا کر طعنے مارتا ہوگا اور میرے دوسرے بہن بھائی کس طرح رہ رہے ہوں گے' بس ایک پچھتاوں کی آگ ہے جو ہر وقت اندر ہی اندر مجھے جلا کر دل کو بھسم کیے رکھتی ہے۔ میں اپنے اماں ابا کو ان کے رتبے کے برابر نہ تو عزت دے سکی اور نہ ہی محبت۔ یہ احساس دل کو اس قدر زخمی کیے رکھتا ہے کہ دل چاہتا ہے بھیڑیوں کے اس جنگل میں ہر قدم پر مرنے کا خوف لے کر زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ میں مرجاؤں۔ کم از کم میں کسی شیطان صفت انسان کے ہاتھوں کھلونا بننے سے تو بچ ہی جاؤں گی۔'' اور بالآخر بہت ضبط کرنے کے باوجود وہ اب جو روئی تو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

آج آکھاں وارث شاہ نوں' کتھوں قبراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا کوئی الگا' ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وینڑ
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کینڑ

جانی کے چہرے پر اس کی ساری کہانی سننے کے بعد ایک پرشور قلزم تھا اور بس' چندا کے اس انتہائی قدم کے بارے میں سن کر اس کے اعصاب سکتے میں آ گئے تھے۔ یہ آج کیسا عجیب سا دن طلوع ہوا تھا جو ختم ہونے کے بعد بھی کروٹیں لیتا محسوس ہو رہا تھا وہ جو اپنا دل ہلکا کرنے چندا کے پاس آیا تھا اس کی باتیں سن کر مزید بوجھل ہو گیا۔ جانی کو مثبت راہ دکھاتے دکھاتے وہ تو خود ہمت ہار بیٹھی تھی۔

کچھ دیر جبڑے بھینچے' دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسائے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور اس کا چہرہ اپنے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے اوپر کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا۔

''میرے ہوتے ہوئے تم ایسا کچھ کرنا تو الگ بات ہے سوچو گی بھی نہیں' سمجھیں؟'' چندا کی ہچکیاں اب تک جاری تھیں گو کہ ہاتھوں کی پشت سے وہ آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

''تم اب صرف اور صرف میری ہو اور میں تمہیں یوں روتا ہوا کبھی نہیں دیکھنا چاہتا' نہ ابھی اور نہ ہی تمام عمر.....'' چندا نے بے یقینی سے جانی کی طرف دیکھا۔

''آپ جانتے ہیں ناں کہ میں اب جس جگہ سے تعلق رکھتی ہوں وہاں کوئی بھی رفاقت ایک رات سے زیادہ طویل نہیں ہوتی۔''

''نہ ہوا کرے۔'' جانی نے اس کی بات کاٹی۔

''مجھے اس جگہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اگر تم میرا ساتھ دو تو میں کچھ کرنا چاہتا ہوں جو یہاں شاید کبھی نہ ہوا۔'' چندا کی سوالیہ نظریں اٹھیں تو جانی کے چہرے پر رقم سچائی اسے اپنے دل میں اترتی محسوس ہوئی۔

''میں تمہیں یہاں سے کہیں دور لے جانا چاہتا ہوں چندا!'' جانی کے منہ سے الفاظ کے ادا ہونے کی دیر تھی' چندا نے فوراً اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر نفی میں گردن ہلائی تو جانی سمجھ گیا کہ یہاں کسی بھی قسم کی بات کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا سو اپنی بات کسی اور طریقے سے سمجھانے کے لیے اس نے تفصیلی بات اگلی ملاقات پر رکھی لیکن چندا کے یوں قریب آنے سے جو خوشبو محسوس ہوئی تو جانی کو خود اپنا آپ بھی معطر لگنے لگا۔ تازہ ہوا کے اس جھونکے کی طرح جو صبح سویرے چنبیلی اور موتیا کی نرم و ملائم کلیوں کا بوسہ لیتے ہوئے اتراتا پورے گلشن میں پھیلتا جاتا اور یہ مسحور کن خوشبو ہر ذی انسان کے ذہن کو تر و تازہ کر جاتی سو یہی حال جانی کا بھی ہوا مگر اسی دوران چندا کو بھی اس عمل بے خود کا احساس ہوا تو جانی کے منہ پر رکھا اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا اور وہ یوں پیچھے ہٹی کہ جیسے روٹی بناتے ہوئے گرم توے کو ہاتھ جا لگا ہو۔ جانی نے یوں اس کے ہاتھ ہٹانے کو بھی بڑی دلچسپی اور لگاوٹ سے دیکھا تھا۔

❀---❀---❀

آج جانی جب صبح اپنے فلیٹ کے اندر داخل ہوا تو خلافِ توقع بوبی کو جاگتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا اور

کمرے میں جانے کے بعد اس کے سامنے والے صوفے پر نیم دراز ہوگیا تو بوبی نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے تفتیشی انداز میں اسے دیکھا۔

''خیر تو ہے' کہاں رہنے لگا ہے تو رات رات بھر؟''

''بتاتا ہوں' پہلے یہ بتا تو کیوں جاگ رہا ہے ابھی تک؟ خیر تو ہے ناں؟'' جانی نے جواب دینے کے بجائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر انگلیوں سے کنپٹیاں سہلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا اور جانی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس وقت جواب دینے کے موڈ میں نہیں۔

''پتا ہے میں آج بستی گیا تھا۔''

''اوہ اچھا..... پھر.....'' بوبی ایکٹو ہوکر بیٹھ گیا تھا جس سے جانی کو سمجھ آ گئی تھی کہ وہ اسی لیے روکھا پھیکا انداز لیے بیٹھا تھا کہ اس نے اتنی بڑی خبر اس کے گھر والوں کے بارے میں دی' اسے احساس دلایا کہ اسے ان کی خیر خبر لینی چاہیے مگر اس کے باوجود جانی نے اس معاملے کو ہوا میں اڑا دیا اور اب جب اپنے اس خیال کی نفی ہوئی وہ اس میں دلچسپی لینے لگا اور بات بھی توجہ سے سننا شروع کی۔

''ابا اور دونوں بھائی تو اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن باقی سب کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں ہیں' اب سوچ رہا ہوں کہ انہیں کس طرح اور کہاں کہاں ڈھونڈوں؟''

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' بوبی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کے کندھا تھپکتے ہوئے دلاسہ دیا۔

''اگر میں تجھے بتاؤں کہ وہ لوگ کہاں ہیں تو پھر؟''

''تو پھر سے کیا مطلب یار! پھر تو فوراً میں ان کے پاس پہنچ جاؤں۔'' جانی یوں جوش سے بولا تو بوبی نے بھٹے سے لے کر اب تک کی ساری کہانی من وعن بیان کردی۔

''تو میرے گھر والوں کے لیے اتنا کچھ کرتا رہا اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' تمام حالات جان کر جانی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''اول تو یہ کہ دن میں' میں گھر پر نہیں ہوتا تھا اور رات کو تو..... اور پھر میں نہیں چاہتا تھا کہ تو اماں کو اس حالت میں دیکھ کر مزید پریشان ہوتا' آخر وہ میری بھی تو ماں ہیں ناں' یقین کر ان میں مجھے اپنی ماں کا روپ نظر آتا ہے یار!'' بوبی کے لہجے میں ناجی کے لیے اس قدر پیار دیکھ کر وہ عجیب کشمکش کا شکار تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں اور ناجی میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن کچھ بھی کہنے میں اس کی ماں کی عزت اور خود اپنی انا آڑے آتی تھی سو چپ رہا لیکن دل تھا کہ فوراً سے پہلے انہیں دیکھنے اور ملنے کو مچلنے لگا۔

''یار تُو کتنا بدقسمت ہے کہ اتنے پیارے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان سے صرف اپنی ذاتی انا کی

خاطر منہ موڑے رہا بھلا یہ تو سوچ کہ ماں باپ کے سامنے ہماری انا کی وہی اہمیت ہونی چاہیے جو ہماری سگریٹ کے سامنے اسی میں سے گرنے والی اس راکھ کی ہوتی ہے۔'' ٹیبل پر موجود ایش ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا تو جانی نے سر جھکا لیا۔

''میں اتنا پتھر دل نہیں ہوں یار! جتنا تُو مجھے سمجھ رہا ہے اور پھر چھوڑ ان باتوں کو دہرانے کا کیا فائدہ' جو اَب گزر چکی ہیں۔''

''گزری ہوئی ترش باتیں اور تلخ رویے بس یونہی دل سے نہیں نکلتیں' انہیں بھلانے اور نظر انداز کرنے کے لیے محبت بھری توجہ اور پُرخلوص لفظوں کی ضرورت ہے اور یہ لفظ ہی ایسا مرہم ہے جو بڑے سے بڑا دکھ بھلا دیتے ہیں۔'' اس نے اپنے تئیں اشاروں میں بڑا پُرخلوص مشورہ دے ڈالا' جانی اس کی بات کا مطلب مکمل طور پر سمجھ گیا تھا۔

''چل پھر اٹھ' باہر روشنی تو ہونا شروع ہو بھی گئی ہے' ان سے ملنے چلتے ہیں۔'' اپنوں سے ملنے کا تصور ہی جانی کی آنکھوں میں جگنو چمکائے ہوئے تھا۔

''بس پھر تو دو منٹ رک' میں واش روم سے ہو کر آیا۔ ناشتا آج وہیں کریں گے۔'' بڑے پُرجوش انداز میں جانی اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہوا ایک ہی جست میں اٹھا اور واش روم میں گھس گیا اور جب ایکسیلیٹر پر جانی کا پاؤں ہو تو بھلا فاصلہ طے کرنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔

پون گھنٹے میں وہ دونوں دروازے کے باہر موجود تھا اور دستک دے کر ابھی پیچھے ہٹے ہی تھے کہ اندر سے آتی پتلی سی معصوم آواز نے جانی کو چونکا دیا۔

''کون ہے؟''

''رانی میں ہوں بوبی!''

''ہاں تو دروازہ کھلا ہے ناں بھیا! اندر آ جائیں۔'' بڑے مصروف سے لہجے میں اپنائیت بھرا جواب آیا تو بوبی دروازہ کھول کر اندر بڑھ گیا۔ جانی نے بھی جھجکتے ہوئے اس کی تقلید میں قدم اندر کی طرف بڑھائے تو سامنے ہی ایک عجیب ناقابل یقین منظر اس کا منتظر تھا۔

رانی نیلی فراک پر سفید وی لگائے یقیناً اسکول کے لیے تیار ہو رہی تھی اور گڈی یونہی بلا مقصد اس کے آگے پیچھے گھومتی ہوئی شوق سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ کچن کا دروازہ چونکہ براہ راست صحن میں کھلتا تھا جبھی سرعت سے جھاڑو لگاتی پینو نے ایک نظر بوبی کو دیکھا اور نظریں ملنے پر گھبرا کر جھاڑو چھوڑا اور گلے میں جھولتے دوپٹے کو سر پر جمانے کے بعد بظاہر دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو گئی یقیناً جب ہی بوبی کے پیچھے اندر داخل ہوتے جانی کو نہیں دیکھا تھا لیکن روشنیوں اور رنگوں کا جو منظر اس کے چہرے پر بوبی کو دیکھنے سے ابھرا تھا' وہ جانی نے ضرور دیکھا تھا۔

''کیا یہ سب حقیقت ہے یا کوئی خواب؟'' جانی نے خود سے سوال کیا۔

''کیا اس حد تک تبدیلی ممکن ہے؟'' وہ اندر ہی اندر خود سے الجھ رہا تھا کہ ایک دم کچن سے جو ذرا دھیان ہٹایا تو صحن میں لگے امرود کے درخت تلے بچھی چارپائی پر بیٹھی ناجی کو دیکھ کر تو گویا ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

ریڑھی پر بال بکھرائے' پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہاتھ پھیلاتی ناجی اور چارپائی پر سر جھکا کر تسبیح کرتی ناجی میں کتنا واضح فرق تھا۔

''السّلام علیکم اماں!'' بوبی نے نزدیک جا کر ناجی کے سامنے تھوڑا سا جھکتے ہوئے اسے سلام کیا۔ جانی بھی اس کے عقب میں موجود تھا اور اس سے پہلے کہ سر اٹھا کر ناجی ہمیشہ کی طرح اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعاؤں کے ساتھ سلام کا جواب دیتی بوبی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے جانی کو دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔

کہاں وہ دبلا پتلا مریل سا جانی اور کہاں اب لمبا چوڑا اکسرتی بدن والا جینز شرٹ میں ملبوس بابو بنا یہ نوجوان..... خود جانی کی حالت کچھ مختلف نہ تھی اللہ کے اس معجزے پر وہ حیران بھی تھا اور اس کا شکر گزار بھی' مرد ہونے کے باوجود وہ فوراً سے ناجی کے گلے لگ کر باقاعدہ آواز سے رو دیا تھا۔ ناجی کی حالت بھی کم و بیش ایسی ہی تھی اس کے بھی آنسو جانی کے بالوں میں جذب ہونے لگے تو پینو جو وہیں پر کوڑا ایک طرف کر کے بوبی کے لیے چائے بنانے کی غرض سے کچن میں چلی گئی تھی فوراً صحن میں بھاگی بھاگی آئی اور جانی کو اپنے سامنے یوں اچانک پا کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ حیرت اور خوشی سے آنسو بہاتی پینو کے ساتھ ہی رانی اور گڈی بھی موجود تھیں جو سب کے چہروں کو بس ٹکر ٹکر کر کے دیکھتی جا رہی تھیں اور خاص طور پر ناجی کو جانی کو یوں دیوانہ وار پیار کرتے دیکھ کر تو ان کے ننھے اذہان بھی کشمکش کا شکار تھے۔

گو کہ سبھی کی آنکھیں نم تھیں لیکن دلوں میں جو سکون اور طمانیت کا احساس تھا اس سے یہ ضرور لگتا تھا کہ یقیناً ان کی توبہ آسمانوں کو چھو چکی ہے۔

❀---❀---❀

جانی کے انتظار میں آج چندا کا دن کسی طور گزر ہی نہیں رہا تھا' آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے نظریں موبائل کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں کہ بیل تو یوں بھی سائلنٹ پر تھی۔ دل کو آس تھی کہ جانے کس وقت جانی کی طرف سے کوئی پیغام ہی موصول ہو جائے۔

آبنوس کی لکڑی سے بنے وال کلاک میں انگریزی ہندسوں پر گھومتی میرون رنگ کی سوئی اسے ایک ایک سیکنڈ کے گزرنے کا احساس دلا رہی تھی اور آج اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ اب جانی کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی لیکن آخر کرتی بھی تو کیا اور کہتی بھی تو کس سے؟ کہ جھروکوں کے پار

چلتی ان روشنیوں کے ساتھ ہی اس کی روح بھی جل کر خاک اور راکھ میں بدل چکی تھی۔ جہاں زیادہ سے زیادہ رقم سے آڑھتی اتار کر اپنا من سیراب کرنا ایک پرانی ریت تھی۔ ایسے میں جانی جیسے انسان کا مل جانا چندا کے لیے ایک معجزے سے کم ہرگز نہیں تھا جس کی طرف سے ملنے والی عزت ہی اسے اپنے دل کی بنجر زمینوں پر پڑنے والی پہلی بارش کی طرح محسوس ہوئی تھی اور وہ گو کہ نئی اور خوشگوار زندگی کے لیے ابھی منتظر گھڑیاں گن رہی تھی لیکن جانی کی زندگی خزاں کے بعد آنے والے موسم بہار کی مانند خوشگوار ہوگئی تھی۔ رشتوں کی پرانی کونپلوں پر کھلتے محبت کے نئے پھول مکمل طور پر اپنے جوبن پر تھے اور پھولوں کی خوشی کشید کرنے کا موقع دیتے ہوئے بوبی جان بوجھ کر کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر گیا تھا جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر وہ لوگ ایسی کوئی بات جو اس کے سامنے نہ کی جاسکتی ہو وہ آرام سے کرلیں اور ناجی تو یوں بھی چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے نہ صرف بوبی بلکہ اس کی ماں کو بھی دعا میں یاد کرتی کہ جس نے اس قدر اعلیٰ تربیت کرتے ہوئے اوروں کے لیے بھی کارآمد بنایا۔

واقعی یہ اعمال ہی تو ہیں جن کی وجہ سے کچھ لوگ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردوں میں شمار ہوتے ہیں اور کچھ مر کر بھی ہمیشہ کے لیے زندہ ہوجاتے ہیں۔ بوبی کی والدہ کا شمار ناجی آخر الذکر لوگوں میں کیا کرتی تھی۔ جانی ماں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا دوپہر کے کھانے کا منتظر تھا' پینو باورچی خانے میں بھنڈیاں پکا رہی تھی اور بھنڈیوں کا سوچ سوچ کر جانی کی بھوک میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہورہا تھا لیکن اسی دوران ایک ایسا سوال جو صبح سے جانی کو بے چین کیے ہوئے تھا اور جس کی وجہ سے وہ اب بوبی سے بھی نظریں چرانے پر مجبور تھا اس کے لبوں پر آ ہی گیا۔

''اماں کیا تُو نے..... میرا مطلب ہے کہ بوبی کو پہلے گزرنے والے تمام واقعات بتا دیئے ہیں؟''

ماں تھی لیکن پھر بھی اس سے بات کرنے کے دوران جانی جھجک سا گیا تھا۔

''ہاں بوبی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔'' گہری سانس لے کر ناجی نے بات کر کے جانی کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''لیکن ان خطاؤں اور گناہوں کے جو ہم سے اور خاص طور سے مجھ سے ہوئیں۔'' بات مکمل ہوئی تو جانی کے بھی اوسان بحال ہوئے اسی دوران پینو بھنڈی کے سالن اور گرم گرم روٹیوں کے ساتھ دہی پودینے کی چٹنی لے کر باورچی خانے سے نکلی اور ان دونوں کے درمیان رکھ دی' ناجی نے حزن و ملال کی کیفیت میں چارپائی کی پائنتی کے ساتھ ٹونٹی کے پانی سے بھری ہوئی بوتل اور اسٹیل کے دو گلاس رکھ کر واپس مڑتی پینو کی طرف دیکھا۔

''جن گناہوں سے خود اللہ کی ذات پردہ پوشی فرمادے تو پھر ہمیں بھی کوئی حق نہیں پہنچتا ناں کہ اسے دنیا والوں کے سامنے بیان کرتے پھریں۔'' ناجی نیچی نظروں کے ساتھ اپنی دونوں ہتھیلیوں پر بکھرے

لکیروں کے جال کی طرف متوجہ تھی پھر جانی کی بھوک کا خیال آیا تو اپنے ہاتھوں سے نوالہ بنانے لگی۔

''صرف پیٹ بھرنے کی کوشش میں میں حلال اور حرام کی تمیز بھول گئی تھی لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے ہمیں بوبی جیسے انسان نما فرشتہ سے ملوادیا جس نے اللہ کے حکم سے یوں ہماری زندگی بدلی کہ اب بھی کبھی کبھار یہ سب ایک خواب لگتا ہے اس کی ماں کے بارے میں سب کچھ پتا چلا تو میں اور بھی شرمندہ ہوئی اور میں نے سوچا کہ واقعی حرام کھانے سے کہیں بہتر ہے ناں کہ بندہ بھوکا ہی رہے۔'' اپنے ہاتھوں کا بنایا ہوا نوالہ اس نے جانی کے منہ میں ڈالا تو بچپن کی خواہش پوری ہونے پر فرطِ جذبات سے جانی نے اس کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اس سے پہلے کہ ناجی اس کی آنکھوں کی نمی اپنی ہتھیلی کی پشت پر محسوس کرتی' موبائل پر ہوتی میسج کی بپ نے جانی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''خود ساختہ مصروفیتوں کے خوش نما ساحل سے ایک نظر ان گمنام جزیروں پر بھی..... جہاں امیدِ ناتمام اب بھی وقت کی مضبوط گرفت میں ہے۔''

جہاں بھی ہو چلے آؤ' تمہیں یادیں بلاتی ہیں
تمہارے ساتھ جو گزریں تھیں وہ شامیں بلاتی ہیں
یہ نہ سمجھو تمہارے بن کسی کا دل نہیں روتا
کسی کی آج بھی تم کو اداس آنکھیں بلاتی ہیں

اسکرین پر موجود دل میں اترتے یہ الفاظ پڑھ کر جانی کی روح تک شاد ہوگئی تھی' کیسا حسین دن تھا کہ ہر مراد بر آئی تھی اور یوں بھی چندا سے ملنے کے بعد سے اب تک یہ پہلا دن تھا کہ جب وہاں سے آنے کے اتنے گھنٹوں بعد تک بھی جانی نے اسے میسج نہیں کیا تھا سو اب چندا کی طرف سے میسج ملا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور سوچنے لگا کہ اب اسے بوبی کے ساتھ مل کر جلد ہی ایک حکمت عملی ترتیب دینی ہے جس سے ان کی زندگی ایک مثالی زندگی کا روپ دھار لے۔

❀---❀---❀

روپیہ پیسہ دنیا کی واحد ایسی چیز ہے جو زبان نہ ہونے کے باوجود بھی بولتا ہے اور ایسا بولتا ہے کہ پھر بڑوں بڑوں کی بولتی بند کروا دیتا ہے۔ جانی بھی آج کل آنٹی کے ساتھ پیسہ پھینک تماشہ دیکھ والا کھیل کھیل رہا تھا۔ روزانہ رات کو چندا سے ملنے جاتا تو آنٹی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے جاتا جو کہ معاوضہ سے ہٹ کر صرف آنٹی کے لیے تحفہ گردانا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ لالچ کی ہزار ہا پرتوں میں چھپی آنٹی' جانی کو اب ایسا با اعتماد گاہک سمجھ بیٹھی تھیں جو صرف چندا سے ملنے کی غرض سے اپنا سب کچھ وارنے پر بھی تیار تھا۔ آج بھی جانی' آنٹی کی جھوٹی خوشامد اور ان کی خوب صورتی کی جعلی تعریفیں کر کے چندا تک پہنچا تو کھلے بالوں کو سلجھا کر پیچھے کی طرف جھٹکا دیتی چندا اسے دیکھ کر خوشی سے کھل گئی اور ہیئر برش کے دندانوں پر

حیرت سے پوریں پھیرتے ہوئے بولی۔

''آپ.....آج پھر.....؟''

''سو فیصد میں اور آج پھر..... کیوں یقین نہیں آ رہا کیا؟'' جانی نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے شوخ نظروں سے مسکراتے ہوئے چندا سے سوال کیا جو چٹیا کرنے کے لیے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کرنے ہی لگی تھی کہ جانی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے بال کھلے رکھنے کا کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

''میں تو سمجھی کہ بس جناب کے دل سے محبت کا خمار اتر گیا۔'' بات مکمل کرتے ہوئے جانے اس کے ذہن میں کیا آیا کہ بڑی ادا سے خود بخود ہنس دی۔ اس کے انگ انگ سے پھوٹتی خوشی جانی نے بخوبی محسوس کی تھی' نرم سا لہجہ اور دل کو چھوتی نرم آواز' وہ فدا ہونے لگا تھا۔

''ہوں.....یعنی اب ایک دن بھی میرے بغیر نہیں گزر سکتا۔'' جانی نے کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے تھے اور کمرے کا ماحول دودھیا روشنی میں بے حد دلنشین معلوم ہو رہا تھا۔

''ظاہر ہے جب آپ آنکھوں میں ایسے خوب صورت خواب بسا جائیں گے تو سونا تو دور جاگتے ہوئے بھی ہر طرف آپ ہی آپ نظر آئیں گے ناں۔'' نظریں جھکا کر اس نے معصومیت سے اعتراف کیا تو جانی اس کے قریب چلا آیا اور اس خیال سے کہ کوئی اور سن نہ لے' اس کے قریب ہو کر پہلے تو اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے کے دروازے سے آخری دیوار کے پاس کھڑے ہو کر سرگوشی کرنے کے لیے اپنا منہ اس کے کان میں پہنے گئے خوب صورت آویزے کے نزدیک کیا اور بولا۔

''میں نے اور بوبی نے چوری چکاری چھوڑ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' جانی کی سانسیں اپنے بائیں رخسار پر محسوس کرتی چندا اس خبر پر چونکی اور فوراً رخ موڑ کر اس کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھتی ہو کہ ''اب میرا کیا بنے گا؟'' جھیل سی آنکھوں میں اپنی ذات کے متعلق کئی سوال ہلکورے لینے لگے تھے۔

''تمہیں کہا تو تھا کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان نہیں ہونا' اب تم میری ذمہ داری ہو۔'' ایک اور سرگوشی بہت قریب سے ابھری تھی' چندا ہلکا سا مسکرائی تو ضرور لیکن خدشات اور وسوسوں کے ساتھ۔

اسی دوران جانی نے اسے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکال کر اسے پڑھنے کو دیا جس پر وہ بوبی سے سارا منصوبہ لکھوا لایا تھا۔ ہر قدم پر احتیاط کی ضرورت تھی جبھی بوبی کے مشورے سے یہ طریقہ اپنایا گیا تھا کہ جانی اگر لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا تو خیر چندا کو تو پڑھنا آتا ہی تھا اور سارا منصوبہ پڑھ لینے کے بعد خوشی سے چندا کی کاجل بھری آنکھیں بھیگنے لگی تھیں گو کہ یہ بہت بڑا رسک تھا لیکن باعزت زندگی گزارنے کی خواہش میں وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی یہ رسک لینے کو تیار تھی جس کی ناکامی کی صورت میں یقیناً اس کی زندگی جانوروں

سے بھی بدتر کر دی جاتی لیکن اس سب کے باوجود وہ یہ قدم ضرور اٹھانا چاہتی تھی تاکہ کل کو اس کے دل میں یہ کسک باقی نہ رہے کہ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے کوئی ٹھوس کوشش کی ہی نہیں۔

چھوٹی انگلی کی پور سے آنکھ کے کنارے کو ہلکا سا دباتے ہوئے چندانے کاجل کو باہر نکلنے سے روکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن اس مرتبہ جانی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور ماحول کی نزاکت کے باعث اسے اس موضوع پر کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا اور جان بوجھ کر دوسری باتیں چھیڑ دیں' یہاں وہاں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے دوران جہاں اس کو جانی پر بے حد اعتماد اور بھروسہ محسوس ہو رہا تھا وہیں ناکامی کی صورت میں پیش آنے والے ممکنہ حالات اس کے خون کو رگوں کے اندر منجمد کیے دے رہے تھے۔

میں تیری چھاؤں میں پروان چڑھوں
اپنی آنکھوں پر تیرے ہاتھ کا سایہ کر کے
تیرے ہمراہ میں
سورج کی تمازت دیکھوں
اس سے آگے نہیں سوچا دل نے
پھر بھی احوال یہ ہے
اک بھروسہ ہے کہ دل سبز کیے رکھتا ہے
اک دھڑکا ہے کہ خوں سرد کیے رکھتا ہے

❀---❀---❀

پینو بازار جانے کے لیے بڑی سی چادر اوڑھے کھڑی تھی جب بوبی حسب عادت دروازہ بجا کر اندر چلا آیا اور یوں بوبی کو اپنے سامنے دیکھ کر پینو کو اپنا دل سینے کے بجائے حلق میں دھڑکتا محسوس ہوا' چہرے کے تاثرات کو بوبی سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ خوامخواہ شاپرز کو کھولنے اور پھر بند کرنے لگی۔

''پینو.....'' بوبی نے پاس آ کر پکارا تو چاروناچار اسے بوبی کے سامنے ہونا ہی پڑا۔

''جی.....وہ.....گھر پر تو کوئی ہے ہی نہیں۔'' وہ ہمیشہ ہی بوبی کے پکارنے پر یوں گھبرا سی جاتی تھی۔

''یعنی ہم دونوں کسی گنتی میں ہی نہیں ہیں۔'' ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے وہ مسکرایا' جواباً پینو خاموش رہی۔

''کیا میری موجودگی کا احساس تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟''

''نہیں.....وہ میرا.....مطلب تھا کہ وہ.....'' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بوبی کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی' اسی لیے منہ سے الفاظ بھی گھبراہٹ کے مارے نکلنا محال لگ رہے تھے۔

''تمہارا مطلب جو بھی ہو لیکن سنو' دوسرے شہر جا کر تو ہمارا اپنا الگ گھر ہوگا جس میں صرف اور صرف تم ہوگی اور میں بس.....'' بات کی گہرائی میں جانے کے بجائے وہ ایکدم چونک کر بولی۔

''ہم دونوں بس.....''

''ہاں تو اور کیا' پہلے تو ہم دونوں ہی ہوں گے ناں پھر آہستہ آہستہ مُنا' چنا' بلی' سونی وغیرہ وغیرہ بھی آتے جائیں گے۔''

بوبی کی یوں براہ راست بیان کردہ مستقبل کی منصوبہ بندی سے وہ لجا سی گئی تھی اور سانولے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑنے لگی تو پلکوں میں بھی لرزش محسوس ہوئی اور وہ جھک گئیں۔ اپنی یہ تمام کیفیت چھپانے کی کوشش میں اس نے اوڑھی گئی چادر کا ایک کونا پکڑ کر بُرے طریقے سے چہرہ ڈھانپ کر ایک طرف سیفٹی پنز لگا کر نقاب کے نہ کھسکنے کی یقین دہانی کی اس سب کا ایک مقصد بوبی کی باتوں سے چہرے پر در آنے والی امنگوں کی پردہ پوشی بھی تھی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن.....'' پینو نے نظریں چرائیں اور بات کرنے کے لیے مناسب لفظ ڈھونڈنے لگی۔

''بتاؤ پینو! بولو ناں' تمہیں میرے ساتھ پر کوئی اعتراض تو نہیں؟'' وہ اس کے منہ سے اقرار سننا چاہتا تھا' ان لفظوں کی لذت محسوس کرنا چاہتا تھا جن سے ہر جذبے' امنگ کو نئی زندگی دان ہوا کرتی تھی لیکن پینو اس کے برعکس سوچ رہی تھی۔ وہ اب تک ماضی میں سرزد ہونے والی غلطی کو بھول نہیں پائی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بوبی جیسے مخلص اور سچے انسان کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی دھوکہ ہو' جبھی تو آج اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالنے کا ارادہ کیا جس کا بوجھ بصورتِ دیگر ساری عمر اس کے اعصاب پر رہتا۔ یوں آج موقع بھی اچھا تھا نا جی' رانی اور گڈی کو ساتھ لے کر ان خاتون کے پاس الوداعی ملاقات کے لیے گئی ہوئی تھی جن سے قرآن پاک پڑھنا سیکھا گیا تھا اور جن سے خود پینو نے بھی قرآن پاک پڑھا تھا جبکہ جانی پینو کے بازار جانے کے لیے ٹیکسی لینے گیا ہوا تھا۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں' کچھ ایسا جو سننے کے بعد شاید نہیں بلکہ یقیناً آپ اپنا ارادہ بدل ڈالیں گے۔'' پینو کی بات کرنے کے اس انداز پر بوبی نے اپنی سوالیہ نظریں پینو کی آنکھوں پر مرکوز کر دیں تو اس نے جھجکتے ہوئے وہ سب کہہ ڈالا جو وہ اب تک اپنے آپ سے بھی دوبارہ کہہ نہیں پائی تھی لیکن حیرت اسے تب ہوئی جب بات مکمل ہونے کے بعد بھی بوبی کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا فطری طور پر اس نے نظریں اٹھا کر بوبی کو دیکھا اور غیر متوقع طور پر بے حد پرسکون پایا۔

''مجھے تم پر فخر ہے پینو کہ تم ایک اچھے اور سچے دل کی لڑکی ہو اور تم نے مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیا لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جاننے کے بعد ہی کیا تھا اور اب تمہارے منہ سے سب کچھ

سننے کے بعد اس پر مزید ثابت قدم ہوں تو.....''

''کیا.....؟'' پینو پر تو گویا حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''ہاں پینو! رانی مجھے سب کچھ خود ہی بتا چکی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج کے بعد یہ باب مکمل طور پر بند ہو جائے یعنی نہ تم نے کچھ کہا اور نہ ہی میں نے سنا۔'' پینو کی آنکھوں سے رواں شکرانے کے آنسوؤں کو نقاب میں جذب ہوتا دیکھ کر بوبی نے مضبوط لہجے میں کہا تو اس کی نظروں میں جلتے محبت کے دیئے کی لو پینو نے نقاب کے باوجود اپنے رخساروں پر محسوس کی جبکہ کھلے دروازے سے اندر آتی ناجی یہ چند جملے سن کر اللہ کی رحمت پر نہال ہوگئی۔

ایک توبہ ہی تو کی تھی اس نے اور اللہ اسے اس کے اعمال کے بجائے اپنی رحمت کے مطابق کس قدر نوازتا جا رہا تھا۔ ربِّ تعالیٰ کی طرف اس کا اٹھنے والا خلوصِ نیت سے صرف ایک قدم ہی تو تھا جس کے جواب میں خالقِ کائنات اس کی طرف دس قدم بڑھا رہا تھا' وہیں دروازے سے ہی سامنے دونوں کی طرف جانے کے بجائے وہ دو قدم پر موجود غسل خانے میں وضو کرنے کی نیت سے داخل ہوگئی کہ یہ شہر چھوڑنے اور نئی زندگی کا آغاز کرنے سے پہلے وہ مالک کے حضور نوافل ادا کر کے تشکر آمیز انداز میں اس کی بڑائی' رحمت اور کرم کے سامنے اپنی کم مائیگی' بے وقتی اور عاجزی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔

❀---❀---❀

آنٹی کے وسیع ہال میں آج کچھ بڑے لوگوں کی آمد کا اعلان کیا گیا تھا ان کو متاثر کرنے اور آئندہ بھی یہیں آنے کا لالچ دینے کی کوشش کرتی آنٹی انتظامات میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی اور کمی نہیں چاہتی تھیں۔ سبھی کچھ اپنی نگرانی میں کروا رہی تھیں' ضیافت کا بھی اعلیٰ انتظام تھا اور رقص و سرور کا بھی۔ اس قدر مصروفیت کے باعث آنٹی نے چندا اور دوسری دونوں لڑکیوں کو گٹو کے ساتھ بیوٹی پارلر بھیجا تھا۔

عام دنوں میں پارلر والی خود ان کے پاس آیا کرتی تھی لیکن یہ پروگرام چونکہ اچانک بنا تھا اس لیے اس کی پہلے سے طے شدہ اپوائمنٹس کی وجہ سے اس کا آنا ممکن نہ رہا تو آنٹی نے ڈرائیور کے ساتھ ان تینوں کو بھیج دیا اور حفظِ ماتقدم کے طور پر بارہ تیرہ سالہ گٹو بھی ہمراہ کر دیا جو پارلر کے اندر ان کی حرکات و سکنات کے بارے میں انہیں بتاتا۔ پارلر میں ابھی داخل ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی اور وہ تینوں کولڈ رنکس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی فلمی جریدہ دیکھ رہی تھیں کہ دو کرسیاں خالی ہوئیں اور چندا نے بڑی فراخ دلی سے باقی دونوں کو پہلے ٹریٹمنٹ کروانے کی آفر کرتے ہوئے اپنی کولڈ رنک کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تقریباً فل تھی جبکہ وہ دونوں پی چکی تھیں۔

پیشہ وارانہ ہاتھ بڑی تیزی سے حسن کو نکھارنے کے عمل میں مصروف تھے کہ پینو اندر داخل ہوئی اور چندا کو جانی کی بتائی گئی نشانی کے مطابق اچانک دیکھنے کی اداکاری کرتے ہوئے بڑے تپاک اور خوشدلی

سے یوں ملی جیسے بچپن کی دو سہیلیاں اتفاقاً ملی ہوں۔

''اتنے عرصے بعد ملی ہو' چلو کہیں آرام سے بیٹھ کر ایک دوسرے کا حال چال تو پوچھیں۔'' ہاتھ میں پکڑے شاپرز پینو نے لمحہ بھر کے لیے پارلر کے صوفے پر رکھے اور پھر چندا کے ہاتھ تھام لیے تو چندا مسکرا دی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں ناں اور پھر.....'' چندا نے کن اکھیوں سے گٹو کو دیکھا جو ایک نظر ان پر ڈال کر دوبارہ پوری توجہ سے ٹی وی ٹرالی میں رکھے فلیٹ اسکرین کے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا جہاں کوئی انڈین فلم چل رہی تھی اور کیبل والوں کی مہربانی سے فحاشی سے بھرپور مناظر گھر گھر پہنچ رہے تھے تو بھلا گٹو کیونکر مفت کے جلوؤں سے محروم رہتا۔

''کوئی بہانہ نہیں چلے گا' اچھا چلو چاٹ ہی کھا لیں پھر پتا نہیں دوبارہ کبھی ملیں گے بھی کہ نہیں؟'' پینو نے بے انتہا اپنائیت کا مظاہرہ کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

''اچھا تو چلو ٹھیک ہے۔'' چندا نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''چل گٹو! ساتھ کی دکان سے چاٹ کھا لیں۔'' چندا نے نقاب کرتے ہوئے کہا تو گٹو نے صاف انکار کر دیا کہ جو ہیجان خیز غذا اسے انڈین فلمیں کھلا رہی تھیں وہ اس کا ایک لمحہ بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

''ایک دکان چھوڑ کر تو ہے' تم کھا کر آ جاؤ میں تو ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔'' وقتی طور پر اس نے آنٹی کی دی گئی تمام ہدایات کو یکسر فراموش کرتے ہوئے کہا تو چندا نے اپنے ساتھ آئی دونوں لڑکیوں کو دیکھا جو کانوں پر ہیڈ فون لگائے اپنے پسندیدہ میوزک سننے کے ساتھ ساتھ آنکھیں بند کر کے مساج کروا رہی تھیں لیکن اس سب کے باوجود چندا نے ظاہراً ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''باجی' تم ہی میرے ساتھ کر دو ناں کسی کو' اکیلے جانے کا سن کر آنٹی بہت غصہ کریں گی۔'' وہ عورت آنٹی کی بہت اچھی جاننے والی تھی اور اسی وجہ سے بڑے اعتبار کے ساتھ آنٹی اور ان کے پاس موجود تمام لڑکیاں کبھی کبھار یہاں آتیں ورنہ یہ خود اپنی ہیلپرز کے ساتھ وہیں جا کر ساری ٹریٹمنٹ کرا یا کرتیں لیکن آج کل شادیوں کے سیزن کی وجہ سے اس کی بھی مصروفیت تھی اور کچھ یہ محفل بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منعقد کی جا رہی تھی اسی لیے آنٹی نے گٹو کو ساتھ بھیج دیا تھا۔

''چندا دو لڑکیاں تو آج آئی ہی نہیں ہیں' صائمہ اور حنا کو دلہن تیار کرنے بھیجا ہے اور یہ تینوں ان کا کام نبٹا رہی ہیں۔'' باجی نے دائیں طرف لگی رو میں کرسیوں پر موجود دو لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جن میں سے ایک مایوں کی دلہن تھی اور آنکھوں میں نئی زندگی کے خواب سجائے شام میں ہونے والی تقریب کے لیے لائٹ سا ٹریٹمنٹ لے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر خود چندا کے دل میں بھی کتنے ہی ارمان اور خواہشات بیدار ہو گئے تھے' نت نئی امنگیں سر اٹھانے لگی تھیں اور تصور میں جانی کا گمبھیر لہجہ پھر سے

سماعتوں میں رس گھولنے لگا۔ بائیں رخسار پر اس لمحے پھر سے جانی کی سانسیں محسوس ہوئیں تو وہ زیرلب مسکرادی کہ اب تو اس نے اپنی قسمت کی کشتی جانی کے ہاتھ تھمادی تھی۔ اب ڈوبے یا ابھرے..... یہ اس نے اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔

''تم ایسا کرو اگر ضرور جانا ہی ہے تو یہ ایک دکان چھوڑ کر تو ہے' جلدی سے کھا کر آ جاؤ' آنٹی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور تب تک ان میں سے ایک کرسی خالی بھی ہو جائے گی تو تمہارا کام اسٹارٹ کردوں گی۔'' وہ خود شاید آج کام کی زیادتی سے گھبرائی ہوئی تھیں جبھی اسے مشورہ دے کر ہیئر مساج ختم کرانے کے بعد اس لڑکی کو گاؤن پہنایا اور ہیئر واش کرنے کے لیے چیزیں تیار کرنے لگیں۔

''ہاں ہاں جاؤ' میں بھی نہیں بتاؤں گا۔'' گٹو نے بھی کمال سخاوت کا مظاہرہ کیا تو چندا نے ایک نظر پینو کو دیکھا جو شاپر اٹھائے تیار کھڑی تھی پھر ہیڈ فون لگا کر آنکھیں بند کیے لڑکیوں اور سیٹ شاور کھولے کھڑی باجی پر الوداعی نظر ڈال کر بڑی سرعت سے باہر نکلی اور چاٹ کی دکان کے بجائے دائیں طرف موجود مسجد کے بیت الخلاء میں جا گھسی جو نماز کا وقت نہ ہونے کے باعث خالی تھا۔ وہیں پر چندا نے پینو کے ساتھ لائے گئے شاپر میں موجود پشاوری برقعہ اوڑھا' پاؤں سے سینڈل اور پازیب اتار کر ربڑ کے سلیپر پہنے' دوسرے شاپر سے تولیے میں لپٹا ننھا گٹو تکیہ بچے کی طرح سینے سے لگایا اور یوں وہ دونوں پشاوری برقعوں میں ملبوس آنکھوں کی جگہ پر موجود جالی سے یہاں وہاں دیکھتیں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ شارٹ کٹ کے ذریعے صرف چند ہی منٹوں میں سڑک پر پہلے سے اسٹارٹ کھڑی ٹیکسی تک جا پہنچیں جسے انہیں دور سے آتا دیکھ کر ہی جانی اور بوبی ریلوے اسٹیشن کی طرف رخ کروا چکے تھے کہ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں گڈی اور رانی کے ساتھ موجود ناجی کی تسبیح کے دانے بڑی شدت سے بارش کی بوندوں کی طرح متواتر گر رہے تھے۔

❀---❀---❀

تیز رفتار ٹرین بھاگتے مناظر کی طرح ان کے ماضی کو بھی پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی' وہ ماضی جس میں ذلت تھی' رسوائی تھی' ندامت اور پچھتاوے تھے لیکن اب باعزت زندگی گزارنے اور رزق حلال کمانے کا خواب آنکھوں میں سجائے وہ سب ایک نئی منزل کی طرف گامزن تھے جہاں بھرپور اور رفاقتوں کے حسین موسم میں ایک خوشگوار زندگی بانہیں وا کیے ان کی منتظر تھی۔ جہاں سرخ گلاب اپنی خوشبو بکھیرنے کو بے تاب تھے تو ہوا اس خوشبو کو اپنے نرم سے آنچل میں سمونے کو بے قرار۔

پینو اور چندا ابھی تک انہی پشاوری برقعوں میں ملبوس تھیں اور ناجی ان پر یاد کی گئی چھوٹی چھوٹی آیات پڑھ کر پھونکتی جا رہی تھی گو کہ وہ سب اب خوف کی فضا سے نکل چکے تھے لیکن احتیاط بہرحال لازم تھی۔ زندگی کو نئے ڈھنگ سے گزارنے کا عہد کیے وہ سب ہی اب زندگی کے اس نئے دور میں داخل ہو رہے

تھے جہاں انہیں اپنے ماضی کو ایک بُرا خواب سمجھ کر بھولنا تھا' ایسا بُرا خواب جو شیطان کی طرف سے تھا اب رحمٰن کا ساتھ حاصل ہونے پر ختم ہو چکا تھا۔

بے شک توبہ کے لیے اس ستار العیوب کا در ہم جیسے گناہ گاروں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے اور اس کی رحمت بیکراں ہماری فریادوں میں جذبے' خلوص اور شدت کی کمی کے باوجود صرف اور صرف سچے دل سے توبہ کرنے کے عوض تمام گناہوں پر نہ صرف پردہ ڈالتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی بخشش کا گراں قدر تحفہ بھی عطا کرتی ہے۔

اور ناجی نے بھی تو صرف توبہ ہی کی تھی ناں' سچے دل کے ساتھ..... جس کی قبولیت کے بعد اس پر منکشف ہونے والے آگہی کے باب نے زیست کے ایک لمحے کے طفیل نہ صرف اس کی بلکہ اس سے جڑے سب رشتوں کی زندگی ہی بدل ڈالی تھی۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

میں گلیاں دا روڑا کوڑا

آج کی رات فیروز احمد کے لیے بے حد اہم تھی کیونکہ آج ہی کی رات ٹھیک چالیس برس پہلے جب ابھی اس کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں، تب بھی اس کا دماغ اپنے سامنے ہونے والے تمام حالات و واقعات کو بڑے تکنیکی انداز میں محفوظ کر رہا تھا۔

گھٹے گھٹے سیلن زدہ کمروں میں دودھ، مکھن اور لسی سے پلنے والی جگنی اِدھر اُدھر، یہاں وہاں گھومتے پھرتے مزید گپلو اور مٹکوسی معلوم ہوتی۔ کبھی سامنے کوئی نظر نہ آتا تو نہ صرف دیواروں کے ساتھ قطار در قطار رینگنے والی چیونٹیوں میں سے اگر کوئی قطار سے باہر ہوتی تو اسے پکڑ کر زبردستی قطار کے اندر رکھتی بلکہ دیواروں سے مٹی کھرچ کھرچ کر چکھنے کا کام بڑے شوق سے سرانجام دیا کرتی۔ اس مشغلے کے دوران جیسے ہی کہیں سے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی، فٹ سے بی بی کے پلنگ کے نیچے جا گھستی۔ یہ ہلکی براؤن آنکھوں والی ننھی سی لڑکی فیروز احمد کی اکلوتی بہن اور اس کے ماں باپ کی جان تھی۔

فیروز احمد کی پیدائش کے عین گیارہ سال بعد جگنی نے ان کے گھر کی رونقوں میں جو اضافہ کیا تھا، اس پر وہ لوگ پھولے نہ سماتے تھے۔

بی بی کو لمبے بالوں کا شوق تھا اس لیے اکثر ہی اُسے اپنے سامنے بٹھا کر آملے کے اصلی تیل کی مالش کرتی نظر آتیں۔ اس کے بعد عین ناک سے کنگھا ٹکا کر سر سیدھا کرتے ہوئے دائیں اور بائیں اطراف میں بال تقسیم کرتیں اور بالکل سیدھی مانگ نکال کر ننھی منی سی چٹیاں بھی بنا ڈالتیں۔

اُس کے پیدا ہونے کے بعد ہی سے لمبی مستطیل ڈیوڑھی کے آگے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا جنگلا لگوایا گیا تھا تاکہ کھیلتے کھیلتے اس کے باہر نکل جانے کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ ہاں البتہ بی بی گھر میں ہوتیں تو جنگلے کا تالا کھلا رہتا اور وہ ہر وقت بی بی کے پیچھے پیچھے ہی نظر آتی۔

سینے سے لگائی کپڑے کی گڑیا، سر پر ٹکا ننھے سے دوپٹے کا آخری کونا، جو کہ خود کو بڑا سمجھنے اور ثابت

کرنے کے لیے وقت وقت لیے رکھتی اور وہ..... ہر وقت بی بی کے گرد چکر کاٹتی محسوس ہوتی۔

فیروز احمد کو یاد تھا کہ صوم صلوٰۃ کی بے حد پابند بی بی ہر جمعرات کو گھر میں کسی بھی دستیاب چیز پر فاتحہ پڑھ کر ارواح کو ایصالِ ثواب ضرور کیا کرتیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہر جمعرات کو ارواح دنیا میں موجود اپنے پیاروں کی چوکھٹ پر منتظر ہوتی ہیں کہ کوئی انہیں یاد کرے اور ان کی بخشش کی دعا کرے۔ اس لیے وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی دل گرفتگی کے عالم میں واپس جائے۔ ہر جمعرات کو درود فاتحہ کے بعد وہ سلور کے تھال میں روٹیاں رکھتیں اور گھر میں پکائے گئے کسی بھی سالن کو تھالی میں ڈالتیں، سر پر اپنا سیاہ برقعہ رکھتیں اور جگنی کو ساتھ لے کر مسجد جا پہنچتیں۔ جگنی اور وہ ایک دوسرے کے لیے اب لازم و ملزوم تھیں۔ نہ تو جگنی اُن کے بغیر ایک پل گزارتی اور نہ ہی اُن کا اپنا دل مانتا کہ وہ لمحے بھر کے لیے بھی جگنی کو خود سے دُور کریں۔

یوں بھی وہ لوگ جس محلے میں رہتے تھے، وہاں سکھ اور مسلمان دونوں آباد تھے۔ دو مختلف مذاہب ہونے کے باوجود آنا جانا، تہواروں کے موقع پر بنائے گئے مخصوص قسم کے کھانوں کا تبادلہ کرنا اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہونا ان گھرانوں نے اپنی رِیت بنا رکھی تھی۔

اور پھر مختلف قسم کے اسلامی تہوار جوش و جذبے سے منانا شاید بی بی کے خون میں تھا۔ اسی لیے اس بار جب شب معراج کا چاند بس اُفق پر طلوع ہونے کو ہی تھا، انہوں نے سب سے پہلے جگنی کے لیے صاف ستھرے کپڑے (جو کہ انہوں نے دھونے اور خشک ہونے کے لیے تکیے تلے تہ لگا کر رکھ چھوڑے تھے) نکال کر اسے ہینڈ پمپ کی مدد سے اچھی طرح مل مل کر نہلایا۔ ہمیشہ کی طرح سیدھی مانگ نکال کر ایک بل کی چٹیا کر کے جگنی ہی کی فرمائش پر ننھا سا پراندا ڈالا۔ کمرے میں لکڑی کے بڑے سے صندوقچے کو کھول کر اس میں موجود کپڑے میں لپٹا عطر نکال کر اُسے لگایا۔ ننھے ننھے مگر پھولے ہوئے ہاتھوں پر پہلے سے گھلی ہوئی مہندی کی گول ٹکیا بنائی اور اس کی تمام اطراف ماچس کی تیلی کی مدد سے ننھے ننھے نقطے بنا کر اسے مزید خوب صورت کرنے کی بھی کوشش کی اور اسے لوہے کے جنگلے کے عین سامنے بٹھا کر خود ہینڈ پمپ کے سامنے چارپائی کھڑی کر کے غسل کیا اور فیروز احمد کے ہاتھوں کھیر مسجد روانہ کر کے جگنی کے ہاتھ جو دھوئے تو گوری گوری ہتھیلیوں پر اتنا خوب صورت رنگ دیکھ کر انہیں بے اختیار چوم لیا۔

اپنے ہاتھوں پر مہندی وہ ہمیشہ رات کے پچھلے پہر لگایا کرتی تھیں۔

اور اسی دوران جب وہ جگنی کے ساتھ مل کر کڑوے تیل سے دیے بھر رہی تھیں کہ دو گھر چھوڑ کر رہنے والے دلیر سنگھ کی بیٹی سفید کروشیے کی باریک جالی والی صافی سے ڈھانپی گئی پلیٹ لے کر اندر آئی، مگر اُنہیں مصروف دیکھ کر جھجک کر وہیں رُک گئی۔

''آ جا نا پُتر! وہاں کیوں رُک گئی؟..... آ جا، آ جا۔'' ازلی خوش دلی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے

بی بی نے اسے اندر بلایا تو یقیناً اُس کا اعتماد بحال ہوا۔

''بی بی! بے بے کہہ رہی تھی کہ آج تم لوگوں کی کرموں والی رات ہے۔ اس لیے اُس نے بڑے سے کڑاہ میں حلوہ بنایا ہے۔ سارے محلے میں بانٹنا ہے نا۔''

''اللہ سوہنا قبول کرے۔'' بی بی نے حلوہ لے کر اپنی تھالی میں ڈالا۔ تب تک سمرن کور، جگنی کے ساتھ انجیر کے درخت کے نیچے کھڑی سامنے رکھی تیل کی بوتل اور قطار در قطار موجود دِیوں کو دیکھتی رہی۔ تب ہی جگنی کے ذہن میں جانے کیا آیا کہ اپنی سے بڑی سمرن کور کو مخاطب کر بیٹھی۔

''پتہ ہے، بی بی کہہ رہی تھی، آج کی رات بڑی بختوں والی ہے۔ جو مانگو سو ملتا ہے۔ میں نے آج بڑا کچھ مانگنا ہے۔''

جگنی کے انداز میں جوش بھی تھا اور اشتیاق بھی، مگر اس تمام سے قطع نظر اس وقت اس کے لہجے میں ایک فخر، ایک غرور در آیا تھا جس میں شاید وہ سمرن کور کو بتانا چاہتی تھی کہ تم لوگ چاہو تو اپنے من پر گجراتی تالا لگائے، ہاتھ میں کرپال تھامے رہو مگر دیکھو ہمیں تو ایک ہی رات میں من کی ہر مراد ملنے والی ہے۔ سمرن کور نے نظر اوپر اُٹھا کر اُونچے اُونچے کنگروں والی دیوار سے بھی اوپر خود پر جھکے سیاہ آسمان کو دیکھا جس پر چاند بھی سینہ تانے محسوس ہوا۔

''آج کی رات..... صرف آج کی رات میں؟'' سمرن کے لہجے میں موجود حیرت مایوسی کی بکل مارے ذرا سا جھانکی تھی۔

''تو اور کیا۔ تُو نہیں یقین کرتی تو بھلے میری بی بی سے پوچھ لے۔''

ہاتھوں کو ناک کے نزدیک لا کر مہندی کی خوشبو اپنے اندر اُتارتے ہوئے جگنی نے کہا تو سمرن مزید سوال کیے بِنا نہ رہ پائی۔

''اگر ایک رات میں ہی سارا کچھ مل جاتا ہے تو پھر تیرا ابا پانچوں وقت جا کر مسجد میں کیوں ماتھا ٹیکتا ہے؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتہ۔'' لاجواب ہو کر جگنی نے اپنا گلابی ہونٹوں کا دہانہ سکوڑا۔ ''ہو سکتا ہے بی بی نے یہ بات اُسے بتائی ہی نہ ہو۔'' جگنی نے یہاں ہاں دیکھتے ہوئے اب بات ختم کرنا چاہی تھی۔

یوں بھی تھی تو وہ بچی ہی اور اُس کی معلومات بھی بے حد محدود۔ اب یہ الگ بات تھی کہ دیکھنے میں وہ اور سمرن کور برابر ہی معلوم ہوتیں۔

''بی بی! ایک بات تو بتاؤ۔'' دُھلی ہوئی پلیٹ ہاتھ میں لے کر آتے آتے بی بی نے سمرن کور کے آنے پر کھلا رہ جانے والا جستی پھاٹک نما دروازہ بند کیا اور انجیر کے درخت تلے آن پہنچیں۔

''پوچھ پُتر!''

''بی بی! آج کی رات کیا تم میرے لیے بھی کچھ مانگو گی؟'' لالٹین میں تیل ڈال کر اس کا شعلہ ہلکا سا بلند کر کے بی بی نے چھیکا ٹانگنے کے کیل پر اُسے لٹکایا گو کہ عام دنوں میں وہ یہی عمل ذرا تاخیر سے کیا کرتی تھیں۔

''کیا چاہئے سمرن تجھے؟ بتا مجھے۔''

''بی بی! گھر میں بڑی خرابی ہوگئی ہے آج کل۔ لدھیانے سے میرے چاچے کا پُتر آیا ہے اور بے بے اور باپو کہتے ہیں کہ میرا ویاہ اس کے ساتھ کر دیں گے۔''

اُس کی بات پر بی بی، چاند کی ٹھنڈی کرنوں سا مسکرائیں۔

''کیا کرتا ہے وہاں لدھیانے میں؟''

''چاچا تو وہاں ٹانسا بناتا ہے۔ بڑے ورے (سال) پہلے اس نے زمینوں کا کام چھوڑ دیا تھا۔ باقی گھر کے سارے جی اس کے ساتھ ہی ٹانسے کی کھڈیوں میں کام کرتے ہیں پر وہ اکلا (اکیلا) اب ایک بار پھر زمینوں پر کام کرنا شروع ہو گیا ہے۔''

''تو پُتر! تجھے اعتراض کس بات پر ہے؟''

''بی بی! وہ مُسلوں کے بڑا خلاف ہے۔ کئی گبھرو جوانوں کو ساتھ اکٹھا کر کے نا اُس نے بڑی بڑی پر بندھک پارٹیاں بنائی ہوئی ہیں اور پتہ ہے، کہتا ہے کہ ایک دن بھارت ماتا کو پاک کر دوں گا ان سب مُسلوں کو مار کے۔''

دانستہ طور پر سمرن کور اپنا لہجہ پست کیے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود جب سبک ہوا کی مہربانی سے ہلکے زرد رنگ کا جستی پھاٹک ذرا سا ہلا اور جس طرح اس کی چولیں چرچرائیں، خوف سے سمرن کور ایک دم سہم کر بی بی کی طرف جھکی۔ اس کے برعکس جگنی چونکہ اس گفتگو کے تحت ہونے والے آئندہ ممکنہ اقدامات سے ناواقف تھی جبھی بی بی کے مقررہ اندازے کے مطابق ہر دِیے میں تیل ڈالنے کے بعد بوتل کھڑکی کے عین سامنے کنستر کے قریب ہی رکھ آئی۔

''پر سمرن پُتر! یہاں اس محلے میں تو سکھوں اور مسلمانوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے نا۔ ہم سب تو بہن بھائیوں کی طرح اس جگہ کو اپنا وطن سمجھ کر یہاں آباد ہیں۔''

''بی بی! یہ تو تم لوگ سمجھتے ہو نا۔ مگر جب سے سکھبیر نے یہاں سب کو مل جل کر رہتے دیکھا ہے، تب سے بیٹھا نتھنے پھڑکا رہا ہے۔ کہتا ہے اس محلے میں کسی مُسلے کو نہیں رہنے دے گا..... اور پتہ ہے، بے بے نے جب سے بڑے کڑاہ میں حلوہ بنایا ہے نا، تب سے گرو جی کی سوگندھ کھا کر کہتی ہوں کہ راجہ ارجن کی طرح پانڈوؤں کے رتھ میں بیٹھا کانپے جا رہا ہے۔''

بی بی کے دل کو سمرن کور کی باتوں نے زندہ کبوتر کے پوٹے کی طرح گرم کر چھوڑا تھا۔ حالات تو یوں

بھی پورے ہندوستان میں ہی مسلمانوں کے لیے خراب تھے۔ ایسے میں ایسے علاقے جہاں سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ برابری کی بنیاد پر ایک دُوجے کے مذہب، عقیدے اور قومیت کے تصور کو چھیڑے بنا رہا کرتے تھے، خال خال ہی نظر آتے تھے۔

'اور اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ بھلا کہاں جائیں گی؟' اُنہوں نے لکڑی کی چھوٹی سی پیڑھی پر بیٹھی جگنی کا معصوم چہرہ دیکھا جو لالٹین کی روشنی کی وجہ سے خوب صورتی میں کہیں بڑھ کر معلوم ہوتا۔

''میں یہ حلوہ خاص طور پر تجھے دینے اسی لیے آئی تھی تا کہ یہ بتا دوں کہ وقت اور حالات کا ہندوستان کی سرکار کی طرح کچھ پتہ نہیں کب بد سے بدتر ہو جائیں۔ بی بی! اپنا آپ سنبھال رکھیں۔''

اُس کے اس درجہ خلوص پر بی بی کے دل کے کسی گوشے سے اس کے لیے دُعا نکلی تھی۔ سکھبیر بھی سکھ تھا جو اس محلے میں موجود تمام مسلمانوں کو چُن چُن کر ختم کرنے پر تُلا تھا، مگر دوسری طرف سمرن کور اور اُس کے بے بے اور باپو بھی سکھ تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ کسی کا ناحق خون بہے اور کبھی بھی کسی بھی طور کسی بھی ہنستے کھیلتے شخص کو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے مذہب کو ماننے والا ہے۔ جنہوں نے آج شبِ معراج کی بابرکت رات کو ایک بڑے سے کڑاہ میں صرف اس لیے حلوہ بنایا ہے تا کہ حلوہ دینے کے بہانے ہر مسلمان گھرانے کو آنے والے وقت اور اپنے گھر میں اُترنے والے اس خوفناک عفریت سے خبردار کر سکیں۔

وہ عفریت جو اپنی شیطانی ذہنیت کی تسکین کے لیے مذہب کا نام استعمال کرتے ہوئے کتنے ہی دوسرے نوجوانوں کو اپنے ساتھ اس مہم میں شریک کر کے مسلمانوں کو مکھیوں کی طرح چُن چُن کر ختم کرنے میں ہندوستانی انتہا پسند تنظیموں کے شانہ بشانہ کھڑے تھے اور بھول چکے تھے کہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے کسی بھی انسان کو رُوئے زمین پر رہنے کا حق نہ دینا تو ان کے اپنے مذہب اور عقیدے کے خلاف تھا۔ نہ اُن کے کسی گرو نے اس بارے میں حکم دیا اور نہ ہی گھر کی شیلف میں سب سے اوپر رکھی ''ہانڈی'' (سکھوں کی مقدس کتاب) کے کسی پاٹ میں کوئی ایسی بات درج تھی جس کو بنیاد بنا کر وہ مورکھ اپنی کرپان کو مسلمانوں کے خون سے رنگتے جا رہے تھے۔

''فیروز احمد اور چاچے کو بھی اچھی طرح سمجھا دیں بی بی! کہ ذرا دھیان سے رہیں۔''

''بھلا ہو تیرا پُتر! اللہ تجھے خوش رکھے اور تجھ سے خوش رہے۔'' سمرن کور گھر جانے کے لیے اُٹھی تو انجیر کی جھکی ہوئی شاخیں اُس کے سر کو چھو رہی تھیں۔ بی بی کی دی گئی دعا پر مسکرانے لگی۔

''بی بی! آدھی بات تو سمجھ آتی ہے پر میں ہوئی سردارنی، پھر تمہارا اللہ مجھ سے خوش کیسے رہے گا؟''

''پُتر! عزت اور ذلت اُس کے ہاتھ میں ہے نا۔ جس سے خوش ہو کر اسے عزت دینے کا ارادہ کر لے تو کافر بھی کلمہ پڑھ لیتے ہیں، اسی طرح جیسے بعض پتھروں سے پانی کے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے اُبلنے لگتے ہیں۔''

''ہوں۔'' سمرن کور نے دونوں ہاتھ گالوں پر اور کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر بیٹھی گپلو سی جگنی کو دیکھا جو دیے جلانے کے انتظار میں اس کے جانے کی منتظر تھی۔

''مگر ہاں، ہمارے اپنے ہی اعمال کی بدولت اگر کسی کے نصیب میں ذلت لکھ دی جائے تو اس کا مسلمان ہونا بھی اس کو نہیں بچا سکتا جب تک کہ وہ اپنے اعمال کے برابر سزا نہ بھگت لے۔ پر ایک بات بتاؤں.....'' بی بی کے چہرے پر رات کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں پڑتی لالٹین کی زرد روشنی میں بڑی اُمید افزا مسکراہٹ پھیلی۔

''وہ ہے بڑا رحیم۔ ہمیں معاف کرنے کو بھی تیار رہتا ہے اور کبھی تو کسی کی صرف ایک ادا پر بھی بخش دیا کرتا ہے۔''

آخری بات سمرن کور کو متاثر کر گئی تھی۔ ہمیشہ سے اس کا دل چاہتا کہ بی بی کے ساتھ بیٹھ کر ان کی ساری باتیں سنے مگر اس امر کی صرف چاہت ہی رہی۔ سو آج بھی اُسے جانا پڑا۔

فیروز احمد اور ابا نے آج کی رات مسجد میں ہی عبادت کرنی تھی۔ یہ مسجد ایک زمانے میں کسی کا گھر ہوا کرتا تھا، جہاں اب چٹائی ڈال کر محلے کے لوگ نماز ادا کر لیا کرتے تھے۔

سکھبیر کے متعلق بتائی گئی سمرن کور کی باتوں نے بی بی کے دل میں وقتی طور پر ایک وحشت سی تو ضرور پیدا کر دی تھی، مگر آج کی رات کو وہ کسی بھی طور ربّ کی چاہت کے سوا کسی دوسرے جذبے کی نذر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے جگنی کے ساتھ مل کر دیے جلائے اور چٹائی پر کالے اور سفید چیک کا ڈیزائن دار کھیس ڈال کر ہر قسم کے وسوسے اور خدشے کو دُور کرنے کی غرض سے ایک بار پھر وضو کیا۔

لکڑی کے نقش و نگار سے مزین اپنے جہیز کی رحل پر سبز غلاف میں لپٹا قرآن پاک رکھا، سامنے اگر بتیاں جلائیں اور اپنے ربّ کے سامنے حاضر ہو گئیں۔ اگر بتیوں کی بھینی بھینی خوشبو جہاں ماحول کو متبرک بنا رہی تھی، وہیں ایک مخصوص قسم کا مقدس احساس فضا میں پھیل رہا تھا۔ آسمان پر کئی ہزار تارے بڑی خوب صورتی سے زمین کی چھت پر موجود تھے اور یقیناً اُمتِ محمدیہؐ کے نصیب پر رشک کر رہے تھے۔

جگنی ابھی مکمل طور پر صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پاک نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اس لیے ہاتھ میں موٹے دانوں والی تسبیح لیے نماز میں دہرائی جانے والی تسبیحات ہی پڑھ رہی تھی۔ بی بی آلتی پالتی مارے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں جب انہیں اپنی دائیں ٹانگ پر رکھے جگنی کے بازو کا وزن بڑھتا محسوس ہوا یعنی کہ وہ سو گئی تھی۔ سو بی بی نے بڑے احترام سے قرآن پاک بند کرنے کے بعد اسے سیدھا کرنا چاہا تھا، مگر اسی دوران اس کی ایک بار پھر آنکھ کھل گئی۔

چہرے پر عجیب حیرت اور ناسمجھی کی سی کیفیت تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے بڑی ہی بے چین اور انجان سی نظروں سے یوں اپنے چاروں اطراف دیکھا گویا کہ پہلی دفعہ اس ماحول میں آئی ہو اور شاید بی بی جان

کے چہرے سے تو قطعاً ناواقف ہی ہو۔ خود بی بی اُس کا یہ انداز دیکھ کر گھبرا کر رہ گئی تھیں۔

پہلے تو آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ ہمیشہ ہنستی مسکراتی، جاگنے والی ''جگنی'' آج جس طرح بوکھلائی اور ہونق نظروں سے یہاں وہاں دیکھ رہی تھی، لگتا تو یوں تھا کہ جیسے اسے کسی اور دنیا سے اٹھا کر ابھی اسی لمحے اس دنیا میں داخل کیا گیا ہو اور یہی وجہ ہو کہ وہ اس دنیا کو فوری طور پر قبول کرنے سے قاصر ہو۔

مگر جس طرح کالی کلیچوں کی ڈار نزدیک سے دیکھنے پر تو اپنا نہایت گہرا اثر بصارتوں پر چھوڑتی ہے، مگر وہی ڈار جب آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہونے لگے تو یہی گمان گزرتا ہے، گویا وہ حقیقت میں تو کلیچیں تھیں ہی نہیں، سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے دھبے تھے سو وہ بھی وقتاً فوقتاً دُور ہوتے جا رہے تھے۔

عام دنوں میں جلد سو جانے والی جگنی کی آنکھیں تو نیند کے باعث سرخ تھیں مگر انداز اب ایک دم بدل گیا تھا۔ تسبیح جو ابھی تک اُس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی دو اُنگلیوں میں اُلجھ جانے کی وجہ سے نیند کے باوجود اُس کے پاس ہی تھی۔ اُٹھتے ہی اُسے چوم کر آنکھوں سے لگایا اور آخر اپنے معمول کے انداز میں بی بی سے مخاطب ہوئی۔

''بی بی! آج کی رات سوہنے سرکار ﷺ عرشوں پر گئے تھے نا؟''

''ہاں پُتر! گئے تو تھے۔'' بی بی اُس کے جاگنے کے انداز پر ابھی تک اُلجھن کا شکار تھیں۔

''بی بی! عرشوں پر ایک بہت بڑا درخت ہے نا، جس پر لاکھوں، کروڑوں سے بھی زیادہ پتے ہیں؟''

بی بی کی بتائی گئی باتوں کی آج پھر وہ بی بی سے تصدیق کیوں چاہ رہی تھی؟ بس اس بات کی تو اُنہیں حیرانی تھی، مگر اُسے بولنے کا موقع دیتے ہوئے انہوں نے سر کو ہاں میں ہلایا۔

''اور کیا ہم سب کا اور آنے والوں کا نام ان پتوں پر لکھا ہوتا ہے؟''

''بالکل پُتر! کیوں نہیں؟''

''بی بی! جس کا پتا گر جائے، اس کا دنیا میں وقت ختم ہو جاتا ہے کیا؟''

''ہاں پُتر! جس بندے کے نام کا پتا پیلا ہو کر یا سبز حالت میں ہی گر جائے نا، وہ سال کے اندر اندر اس دنیا کو چھوڑ جاتا ہے۔'' بی بی نے گہری سانس لے کر جواب تو دیا، مگر ابھی تک وہ یہ نہیں سمجھ پا رہی تھیں کہ آخر ان سوالات کے پیچھے اس کا مقصد کیا ہے؟

''ابا کہتا ہے نا کہ قائداعظم کی تقریروں اور ہندوؤں کی بوکھلاہٹ سے لگتا ہے کہ کوئی انہونی بس اب ہونے کو ہے۔ پر بی بی! پھر جو ہم نے سوچا ہے کہ آتی عید کے چاند میں بھائی فیروز کی شادی کرنی ہے، اس کا کیا کریں گے؟''

''پُتر! تجھے نیند آئی ہے نا۔ تُو ایسا کر سو جا اِدھر ہی۔ میں تو آج فجر تک جاگوں گی۔'' بی بی نے اُسے تھپک کر لٹانا چاہا، مگر وہ تو اس وقت مزید سوالات کے لیے تیار تھی اور اس نے یا تو اپنی سوالات کی دُھن

میں بی بی کی بات سنی ہی نہیں تھی اور یا پھر سن کر یقیناً اَن سنی کرتے ہوئے اپنی بات کا ریشم وہیں سے سلجھانا شروع کیا تھا، جہاں سے اُس نے اُلجھایا تھا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اگر ہم بھائی فیروز احمد کی شادی کریں اور اس کا چھوٹا سا بیٹا پیدا تو ہو، مگر میری طرح اُس کا بھی پتا بالکل سبز حالت میں ہی عرشوں پر کہیں گر جائے تو بی بی! مجھے بتا کہ پھر بھائی فیروز احمد کے دل پر کیا گزرے گی؟''

اُس کی بات کی دہشت ہی کچھ ایسی تھی کہ اس غیر متوقع بات پر بی بی کا رنگ مکھن نکلے دودھ کی طرح سفید پڑ گیا۔ اُن کا جسم بے سدھ سا پڑا رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے گنے کے پھوک کی طرح ان میں کچھ نہ بچا ہو۔ جگنی نے ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو فوراً بولیں۔

''پُتر! آج کرموں اور بختوں والی رات ہے، آج کی رات دُعائیں مانگنے کی، سوہنے رب کے حضور سجدہ کرنے اور اسے راضی کرنے کی رات ہے۔ ہم کیا اور ہماری سوچیں کیا؟''

دائیں کندھے پر گردن ڈالے جگنی خاموش ہو گئی تھی۔

''آج تو بس یہ سوچنے کی رات ہے کہ وہ کیسی گھڑی ہو گی جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرشوں پر گئے ہوں گے۔ جب پہاڑ، درخت اور کائنات کی ہر چیز سجدے میں چلی گئی ہو گی۔''

''باتیں تو تیری بھی ٹھیک ہیں نا، پر مجھے تو جواب دے نا۔'' جگنی ابھی تک جواب کی طالب تھی اور ایک مرتبہ پھر دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر جمائے ہاتھوں کے پیالے میں مکھن سا سفید چہرہ دھرے ہوئے تھی۔

''مجھے بتا نا، اگر میرا پتا ہرا ہی گر جائے..... یا چل تُو پریشان ہو جائے گی میرے بارے میں سوچ کر..... یہ بتا دے کہ اگر بھائی فیروز احمد کا بیٹا ہو اور اُس کا پتا ہرا ہی گر جائے تو اُس پر کیا بیتے گی؟''

بی بی کو محسوس ہوا کہ جگنی کے ان سوالات نے ان کے جسم پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری کر دی ہے۔ جب ہی جگنی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اس پر بڑا جاندار اور بھرپور بوسہ دیا تھا۔ جواب میں بی بی کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ بالکل ایسی ہی جیسے ابر آلود موسم میں اکثر اوقات کالے سیاہ بادلوں کے درمیان سے چاند نکلا کرتا تھا۔

''بی بی! اگر تجھے پتہ چل جائے کہ ایسا ہونے والا ہے پھر بھلا تُو کیا دُعا مانگے گی؟''

''جگنی پتر! ایک بات بتاؤں تجھے؟''

جگنی کی آنکھوں میں فوراً کئی جگنوؤں کی بارات اُتری تھی۔ اپنے سوالات کا جواب ملنے کی خوشی اب اس کے چہرے پر یوں آہستہ آہستہ جمع ہو رہی تھی جیسے پھیلے ہوئے دہانوں میں سے چونچ بھر کر اَن گنت چڑیاں چار گھونٹ ایک ہی جگہ پر جمع کر دیں۔

''اوّل تو اگر مجھے پتہ چل بھی جائے نا تو بھلا بتا میں گلیاں دا روڑا کوڑا کر بھی کیا لوں گی؟ جس کی چیز ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ پر دل کو خوشی ضرور ملے گی کہ اگر میرے خون کا قطرہ کسی بھی نسل میں رواں ہوتے ہوئے وہ درجہ پا کر دنیا سے جائے جس کی تمنا عرشوں پر جانے والے نے بھی کی تھی۔''

''وہ کیا بی بی؟.....ایسی کیا تمنا کی تھی سوہنے سرکار (ﷺ) نے؟''

''پتہ ہے جگنی! شہیدوں کا رُتبہ اتنا بلند ہے کہ عرشوں کے دُولہا نے بھی ایک دفعہ یہ خواہش کی تھی۔''

بی بی کی بات پر جگنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سینہ، اس کا دماغ یک لخت جگمگانے لگے ہوں۔ کواڑوں کے چرچرانے اور سیلے کمروں سے آتی جھینگر کی مسلسل آوازیں بھی خوب صورت لگنے لگی تھیں۔ ڈھاکہ کی ململ سا نرم و ملائم چہرہ مزید پھولوں سا لگنے لگا اور خود پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

''پر یہ تو بتا، تُو کیوں پوچھ رہی ہے یہ سب؟''

''بی بی! میں نے ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے پتہ ہے کیا دیکھا؟''

''کیا دیکھا؟''

''میں نے دیکھا جیسے میں نا بھائی فیروز احمد کے بیٹے کے ساتھ کسی سرسبز اور خوبصورت جگہ پر موجود ہوں، بہت خوش۔ بہت ہی زیادہ خوش۔ وہاں خوب صورت چہرے والے اور بھی بہت لوگ ہیں بی بی! اور وہ کہتے ہیں کہ تم تو خوش قسمت ہو کہ ہمارے ساتھ یہاں آ گئی ہو۔ پرنا وہ کہتے ہیں کہ جو بھائی فیروز احمد کا بیٹا ہے نا، وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے اس لیے کہ وہ اپنے گھر کے دوسرے لوگوں کو بھی یہاں لے آئے گا۔'' بی بی دم بخود بیٹھی اُس کی بات سن رہی تھیں۔

''لیکن پتہ نہیں کیوں بی بی! مجھے ایسا لگا جیسے وہ خاب نہیں تھا، سچی میں جسے میں نے جاگتی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ حالانکہ اصلی میں تو تیرے پاس ہی سو رہی تھی نا۔''

جگنی اب کسی اُلجھن کا شکار تھی۔ مگر بی بی یقینی طور پر اس بات کی تہہ تک پہنچ چکی تھیں۔ سر اُٹھا کر تشکر آمیز بھیگی نظروں سے اوپر دیکھا تو نظریں تاروں پر رُکنے کے بجائے آسمان کو مس ہوتی محسوس ہوئیں۔

جگنی کا ذہن، اس کے خیالات، جسامت کسی بھی طور اس کی عمر سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ اس پر آج برکتوں والی رات میں دیکھا گیا یہ خواب۔

''بی بی!''

''بول پُتر!''

''اگر میرے نام کا پتّا سبز ہی ہو اور گر جائے نا تو دیکھ روئے گی تو نہیں نا؟'' یہ آج اسے کیا ہو گیا تھا، کیسی باتیں کر رہی تھی؟ بی بی نے اسے جی بھر کے دیکھنا چاہا مگر اس کے چہرے پر آج گویا نظر پھسلتی ہی تو جا رہی تھی۔ باوجود خواہش کے وہ اسے دیر تک نہ دیکھ پائی تھیں۔

''بتانا، دل چھوٹا نا کریں۔''

بی بی کو آج جگنی میں اس الہڑ دوشیزہ کی جھلک نظر آئی تھی جو شادی سے ایک دن پہلے ماں کے ساتھ گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر اپنا خیال رکھنے اور اس کی یاد میں آنسو نہ بہانے کی تلقین کر رہی ہوتی ہے۔ مگر دل میں نئی زندگی کی اُمنگ کے ساتھ ساتھ جان سے پیارے رشتوں کو پل بھر میں چھوڑ جانے پر غمگین بھی ہوتی ہے۔

''تُو میری فکر نہ کر، پیدا کرنے والا میرے ساتھ ہے۔'' بی بی مسکرائیں تو وہ بھی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

''جا..... جا کر ایک بار پھر وضو کر اور تسبیح لے کر پڑھ۔'' اُس رات جگنی کی باتوں نے بی بی کی دعاؤں کے دھارے کو ایک نئی سمت دکھا دی تھی۔

اگست کے دوسرے ہفتے میں اگر کوئی بی بی سے رات کے یخ ٹھنڈی ہونے کے بارے میں کہتا تو شاید وہ حیرت سے تکتیں مگر آج تو انہیں خود شملہ کی طرف برف پوش پہاڑیوں سے ٹھنڈی ریڑھ توڑ ہواؤں کا ریلا سا آتا محسوس ہو رہا تھا، سیاہ مرمر جیسی ٹھنڈی رات میں ایک عجیب پُرسکون سا احساس تھا۔

جگنی ایک مرتبہ پھر تسبیح ہاتھ میں لیے سو چکی تھی۔

بی بی نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ سے تسبیح علیحدہ کر کے جزدان میں رکھی اور تمام تر توانائی اکٹھی کر کے سوئی ہوئی جگنی کو کندھے پر ڈال کر ڈیوڑھی میں موجود اپنے نواڑی پلنگ پر ڈالنے کے بعد اوپر کھیس اوڑھا دیا۔

جگنی کی باتیں ابھی تک بی بی کے ذہن میں موجود اور تازہ تھیں۔

دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھنے کے بعد چند لمحے اس کی کہی ہوئی باتوں کو سوچا تو دو رویہ ٹریفک کی طرح خیالات اور جذبات ایک جگہ پر، ایک سمت کی طرف جمع ہو کر نہ دیئے۔ کبھی افسردگی سے آنکھیں بھیگتیں تو کبھی تشکر سے۔

یوں بھی بی بی ان لوگوں میں سے تھیں جو دعا کو بھی عین عبادت سمجھتے ہوئے کتنا ہی ٹائم بس رب سوہنے کے آگے جھولی پھیلائے مانگتے رہنے کو ہی اپنے لیے بخشش کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جن کا روحانی عقیدہ مکمل طور پر یہی ہوتا ہے کہ دعائیں بھی پیتل کے برتن کی طرح ہوتی ہیں۔ ذرا سی بے توجہی جن پر مایوسی کی کائی چڑھانے لگتی ہے۔ اسی لیے رب سوہنے کے دربار میں دعاؤں کے اس برتن کو جتنی بار مانجھا جائے گا، چمک دمک اسی قدر زیادہ ہوں گی۔ اور یوں بھی دعا کے مانگنے کی ہماری زندگی میں اسی قدر اہمیت ہے جتنی جسم میں دماغ کی۔

اسی خیال کے تحت بی بی نے سب سے پہلے قرآن پاک کا بوسہ لیا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے۔

''عرشوں پر جانے والے سوہنےؐ کے سوہنے ربّا!.....تُو ایک ہی ہے جس سے ہم مانگتے ہیں اور بے شک بس تُو ہی دینے والا ہے مالک! تیری یہ کوجی، نکمّی اور کسی نہ کم جوگی حقیر سی بندی آج کرموں اور بختوں والی رات میں تیرے آگے سوالی بن کے بیٹھی ہے۔ میں گلیاں دا روڑا کوڑا، محل چڑھنے کی کوئی آرزو تو نہیں، پر سوہنیا! میرے اور میری آنے والی نسلوں کے بھاگ جگا دے مالک! میری موجودہ اور آنے والی تمام نسلوں کے ایک ایک کو اپنی راہ میں قربان ہونے کے لیے چن لے۔ اور پھر ہم نکمّوں کی یہ قربانی پسند کر لے۔ تیرے محبوبؐ کے نواسوں کی سنت پر چلا کر ہم میں سے ایک ایک کو اپنے رستے میں قربان ہونے کا ایک واری موقع دے۔ ہماری نسلوں میں اضافہ فرما تا کہ ہم اپنی اولادوں کو تیری رضا پر قربان کریں۔ نصیب جگا دے سوہنیا ربّا! عرشوں پر جانے والی سرکارؐ کے صدقے۔''

بی بی کی آنکھیں فرطِ احترام سے بند تھیں۔ چہرہ تاروں کو نظر انداز کیے صرف آسمان کی طرف اُٹھا ہوا تھا۔ آنکھوں سے بہتے مسلسل آنسوؤں نے بی بی کو یہ تک احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ بند آنکھوں سے راہ بنا کر بہنے والے آنسوؤں نے ان کے چہرے کو دھو کر پیتل کے برتن کی طرح دعاؤں کے اثر سے کسی قدر روشن بنا دیا ہے۔ مگر وہ کیا جانتیں کہ وہ تو اس وقت سراپا دعا تھیں۔ ان کی سانس، دھڑکن اور جسم کا رواں رواں سوہنے رب کے حضور سوالی بنا بیٹھا تھا۔

'ہم جیسے گناہ گار یقیناً اس قابل نہیں یا رب! کہ تجھ سے یا عرشوں پر جانے والی پاک ہستیؐ سے محبت کا دعویٰ کر سکیں۔ پر تیری محبت ڈھونڈتے ہوئے اگر یہ جان قربان ہو تو.....اور پھر کیا چاہئے؟''

بی بی کتنی ہی دیر بیٹھی صرف دعا مانگتی ہی رہتیں۔

❀---❀---❀

گلی میں اُٹھنے والے شور و غوغا سے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کے لیے ایک نئی ارضِ پاک وجود میں آ گئی ہے۔ پاکستان .....جو صرف ذہن اور نیت کے پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ ہو گی اور جہاں کوئی بھی دوسرا متبادل قابلِ قبول نہیں ہو گا۔

فوراً سجدۂ شکر بجا لانے کے بعد بی بی نے چھت پر جا کر دیکھا تو ایک عجیب جشن کا سماں تھا۔ گلیوں میں لالٹینیں ہی لالٹینیں تھیں۔ لوگ ایک دوسرے سے گلے بھی مل رہے تھے اور مبارکبادیں بھی دے رہے تھے۔ لیکن وہیں بی بی کی سماعتوں سے یہ بات بھی ٹکرائی کہ فسادات میں تیزی آ گئی ہے۔ اور مسلمانوں کو چُن چُن کر شہید کیا جا رہا ہے۔ غور کرنے پر یہ بھی محسوس ہوا کہ سامنے موجود لوگوں میں سکھ برادری کے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں، ذہن میں سمرن کور کی بتائی ہوئی باتیں اور ہاتھ میں کرپان اور سر پر کشمیری ڈونگے جیسی پگڑی باندھے سکھبیر سنگھ کا ہیولا اُبھرا، یعنی وہ جو پہلے ہی اس محلے میں مسلمانوں کے یوں آباد ہونے کا جان کر چراغ پا تھا، اب تو اُس کے غصے کو مزید ہوا لگی ہو گی۔

فیروز احمد لمحہ بھر کے لیے گھر آئے، بی بی کو قیامِ پاکستان کی خبر دی اور ایک بار پھر باہر چلے گئے۔ آج کی رات تو بلا شبہ ویسے ہی ہزار ہا راتوں سے افضل تھی اس پر آج اُن کی زندگیوں میں آنے والا عظیم انقلاب بھی اسی رات سے آ منسلک ہوا تو سب کی خوشیوں اور شکر گزاریوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ اور یوں یہ رات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی۔

سکھبیر اسی رات واپس روانہ ہو گیا تھا اور یہ جان کر کہ گورداسپور، ہندوستان میں شامل ہوا ہے، اُس کی خوشیاں انتہا پر تھیں۔ بار بار کہتا کہ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ ان سے ان کی جنم بھومی چھین لے۔ اور اگر گورداسپور کو پاکستان میں شامل کیا جاتا تو وہ خون کی ندیاں بہا دیتا۔ یوں بھی سکھبیر سنگھ کی بات میں بڑا وزن اس لیے بھی خیال کیا جاتا کہ وہ انتہا پسند ذہنیت کا مالک تھا اور گورداسپور میں موجود کئی لوگوں کے ساتھ مل کر مختلف اوقات میں کتنے ہی مسلمانوں کو شہید کر چکا تھا اور اب اُس کی نظر اس محلے پر تھی، جہاں اُس نے بارات لانی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس زمین پر مذاہب کی ''ملاوٹ'' نظر آئے۔ ادھر سارے ملک میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ سکھبیر سنگھ جلد ہی واپس آنے کا کہہ کر لدھیانے واپس چلا گیا تھا۔

پاکستان بنے کوئی بیسواں یا بائیسواں روز تھا۔ قتل و غارت اپنے عروج پر تھی۔ اُن کے اپنے محلے سے کئی مسلمان شہید ہو چکے تھے۔ چند سکھ برادری کے لوگ بھی اسی دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

جگنی لوہے کے جنگلے سے لگی ڈیوڑھی میں بیٹھی کپڑے کی گڑیا سی رہی تھی۔ فیروز احمد اپنے ابا کے ساتھ گھر سے باہر تھا جب بی بی کے کانوں میں یہ روح فرسا خبر پڑی کہ جگنی کے ابا کو کسی نے قتل کر ڈالا ہے۔

بی بی کو اپنے ہاتھ پاؤں یک لخت ساتھ چھوڑتے محسوس ہوئے۔ سمرن کور کا بھائی جستی پھاٹک عبور کیے اُن کے صحن میں کھڑا تھا۔

''میں خود بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ پر جگنی کا ابا وہیں پڑا ہے، برما روڈ پر۔ اور اُس کے خون سے ساری اینٹیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

''اور فیروز احمد؟'' بی بی نے پوچھا۔

''اُسے تو میں نے نہیں دیکھا۔ پر غارت گروں، لٹیروں نے چاچے کو قتل کر دیا ہے۔ جتنے لوگ تھے نا، سب مارے گئے ہیں بی بی! ایک دُوجے کے اوپر نیچے بس لاشیں ہی لاشیں رکھی ہیں۔'' بوکھلاہٹ میں ارمندر سنگھ جلدی جلدی بی بی کو تفصیل بتا رہا تھا۔

''تُو جا، جا کر سمرن کو ذرا بھیج۔ میں جگنی کے ابا کو تو لے آؤں۔''

''بی بی! پاگل نہ بن۔ تُو اکیلی عورت ہے۔ لاشوں کی منڈی لگی ہے وہاں۔ بھلا کیسے ڈھونڈے گی اور کیسے لائے گی؟''

''تُو جا میرا پُتر! سمرن کو بس بھیج دے یہاں جگنی کے پاس۔''

اُس کی بات پر قطعاً کوئی بھی دھیان دیئے بغیر بی بی نے ایک بار پھر اپنی کی ہوئی بات دہرائی اور اس کا کوئی بھی جواب سنے بغیر لکڑی کے بڑے سے صندوقچے پر رکھی جائے نماز کی طرف توجہ ہو گئیں کہ یقیناً وہ سب سے پہلے رب سوہنے کے حضور شکرانے کے دو نفل پڑھنا چاہتی تھیں جس نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے ان کے سرتاج کو اپنی راہ میں قربان ہونے کے لیے چنا تھا۔

آنکھوں میں دل سے ہوتے ہوئے آتے موٹے موٹے آنسوؤں پر بی بی نے لمحہ بھر میں کئی قسم کے قفل لگا رکھے تھے۔

سمرن، جگنی کے پاس تھی اور بی بی اپنے تئیں کوشش کرتے ہوئے برما روڈ تک تو جیسے تیسے پہنچی تھیں، مگر یہ حقیقت پتھر چاٹی تلوار کی طرح ان کے وجود کے آر پار ہو گئی کہ ان نامرادوں نے صرف اُن کی جانیں ہی ختم نہیں کیں، بلکہ کسی طرح ان فانی اجسام کو بھی اُٹھا کر کہیں دُور جا پھینکا تھا۔ تاکہ ان کے پیارے یوں اچانک ان کے دُور ہو جانے اور آخری دیدار تک سے محروم ہو جانے کی اذیت عمر بھر کے لیے اپنے سینوں میں محسوس کریں۔ مگر بی بی کا ایمان تھا کہ جگنی اور فیروز احمد کے ابا شہید ہیں اور تا قیامت زندہ ہیں۔ اس لیے رب کی رضا میں راضی ہوتے ہوئے الحمدللہ کہہ کر واپس ہو لیں۔

محلّہ بھگوان داس میں چند دن گزارنے کے بعد واپس جانے والے سکھبیر سنگھ نے جو وعدہ اپنے آپ سے کیا تھا، بی بی کی غیر موجودگی میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس وعدے کو نبھانے کے لیے ایک بار پھر محلّہ بھگوان داس آ پہنچا۔ جہاں پورے ملک میں امن و امان کی مخدوش صورتِ حال کے باوجود سکھ اور مسلمان برادری ایک دوسرے کے لیے دلوں میں مثبت جذبات رکھتی تھی۔

سکھبیر کے واپس آنے کی اطلاع پر سمرن کو ڈرتے ڈرتے اپنے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔ جگنی اب فیروز احمد کی موجودگی کی وجہ سے تنہا نہ تھی۔ بی بی نے تھکے ہوئے قدموں اور بھاری وجود کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ ڈیوڑھی میں جا کر سیاہ برقع اُتارا تو فیروز احمد اور جگنی دونوں ان کے قریب چلے آئے۔ جگنی سینے سے چمٹی تو فیروز احمد ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر خود نیچے جا بیٹھا۔ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آوازوں میں دونوں ہی رو رہے تھے۔ دونوں کی سسکیاں نلکے میں پانی کی اٹکی ہوئی بوند کی طرح صرف حلق ہی میں زندہ تھیں۔

بی بی جانتی تھیں کہ یہ ایک فطری عمل تھا۔ اسی لیے دونوں کے سر پر ہاتھ ضرور پھیرتی رہیں، مگر خاموش ہونے کا اس لیے نہ کہا کہ صدمے کی حالت میں آنسوؤں کا بہہ نکلنا بھی سوہنے رب کی ایسی نعمت ہے کہ جس سے غم میں کمی تو واقع نہیں ہوتی، مگر دل کی شریانیں رونے کی صورت میں تیزی سے کام سرانجام دینے کی وجہ سے مضبوط ہو جاتی ہیں اور کسی بھی صدمے کو بہتر طریقے سے برداشت کر پاتی ہیں۔

خود بی بی نے چند ثانیے کے لیے گہری سانس خارج کرتے ہوئے اتنی شدت سے ہونٹ بند کیے کہ جب ہونٹوں میں دراڑ پڑی تو ان کی سطح پر سفید سفید لکیریں پڑی تھیں۔

کتنے ہی لمحے خوشی اور غم کے امتزاج بھرے جذبات میں گزرے۔ آخر کار جگنی اُن کے سینے سے لپٹی اور بولی۔

''بی بی!.....ابا چلے گئے نا.....ظالموں نے مار دیا انہیں۔'' اس سے آگے وہ کچھ بھی بول نہیں پائی تھی۔ شدتِ ضبط کے باعث ہونٹ اور ناک کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ دودھ، مکھن سے پلی جگنی کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں سوج کر اپنے حجم سے دُگنی ہوگئی تھیں۔

بی بی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، سیدھی مانگ کے باعث کتنے ہی ننھے ننھے بال گھاس کی طرح دوسرے بالوں سے الگ نظر آرہے تھے۔

''نہ پُتر! رو نہ.....بس یہ سوچ کر خوش ہو جا کہ اللہ نے اُنہیں پسند کر لیا تھا، اسی لیے کبھی نہ مرنے کے لیے ہم سے جدا کر دیا۔''

''کبھی نہ مرنے کے لیے بی بی؟'' جگنی حیران ہوئی تو آنکھوں کے کٹوروں میں آنسو چھلکتے چھلکتے رہ گئے۔

''تو اور کیا۔ اس دنیا سے تو وہ چلے گئے، پر ایک دوسری دنیا میں یہاں سے کئی درجے بہتر زندگی گزاریں گے؟''

''سچ بی بی؟''

''ہاں پُتر!.....وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں نا۔ یعنی اللہ کو پیارے لگے تھے تو اُس نے تیرے ابا کو اپنے پاس بلا لیا۔''

''بی بی!.... پر میں چھوڑوں گا نہیں ان لوگوں کو، تُو دیکھنا۔'' پہلی مرتبہ فیروز احمد بولا تو لہجہ گلوگیر ہی تھا۔

''بالکل پُتر!.....کیوں نہیں.....ظلم برداشت کر کے ہم نے ظالموں کی پرورش تھوڑا ہی کرنا ہے؟''

بچے ایک ننھے منے نرم سے پودے کے مانند ہوتے ہیں، جس طرف رُخ موڑ دو، اسی انداز میں بڑھنے لگتے ہیں۔ بی بی نے بھی اُس دن ان دونوں کو بڑے پُر اثر انداز میں سمجھایا، وضو کروانے کے بعد اپنے ساتھ کھڑا کر کے اس بات پر شکرانے کے دو نفل پڑھوائے کہ ہمیں شہید سے نسبت ملی۔

اُس رات لالٹین میں تیل کم تھا اور وہ بھک بھک کر کے اچانک جل اُٹھتی اور ایک دم ہی بجھ جاتی۔ فضا میں حبس اتنا تھا کہ گرمی زبان نکالے شکاری کتے کی طرح ہانپے جا رہی تھی۔ شہد کے خالی چھتے کے ٹکڑوں کے مانند بی بی کے خیالات یہاں وہاں بکھرے جا رہے تھے۔ جگنی کے ابا سے اپنی ہونے والی شادی سے لے کر آخری دفعہ ان کے گھر سے نکلنے تک کے واقعات درزی کی کترنوں کی طرح جابجا ان کے ذہن میں بغیر کسی ترتیب کے موجود تھے۔

جگنی اور وہ ایک ہی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھیں۔ بی بی کا بازو جگنی کے سر تلے تھا۔ دائیں کروٹ پر

لیٹی گل گوتھنی سی جگنی کے ساتھ اب بی بی کو یہ پلنگ تنگ محسوس ہوتا تھا۔ مگر دونوں کی بھی یہ مرضی تھی کہ کروٹ پر لیٹے لیٹے ہی ساری رات بے تابی تو منظور ہے، مگر اکیلے سونا نہیں۔ یہ الگ بات تھی کہ اس سارے پیار محبت کے کھیل میں جگنی تو بڑے مزے سے جب چاہتی کروٹ لیتی اور جب چاہتی چت لیٹ جاتی۔ البتہ بی بی اسے آرام پہنچانے کے خیال سے اکثر اوقات تمام رات یوں گزارتیں کہ ان کی کمر مسلسل پائینتی پر رہنے کی وجہ سے صبح تک اینٹھ جاتی۔ سو آج بھی جب جستی پھاٹک پر کھٹکا محسوس ہوا تو جگنی اُن کی طرف رُخ کیے دائیں بازو اور ٹانگ اُن پر رکھے ہوئے تھی۔

پہلے تو بی بی اس کھٹکے کو کسی راہ گیر کے اچانک ڈنڈا لگنے کو تعبیر کرتی رہیں کہ رات کے وقت گھر سے نکلتے ہوئے ہر شخص ہاتھ میں کوئی بانس یا ڈنڈا ضرور لے کر نکلتا۔ مگر اس وقت بی بی چوکنّی ہو کر اُٹھ بیٹھیں جب جستی پھاٹک کے اُس پار سے سرگوشی نما پکار سنائی دی۔

''بی بی! دروازہ کھول۔ میں ہوں، ارمندر سنگھ۔''

ارمندر سنگھ کی آواز پر بی بی کا چونکنا لازمی تھا۔ سو جلدی سے جگنی کو خود پر سے ہٹا کر پہلے اپنے جنگلے کے اندر والے قفل میں چابی ڈال کر اسے کھولا اور پھر سر پر چادر درست انداز میں موجود ہونے کا یقین کرتے ہوئے بڑے بڑے قدم لے کر جستی پھاٹک کا بھی جیسے ہی قفل کھولا، چولوں کی چرچراہٹ سنائی دی اور کنڈے پر ہاتھ رکھے دباؤ سے اسے کھول کر ارمندر سنگھ اُن کے گھر آن موجود ہوا۔

''خیر تو ہے نا بھائی دلیر سنگھ! اس وقت؟'' بی بی نے ارمندر کے ساتھ موجود اس کے والد کو مخاطب کیا۔

''سکھبیر کے سر پر خون سوار ہے بہن جی! محلے کے مسلمانوں کو وہ اور اس جیسے دوسرے کتے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اِک کم کرو، فیروز احمد اور جگنی کو لے کر ارمندر کے ساتھ چھت سے ہوتے ہوئے ہمارے گھر چلے جاؤ۔ رات جیسے تیسے گزرے تو صبح میں آپ کو پاکستان جانے والی ٹرین تک پہنچا آؤں گا۔''

''لیکن بھائی جی.....!''

''وقت ضائع نہ کرو بہن جی! اور نکلنے کی تیاری کرو۔''

عجلت میں بات کرتے ہوئے باہر نکلنے پر وہ ایک مرتبہ پھر مڑا۔

''اندر سے جندرا (تالا) لگا جانا اور ذرا جلدی..... وہ لوگ اس طرف آنے ہی والے ہیں۔''

دلیر سنگھ نے باہر نکل کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر سے گلی کے اندھیرے میں گم ہو گیا کہ جستی پھاٹک کی اندرونی سائیڈ پر لگے سیاہ قفل میں چابی گھومنے کی آواز سے اسے کچھ اطمینان ضرور حاصل ہو گیا تھا۔

بی بی نے الوادعی نظروں سے انجیر کے درخت کی نیچے کو جھکتی ڈالیوں کو دیکھا تو ایک ایک کر کے چند پتے خود بخود ٹوٹ کر زمین پر آ رہے۔ چھت کے بڑے بڑے کنگرے، صحن کی سرخ سرخ اینٹیں جنہیں اکثر جگنی بالٹی میں پانی ڈال کر ایک ایک مگے سے گیلا کرتی اور مزید سرخ ہونے پر دیر تک انہیں بیٹھ کر دیکھا

کرتی۔ ڈیوڑھی کا جنگلا، ہر ہر چیز پر الوداعی نظر ڈالنے کے بعد وہیں صحن میں کھلے آسمان تلے کھڑے کھڑے بی بی نے بڑے جذب سے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''ربا سوہنیا! تیرا شکر ہے اور میں خوش ہوں کہ تیرے سوہنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح آج مجھے بھی ہجرت کا حکم ہوا ہے۔ اے تمام عرشوں کے مالک! میرا گھر بار، سکھ چین، جان مال سب تیری رضا پر قربان..... تیرا شکر ہے عرشاں والیا کہ تُو نے مجھ جیسے گلیاں دے روڑے کُوڑے کو بھی اس قابل جانا۔ تیرا احسان ہے مالک!''

احساسِ تشکر سے آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو بی بی نے ہمیشہ کی طرح ضائع کرنے کے بجائے اپنے پورے چہرے پر پھیلا کر وہی ہاتھ سینے پر لگا لیا تھا۔ اُن کا ماننا تھا کہ رب سے عرض کرتے وقت نکل آنے والے آنسو سر آنکھوں پر سجانے کے قابل ہوتے ہیں۔ روزِ آخرت انہی کی برکت سے یہ سینہ اور چہرہ ایمان کا نور پائے گا۔

وہ جگنی اور فیروز احمد کو ارمندر سنگھ کے ساتھ چھتوں کے راستے ان کے گھر لے کر پہنچیں تو سمرن پہلے سے ان کی منتظر تھی۔ کمروں سے ہوتی ہوئی آخری کوٹھڑی جو کہ عموماً گندم اور دوسرا اناج رکھنے کے کام آتی تھی، وہاں ان تینوں کو بٹھایا ہی تھا کہ دروازے کے وحشیانہ انداز میں بجنے پر کانپ کر رہ گئیں۔ کمروں کی بناوٹ اس طرح کی تھی کہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر تیسرے چوتھے میں پہنچنا ممکن تھا۔ سارے کمرے برآمدے کے بعد سامنے قطار میں موجود تھے البتہ کوٹھڑی واحد جگہ تھی جس کے آگے ایک کمرہ تھا۔ مگر اس کے باوجود باہر سے آتی آوازیں انہیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جن میں سکھبیر کا وحشیانہ انداز بلاشبہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''او کیہ گل آپُتر! سب خیر؟''

دلیر سنگھ نے دروازہ کھول کر سکھبیر سے پوچھا جو اس دفعہ ان کا مہمان تو نہیں بنا تھا مگر رشتے داری بہر حال ضرور تھی۔

چاند کی سفید روشنی میں باہر کھڑے نوجوانوں کی کرپانیں ہی کرپانیں نظر آ رہی تھیں۔ بلکہ پل بھر کو تو دلیر سنگھ کو لگا جیسے ہر ایک نے ہاتھ میں دو کرپانیں اُٹھا رکھی ہیں۔

''بی بی اور اس کے بچوں کو تُو نے شرن دیا ہے چاچا؟''

''میں نے؟..... لو بھلا میں کیوں کسی مُسلے کو اپنے گھر شرن دوں گا؟..... لگتا ہے آج تجھے زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔'' دلیر سنگھ نے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔

''چاچا!..... یہ جتنے گبھرو دیکھ رہا ہے نا تُو، یہ سب گرو جی کی سوگندھ اُٹھا کر نکلے ہیں کہ ان مُسلوں سے ہر جگہ صاف کر کے چھوڑیں گے۔ ہونہہ، بڑے آئے مُسلے..... گلیوں کا روڑا (کچرا)۔'' بات کر کے

اس نے فوراً تھوکا تھا۔ سکھبیر کے انداز پر باقی سب بھی زوردار انداز میں ہنسے تھے۔

''وہ تو تیری بات ٹھیک ہے پر.....''

''پر چاچا!..... مجھے تیری بات کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔'' سکھبیر نے دلیر سنگھ کا چہرہ پڑھتے ہوئے کہا تو سفید لٹھے کی دھوتی اور قمیض پہنے بڑی بڑی مونچھوں والے اس کے ساتھی نے ٹہوکا دیا۔

''باتوں میں وقت برباد نہ کر سکھے! اب ہم بھی آزاد ہیں۔ چل ان کے گھر کی تلاشی لے۔''

''سکھوں کے ہاتھوں ایک سکھ کے گھر کی تلاشی؟..... میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔'' دلیر سنگھ اُن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''میں بھی ایک غیرت مند آدمی ہوں سکھے! میرے گھر میں بھی عورت ذات بیٹھی ہے۔ اور سوگندھ ہے مجھے گرو جی کی کہ تم میں سے کسی کو اندر قدم نہیں رکھنے دوں گا۔'' بات کرنے کے ساتھ ہی دلیر سنگھ دروازے کے عقب میں رکھی اپنی کرپان لینے کو جونہی مڑا، برف سے ٹھنڈی نکیلی چیز اسے اپنی کمر میں پیٹ تک دھنستی محسوس ہوئی اور چند ہی لمحوں میں دلیر سنگھ اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔

نوک دار کھسّوں کی چیں چیں صحن سے ہوتی آہستہ آہستہ کمروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بی بی کی ایک طرف جگنی اور دوسری طرف سمرن کور چپکی ہوئی تھیں۔ فیروز احمد، ارمندر سنگھ کے ساتھ ان دونوں کو یہاں چھوڑ کر اور اپنے تئیں نہایت محفوظ خیال کرتے ہوئے اسی محلے میں موجود ایک اور مسلمان خاندان کی طرف روانہ ہوا تھا، تاکہ کسی طور اُنہیں اس محلے سے نکال کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ کیا جا سکے۔

مگر وہاں تک پہنچنے میں یقیناً اُنہیں تاخیر ہو چکی تھی۔ سکھبیر اور اس کے ساتھ پانچ افراد اس کنبے کو کرپانوں کے زخم لگا لگا کر اب اس دنیا سے رخصت کر چکے تھے۔ البتہ ان کے قدموں کی چاپ سنتے ہی کپڑوں کے صندوق میں گھس جانے والی پندرہ سالہ صبیحہ جو ابھی زندہ تھی اور وہاں کھڑے ہو کر کی جانے والی ان دونوں کی گفتگو سن کر پسینے سے شرابور باہر نکلی تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔ چھپتے چھپاتے کسی طرح اسے ریلوے اسٹیشن تک پہنچا کر جب وہ دونوں واپس لوٹ رہے تھے تو انہیں اس بات کا اطمینان تھا کہ بی بی اور جگنی تو محفوظ ہی ہیں، مگر وہ صبیحہ کو بھی ایک محفوظ مقام پر چھوڑ آئے ہیں۔ جہاں ارمندر کے دُور کے رشتے دار نے فیروز احمد کے اپنی والدہ اور بہن کو لے آنے تک اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔

قیامت تو تب ٹوٹی جب واپس اپنے محلے میں صبح کی چمک دار روشنی میں آئے تو اپنے ہی محلے کو پہچان نہ پائے۔ سکھبیر اور اس کے ساتھی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر لوٹے تھے۔ دھڑکتے دل اور تھمی ہوئی سانسوں کے ساتھ ارمندر کے گھر میں داخل ہوئے تو دلیر سنگھ کی دروازے کے پاس ہی موجود لاش ان کے اوسان خطا کر گئی۔ سمرن کور کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جبکہ جگنی کا ساکت جسم سامنے رکھے بی بی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھتی اور مہندی لگی ہتھیلیوں پر اپنے ناتواں ہاتھ پھیرتی جاتی

تھیں۔ ارمندر سنگھ یہ سب دیکھ کر پاگل سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ سو اُن کو الوداع کہہ کر خنجر اور کرپان لیے گھر سے نکل گیا۔

''بی بی!..... یہ کیا ہو گیا سب؟''

''فیروز احمد!..... تُو آ گیا ہے پُتر.....!'' وہ چونکیں۔

چہرے پر مکمل سکوت، مگر آنکھوں میں سرخی کے ڈورے لیے کئی گھنٹوں کے بعد اب انہوں نے جگنی پر سے نظر ہٹائی تھی۔

''بی بی!..... تھوڑا سا رو لے..... تیرا دل ہلکا ہو جائے گا۔''

آنسوؤں کا پھندا فیروز احمد کو اپنے گلے میں پھنستا محسوس ہوا تو انہیں کہتے کہتے خود ہی رو دیا۔

''پر کیوں روؤں؟..... شہید ہوئی ہے میری جگنی۔ مری تو نہیں پُتر!..... تو بھلا بتا میں روؤں تو کس بات پر؟..... میں شکر کیوں نہ کروں سوہنے کا، جس نے اسے امر کر دیا۔ یہاں نہ سہی، ایک اور دنیا میں سہی۔''

''تیرا کلیجہ پھٹ جائے گا بی بی!..... نہ کر اتنا صبر۔''

فیروز احمد اتنے مضبوط اعصاب کا مالک نہ تھا، اسی لیے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش بھی نہ کی۔ یوں بھی پہلے باپ اور اب پھولوں جیسی بہن کا اس قدر کرب آمیز انداز میں خود سے جدا ہونا اس کے نزدیک دنیا بھر کے دُکھوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔

''دل چھوٹا نہ کر پُتر! اور تُو بھی صبر کر۔ جو صبر کر گیا، وہ تر گیا (پار اُتر گیا)۔ اور پھر پُتر! یہ تو پیغمبروں کی صفت ہے نا، اگر رب سوہنا ہمیں اپنی کوبجی اور سوعیبوں والی ذات کو اس رنگ میں رنگنے کا موقع دیتا ہے تو کیوں ان آنسوؤں اور شکوؤں سے یہ موقع گنوا بیٹھیں۔''

فیروز احمد نے اپنی عظیم ماں کو بڑی عزت و تکریم سے دیکھا۔ ماں تو سب کے لیے ہی دنیا میں سب سے عظیم رشتہ اور ہستی ہوتی ہے۔ مگر فیروز احمد کو لگتا تھا کہ اس کی یہ درویش صفت ماں جیسی شاید کسی اور کی ماں نہ ہو گی۔

''اگر رونا ہی ہے تو یہ سوچ کر روؤ کہ کربلا کے میدان میں بی بی زینب رضی اللہ عنہ کے دل پر کیا بیتی ہو گی۔ تب اگر آنسو نہ نکل آئیں تو ایسی آنکھوں سے بندہ اندھا ہی بہتر۔'' فرطِ جذبات سے فیروز احمد نے پہلے بی بی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر آنکھوں سے لگا لیا۔ محلے میں کوئی مسلمان گھرانہ تو دُور کوئی مسلمان شخص تک نہ بچا تھا۔ ایسے میں چند سکھ گھرانوں نے ایک بار پھر کسی بھی قسم کے خوف کو رد کرتے ہوئے جگنی کی تجہیز و تکفین میں فیروز احمد کی مدد کی۔ ان ہی کی زبانی فیروز احمد کو پتہ چلا کہ سکھبیر نے انہیں چھت کے راستے جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے دلیر سنگھ کو بھی انہیں پناہ دینے کے جرم میں مار ڈالا۔ اپنے علاوہ سب کو حقیر جاننے والے سکھبیر سنگھ کا کہنا تھا کہ سارے مُسلے اس بستی میں بستے ہیں۔ اس کے نزدیک گلیوں کے

روڑے کوڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اور وہ اب یہ دھرتی ماتا صاف کرنے نکلا ہے۔

اور یہ قصہ صرف اسی جگہ کا نہیں تھا۔ کہیں سکھ تو کہیں ہندو خود کو برتر ثابت کرنے کی دُھن میں پھل اور سبزی کی طرح انسانوں کو کاٹ کاٹ کر پھینکے جا رہے تھے۔ ایسے میں فیروز احمد، بی بی کے ساتھ کس طرح ریلوے اسٹیشن تک پہنچا۔ اتنی کٹھنائیوں کا اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور پھر دل کتنا تھا تو بی بی کو دیکھ کر، کہ جو پے در پے صدمو کے باعث اور حالات کی کشیدگی کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گئی تھیں۔ سیاہ برقع اوڑھے یوں بھی دُور سے ہی دیکھنے والوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ مسلمان ہیں۔ اسی لیے رِسک بھی زیادہ تھا۔ مگر نہ تو فیروز احمد نے انہیں برقعہ اُتارنے کا کہنا گوارا کیا اور نہ ہی خود انہوں نے یہ بات قابلِ عمل خیال کی۔

ریلوے اسٹیشن پر صبیحہ کو اس سکھ خاندان نے واقعی حفاظت سے رکھا تھا۔ بی بی، صبیحہ اور فیروز احمد جب ریل میں بیٹھے تو باقی موجود تمام لوگوں کی حالت بھی ان ہی کی طرح بے حالی کا شکار تھی۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں، چہرے پر ہلدی کی سی رنگت اور ہونٹوں پر جمی پپڑی سے اُڑتی خشکی۔ ایسے میں ریل میں بیٹھتے ہی بی بی نے اپنی یادداشت کے بھروسے ذہن سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بہت ساری آیات پڑھ کر نہ صرف فیروز احمد بلکہ صبیحہ اور تمام مسافروں پر بھی پھونک ڈالیں۔

دُبلی پتلی سی صبیحہ جس طرح اپنے تمام گھرانے سے بچھڑ گئی تھی، اس پر بی بی کو اس سے بے حد ہمدردی محسوس ہوا کرتی تھی۔ کبھی یوں لگتا کہ صبیحہ کی شکل میں انہیں ایک بار پھر جگنی سے ملا دیا گیا ہو۔ انہیں یاد تھا کہ معراج شریف کی رات جگنی نے جس طرح اپنی کیفیات بیان کی تھیں۔ یعنی کہ اس کے نام کا پتا اسی رات گرا تھا۔ جب وہ بوکھلائی ہوئی یہاں وہاں دیکھتے ہوئے انہیں مختلف طریقے اور مثالوں سے اپنی بات سمجھا رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے سرگوشی میں صبیحہ سے کچھ دیر برقعے کے پلّو کی اوٹ سے بات کی اور پھر وہیں ریل میں ہی اس کا نکاح گواہوں کی موجودگی میں فیروز احمد سے قرار پا گیا۔

ریل کے کچھ ڈبوں کو ہندو انتہا پسندوں نے راستے میں نذرِ آتش بھی کر ڈالا تھا۔ مگر آخر کار ریل کے دونوں اطراف سبزہ دکھائی دینے لگا۔ کیکر کے بڑے بڑے درخت اور ٹاہلیاں دیکھ کر فیروز احمد نے بی بی کو بتایا۔

''بی بی!..... دیکھو..... پاکستان آ گیا ہے۔ یہاں جیسے چاہو نمازیں پڑھو، روزے رکھو، بڑی عید پر جس جس کا دل چاہے وہ بے خوف ہو کر بے شک گائے کی قربانی کرے..... بی بی! میں نے ریڈیو میں سنا تھا کہ قائداعظم کہہ رہے تھے صرف مسلمان ہی نہیں، باقی سب مذاہب والوں کو بھی اپنے مذہب کے لیے برابر آزادی ملے گی۔''

خوشی کے مارے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ریل ''اللہ اکبر'' کے نعروں سے گونجتی ہر دل میں موجود

جذبۂ ایمانی اور حبِ وطن کو تازہ کر رہی تھی۔ بی بی نے بھی ریل کی سیٹ پر دوزانو ہو کر سجدۂ شکر ادا کیا تو آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو نہ روکا کہ شکر کے آنسو تو قسمت والی آنکھوں میں ہی آتے ہیں۔ سو اس روز وہ کھل کر روئی تھیں اور ریل سے اُتر کر سرزمین پاک پر قدم رکھتے ہی شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد بہو اور بیٹے کو بے شمار دعاؤں سے نواز ڈالا اور خود اسی رات کیمپ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

❀---❀---❀

آج.....ٹھیک آج کی ہی رات تھی جب ان کے انتقال نے فیروز احمد کے لیے اس تاریخ کو سوگوار بنا دیا تھا۔ مگر آج چالیس برس بعد آج ہی کی رات جب اس کا بیٹا فوج میں بھرتی ہونے کے بعد پہلی دفعہ گھر آیا تو صبیحہ سمیت خود فیروز احمد کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بی بی کی تمام روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے صبیحہ نے بھی آج جمعرات کے روز کھانا تیار کر کے ٹرے میں رکھا اور مسجد کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں مختلف طاقتوں سے بلب کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ صفوں پر نمازی آستینیں سیدھی کرتے ہوئے جمع ہو رہے تھے۔ مغرب کی اذان بس ہونے ہی والی تھی۔ مختلف نمازی اب دریوں پر بیٹھ کر اذان سننے کا احترام کر رہے تھے۔ چند بچے بھی یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔ صبیحہ نے ایک بچے کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور اسے ٹرے تھما کر مولوی صاحب کے حجرے کی طرف پہنچانے کا سمجھا کر خود واپس لوٹ آئی۔ یہی اُس کی برسوں پرانی عادت تھی۔

وہ شعوری اور لاشعوری طریقے سے بی بی کو ایک عظیم خیالات کی حامل خاتون تصور کرتے ہوئے ان جیسا بننے کی سعی میں لگی رہتی۔ وہی صبر، وہی فکر اور سوچ کا وہی درویشانہ انداز اس کے اندر بھی موجود تھا۔

اور پھر فیروز احمد بھی اکثر اوقات اسے بی بی کی عادات و خیالات کے متعلق مختلف باتیں بتاتا ہی رہتا۔ کچھ وہ خود ایک محلے میں رہنے کی وجہ سے اپنے گھر والوں کی زبانی ان کے متعلق سنتی آئی تھی اور گو کہ فیروز احمد اور صبیحہ کی شادی تو ایک پیچیدہ اور کٹھن صورتِ حال کی وجہ سے اتنی کم عمری میں ہوئی، مگر اُس نے اس معاملے میں ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صبور احمد کی شادی اس کے بھرتی ہونے سے بھی پہلے بڑی سادگی سے کر دی تھی اور آج جب وہ گھر آیا تو نہ صرف اس کے والدین اور بیوی بلکہ نومولود بیٹا بھی اپنا منتظر پایا۔

صبیحہ نے اس کے آنے کی خوشی میں اپنے ہاتھ سے سوجی کی میٹھی ٹکیاں بنا کر ان پر ختم دلایا اور نزدیک و دُور کے تمام گھروں میں دے کر بھی آئی۔

یوں بھی پورے گاؤں میں ان کا گھرانہ نیاز اور نماز کا پابند مشہور تھا۔ ہر قسم کے اسلامی تہواروں پر نیاز دلانا تو الگ فعل تھا۔ مگر وہ یوں ہی اکثر اوقات محض شکرانے کے طور پر بھی سب میں نیاز بانٹتی نظر آتی جس کا انتہائی آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ گھر میں کچھ بھی بنا لینے کے بعد اپنا دروازہ کھول کر چوکھٹ پر آ بیٹھتی اور

ہر آنے جانے والے کو نیاز تھماتی اور الحمدللہ کا وِرد کرتی رہتی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے تک اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ ہرگز ان خیالات کی مالک نہ تھی۔ یہ سب بدلاؤ آیا تو محض بی بی کی قربت حاصل ہونے اور پھر فیروز احمد سے نکاح کے بعد۔

وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ''اللہ سے اس کی راہ میں قربان ہونے کی دعا مانگا کرو۔ یہ جان تو ویسے بھی چلی جانی ہے تو کیوں نہ اُس کے نام پر، اُس کی راہ میں جا کر خوش نصیبوں میں شامل ہو جائے۔''

ریل میں فیروز احمد سے اس کا نکاح ہو جانے کے بعد انہوں نے برقع کے پلّو کی اندرونی سائیڈ سے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے ایک اور سرگوشی بھی کی تھی۔ تب تو صبیحہ نے اس بات کو اتنا محسوس نہیں کیا، مگر صبور احمد کے پیدا ہونے اور پھر اس کے بڑا ہونے پر اب بی بی کی وہ سرگوشی اکثر اوقات چلتے پھرتے، سیلاب کے پانیوں کی طرح صبیحہ کے وجود کو اپنے اندر گھیر لیتی تھی۔

لہو میں گھومتے رہنے والی سرگوشی۔

آنکھوں کے رستے ''حال'' پر نظر رکھنے والی سرگوشی۔

اور اس پست آواز کے پکار میں بدل جانے کی خواہش رکھنے والی سرگوشی۔

اندر باہر ہر جگہ صبیحہ کے سامنے بی بی کی وہ سرگوشی ٹھپا کھاتی گیند کی طرح اُبھرتی رہتی۔ دل سے اس سرگوشی کو پکار کا درجہ دینے کی اس میں ہمت تھی اور نہ ہی اس سرگوشی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کی جرأت۔

جب ہی خود کو اور تمام حالات کو رب کے سہارے چھوڑ کر خود بے فکر سی گھر بار کے سارے چھوٹے بڑے کام نمٹاتی رہتی۔

جب تک تو صبور احمد کی شادی نہیں ہوئی تھی، صبیحہ کی مصروفیات ذرا اور طرح کی تھیں۔ گرمیوں کی جھلسا دینے والی دوپہر ہوتی یا سردیوں کے دھوپ کے دن۔ اپنے چھوٹے سے گھر کو صاف ستھرا رکھنے کا تو اسے خبط تھا۔

دروازے کے اندر آتے ہی مستطیل صحن، اس کے آگے سرخ برآمدہ اور اس برآمدے کی چوڑائی پر تقسیم کیے گئے دو کمرے۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ، عقیق اور چنبیلی کے چند پودے اور اس تسلسل سے موجود کیاری جس میں دھنیا، پودینہ اور ٹماٹر لگایا گیا تھا۔ دوسری طرف چھت کو جاتی پتلی پتلی سیڑھیاں اور ان کی محراب تلے محدود سی جگہ پر بنایا گیا چھوٹا سا باورچی خانہ تھا اور صبیحہ کا پورا دن۔ سو پنج وقت نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد جو بھی وقت ملتا، بس مصروف ہی رہتی۔

دوسرے گھروں میں بیٹھ کر عورتوں کے ساتھ غیر اہم گفتگو کرنا یا اپنے ہی گھر آئی ہوئی محلے دار عورتوں سے دوسروں کے متعلق کن سوئیاں لینا اس کے نزدیک انتہائی غیر دلچسپ کام اور محض وقت کا زیاں تھا۔ اور

اللہ نے اسے دیئے بھی دونوں بیٹے ہی تھے۔ بیٹی ہوتی تو اس کو بنانے سنوارنے میں، بال بنانے میں ہی کچھ وقت صرف ہوتا۔ اب ماشاء اللہ دو بیٹے تھے اور وہ دونوں میاں بیوی۔

فیروز احمد نے گھر کی بیٹھک میں دکان کھول رکھی تھی۔ یوں وہ سارا دن گھر میں ہوتے ہوئے بھی گھر سے باہر ہی لگتا۔ گاؤں میں اپنے اخلاق اور کردار کی وجہ سے اچھی شہرت ہونے کی وجہ سے لوگ گاؤں کے آخری کونے سے بھی اس کے پاس آیا کرتے تھے اور اسی دکان کی آمدنی میں ہونے والی برکت سے اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم دلوا کر ایک کو فوج میں بھرتی کروایا تو دوسرا ابھی کم عمر ہونے کے باعث تعلیم میں مصروف رہا تھا۔ فیروز احمد کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اسے بھی فوج میں بھرتی کروائے۔ اس لیے اس کا بستر اپنے بستر کے ساتھ لگواتا اور رات دیر تک پڑھاتا رہتا۔ خود اتنا پڑھا لکھا تو نہ تھا، مگر اپنے شوق کے باعث پاکستان آنے کے بعد اس نے پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چھوٹے سے چھوٹے کاغذ کے پُرزے کو بھی کہیں زمین پر پڑا دیکھ لیتا تو پڑھ کر چھوڑتا۔ یوں بھی گھر کے آنگن میں بچوں کی قلقاریاں گونجنے میں کچھ وقت لگا تھا اور ایسی کوئی ذمہ داری بھی نہیں تھی۔ اس پر گاؤں کے حکیم صاحب سے جان پہچان ہونے کے بعد سے تو جیسے پڑھنے کی ساری تشنگی دُور ہو گئی۔

ان کے تنگ و تاریک اور انتہائی گھٹن زدہ مطب میں جہاں مختلف قسم کی معجونوں کے مرتبان، رنگ برنگی شربت کی بوتلیں اور سفوف تھے، وہیں اُنہیں بھی کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ سو جتنا کچھ ان سے مستعار لی گئی کتابوں کے ذریعے خود پڑھا تھا، وہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بے حد کام آیا۔

صبور احمد تو اب فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔ سو اس کی ساری توجہ چھوٹے بیٹے داؤد پر ہوتی۔ جس کو وہ رات گئے تک ایک ساتھ بچھائے گئے پلنگ پر بیٹھا پڑھاتا رہتا۔ ایسے میں صبیحہ ہاتھ میں تسبیح لیے اُمید افزا آنکھوں کے ساتھ اُسے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے لب ہلاتی رہتی۔ اُٹھتے بیٹھتے اپنے دونوں بیٹوں کی لمبی حیاتی کی دعائیں مانگتی نہ تھکتی۔ گھر آنے پر ذرا سی تاخیر ہونے پر یوں ہونق سی چھت پر جاتی سیڑھیوں کے عین آخر والی اٹھارہویں سیڑھی پر بیٹھتی جیسے ''ککلی'' کھیلتے ہوئے سہیلی نے ایک دم ہی ہاتھ چھوڑ دیئے ہوں۔ دل ہی دل میں کتنی ہی سورتیں اور آیات پڑھ پڑھ کر تصور میں ان پر دم کرتے ہوئے خیر خیریت سے گھر لوٹنے کی دعائیں مانگا کرتی۔

صبور احمد کو فوج میں بھرتی کروانے کا فیصلہ مکمل طور پر فیروز احمد کا تھا۔ اگر وہ صبیحہ سے صلاح لیتا تو شاید وہ منع کر بھی دیتی، مگر فیروز احمد کا کہنا یہ تھا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں بیٹے کسی مقصد سے دیئے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ کس رستے پر پہنچ کر وہ اپنی منزل تک پہنچ پائیں گے۔

''فیروز احمد!..... میں بھی چاہتی ہوں کہ ہر رستے پر اپنے بیٹوں کے ساتھ ساتھ ہی رہوں۔ تجھے پتہ ہے نا میں تو بہت کمزور دل کی عورت ہوں اور میں اپنے بیٹوں سے جدا ہو کر بھلا کیسے رہ سکتی ہوں؟''

صبیحہ کنپٹیوں سے جھانکتے چند سفید بالوں پر دوپٹہ جما کر اکثر سیڑھیوں کی محراب تلے بنے باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھی فیروز احمد سے سوال کرتی تو وہ سامنے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا مسکراتا ہوا اُٹھتا اور دیوار کے سہارے کھڑی دوسری پیڑھی لے کر اس کے سامنے ہی یوں جا بیٹھتا کہ آدھا جسم برآمدے میں تو آدھا باورچی خانے میں نظر آتا۔

''دیکھ صبیحہ! یہ بات تو تُو بھی جانتی ہے نا کہ میں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں کہ دل میں اُترتی مثالیں دے کر تجھے اس طرح بات سمجھاؤں کہ تیرا دل مکھن نکلے دودھ کی طرح ایک دم ہلکا پھلکا ہو جائے۔''

باورچی خانے کی ریل کے اکانومی درجے جیسی نیم چھتی تلے بیٹھی صبیحہ کے ہلتے ہونٹ سامنے گلی کے کھمبے سے اندر آتی زرد روشنی میں اپنے درد میں مصروف رہے، مگر اُس کی سماعتیں فیروز حمد کے منہ سے نکلے ایک ایک لفظ کو بڑے دھیان سے سن رہی تھیں۔

''پر ہاں، اتنا مجھے ضرور پتہ ہے کہ بی بی اللہ بخشے کہتی ہوتی تھی کہ دل میں صرف اور صرف منزل کی لگن پیدا کرو۔ راستوں، رکاوٹوں اور واہموں کا وجود ویلڈنگ سے نکلتی چنگاریوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے اوپر والے پر بھروسہ کر کے جب سوچو صرف اور صرف منزل کا سوچو۔ راستوں کا سوچتے رہو گے تو اُلجھ جاؤ گے۔ پھر حالات کی چک پھیریاں ان ہی رستوں میں ہمارے لیے غلام گردشیں بنا دیں گی۔ ہمیشہ محسوس ہوگا کہ سفر میں ہیں، مگر حقیقت میں ایک ہی جگہ پر دیوانہ وار گھومتے نظر آئیں گے۔''

''راستوں کا نہیں سوچیں گے فیروز احمد! تو بھلا منزل تک کیسے پہنچ پائیں گے؟'' جس طرح ننھے منے سرخے ٹھونگا مار کر کنگنی میں سے گری نکال کر چھلکا رہنے دیتے ہیں، بالکل اسی طرح صبیحہ نے بھی اس کی بات میں سے اپنی اُلجھن چن کر نکال لی تھی۔

''راستوں کا بس اسے سوچنے اور فیصلہ کرنے دے صبیحہ! جس نے ہمیں راستے دکھائے ہیں۔ اور جب راستوں کا انتخاب اس اوپر والے رب پر چھوڑ دیا نا تو وہ بہت بہتر جانتا ہے کہ کون کتنا وزن اُٹھا سکتا ہے۔ اسی لیے تو وہ کسی بھی جاندار پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔'' سانس لینے کو رُکتے ہوئے فیروز احمد نے صبیحہ کی ننھی سی ناک پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے بلوریں قطرے چمکتے دیکھے تو مسکرا دیا۔

''اور اگر ہم تھوڑ دلوں (کمزور دلوں) کو پتھریلے رستے دیتا ہے نا تو پہلے مضبوط جوتے فراہم کرتا ہے۔ تُو فکر نہ کریا کر۔'' ہلتے لبوں کو روک کر صبیحہ نے مالٹے کی سوکھی پھانک جیسی بے رونق مسکراہٹ سے فیروز احمد کو دیکھا۔

''قسمت والی تھی وہ سمرن کور، جو سکھبیر کے پاس ہو کر بھی اُس کی نہ بنی اور کلمہ پڑھ لینے کی پاداش میں اُسی کے ہاتھوں دنیا چھوڑ گئی۔''

اچانک بیٹھے بیٹھے صبیحہ کو جانے کیسے سمرن کور کا خیال آیا تھا، جس کے بارے میں اُنہیں ریل میں ہی

پتہ چلا تھا کہ سکھبیر نے اُسے لدھیانے لے جانے کے بجائے راستے میں ہی مار ڈالا تھا۔ جرم صرف اتنا تھا کہ اُس کا اس قدر وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کو ختم کرنا، خود سمرن کور کو بھی اسی رستے پر چلا گیا تھا جس پر چلنے والوں کو سکھبیر سنگھ صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم کیے ہوئے تھا۔

''ہاں..... اکثر بی بی سے دعا کروانے آتی تھی۔ دل کی صاف تھی۔ اور بی بی بتاتی تھیں کہ مذہب کی طرف رجحان بھی بہت تھا اُس کا۔ تو دیکھ لے، جاتے جاتے بھی مر کر زندوں میں نام لکھوا گئی۔''

''ہوں.....'' صبیحہ ہنکارا بھرتی۔

''تُو بس منزل کا سوچ اور اپنا تن من دھن اولاد سمیت ہر چیز رب سوہنے کے آگے سجا سنوار کے، خوب صورت ترین بنا کے رکھ اور کہہ دے کہ اے عرشوں کے مالک! بے شک یہ سب تیرا ہے اور ہم تو صرف امین ہیں۔ سوہنیا! ہمیں توفیق دے کہ تیری امانتوں کی بہتر رکھوالی کر سکیں۔ اور جب تُو اپنی امانت واپس لے تو..... تُو خوش ہو اور ہم مطمئن۔''

فیروز احمد اپنے تئیں اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا، مگر یہ سب باتیں صبیحہ کے کانوں سے ہوتی ہوئی اُس کے دل تک نہ پہنچ پاتیں۔ پنج وقتہ نماز اور تلاوت کے بعد وہ یہی الفاظ دعا کی صورت دہراتی تو ضرور، مگر صرف حلق کی اندرونی سطح تک۔ دل سے ان الفاظ کی ادائیگی نہ ہو پاتی تھی۔ وہ یہ بات رب سے جس انداز میں کرنا چاہتی تھی، ہزار کوشش کے باوجود اسے اپنے الفاظ، اپنا لہجہ، اپنا انداز سب ہی رسمی سے لگا کرتے۔ دنیا کی محبت اُس کے نفس پر اس طرح پنجے گاڑے ہوئے تھی کہ بعض اوقات اُسے اس بات کا یقین ہو جاتا کہ اس کے انداز میں موجود رسمی پن کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ رب کی رکھوائی گئی امانتوں کو اتنی جلد لوٹانے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔

ان دنوں جب داؤد احمد کی فوج میں بھرتی کے لیے فیروز احمد دن رات بھاگ دوڑ میں مصروف رہنے لگا تو اکثر اوقات جب وہ صبح سویرے ہی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ازار بند بُننے کا اڈا برآمدے کی موٹی دیوار کے ساتھ لگا کر بیٹھتی اور اس کے انگوٹھے اور انگلیاں جس چابک دستی سے دھاگے کے اس تانے بانے میں سے گزرتیں، اُس پر گمان گزرتا کہ جیسے ننھی مُنی مچھلیاں پانی میں ڈالے گئے جال سے بچ کر دائیں اور پھر بائیں کا رُخ کیے جا رہی ہیں۔

مگر حقیقت اس سے برعکس تھی۔ انگوٹھے اور انگلیاں چلانے کی رفتار میں تیزی اس کے اندر ہوتی جنگ سے تقویت پاتی تھیں۔ ایک عجیب کشمکش اور دوراہا سا ذہن میں آ کھڑا ہوا تھا فیروز احمد سے وہ روز یہ تو پوچھا کرتی کہ کیا بنا؟ مگر دراصل وہ خود نہیں چاہتی تھی کہ داؤد احمد فوج میں جائے۔ گو کہ صبور احمد کی بیوی اور ننھا بیٹا اُس کے پاس تھے مگر پھر بھی وہ ایک بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ ساری امانتیں ایک ساتھ پیش کر دینے کے خیال سے تو کبھی یوں لرز جاتی کہ آنسو ٹپ ٹپ کرتے زانو پر جذب ہونے لگتے اور وہ

بوجھل دل سے پیڑھی پیچھے کی طرف کھسکا کر ہاتھ کی بالشت پر دھاگے کا آٹھ ناتے ہوئے کسی سوچ میں گم نظر آتی۔

''پتہ نہیں صبیحہ! کیا رُکاوٹ ہے؟ حالانکہ نیت سچی ہے، جذبہ کھرا ہے۔ خود داؤد احمد بے چین ہے اس دن کے لیے جب اسے اس منصب کے لیے چنا جائے کہ وہ اس اسلامی مملکت کے لیے اپنا خون پسینہ بہا سکے۔ پھر..... پھر پتہ نہیں کیوں اب تک کام نہیں ہو پا رہا۔ ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی نا؟'' فیروز احمد بڑی دلگرفتگی سے کہتا۔

مگر یہ بات صرف صبیحہ کے علم میں تھی کہ اس نے تو آج تک داؤد احمد کو خود سے الگ کرنے کا سوچا بھی نہیں ہے۔ اور نہ ہی کبھی وہ چاہے گی کہ اس کا بیٹا کبھی اس سے دُور جائے۔ اور درحقیقت ماں ہونے کے ناتے اُس کے یہی جذبات بھی تو اصل رُکاوٹ تھے ان دنوں میں جب کہ فیروز احمد اور داؤد احمد کی کوششیں اپنے عروج پر تھیں۔ صبیحہ نے چونکہ قیامِ پاکستان کے وقت کپڑوں کے صندوق میں چھپنے کے دوران اس کی معمولی سی جھری سے اپنے ماں باپ، جوان بھائیوں اور ننھی بہن کو جس طرح خون میں لتھڑے اور مختلف ٹکڑوں میں بٹا دیکھا تھا اور پھر ریل میں بیٹھ کر پاکستان تک آتے جو رُوح فرسا مناظر وہ دیکھ چکی تھی، اس پر ایک بیٹے کو تو جیسے تیسے چوبیس گھنٹے جان ہتھیلی پر رکھنے کی اجازت دے دی مگر اب اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی خود سے دُور کرنے کا حوصلہ وہ قطعی طور پر اپنے اندر موجود نہیں پا رہی تھی۔

'اگر ایسا ہو گیا کہ.....'

اس ایک ادھورے جملے کی دہشت نے اُسے لوکی کی ہری بیل میں موجود سوکھے پھول کی طرح کمزور کر ڈالا تھا۔ چال میں ایک عجب ڈھیلا پن تھا جو انہی چند دنوں میں سامنے آیا تھا۔ صبح تڑکے نماز پڑھنے کے بعد مختلف سورتیں پڑھ کر داؤد احمد پر پھونکتی، جمعرات کے جمعرات زردہ پکا کر بچوں میں بھی بانٹتی اور مسجد بھی بھجواتی، قرآن پاک کی تلاوت کرتے کرتے یوں دل بھر آتا کہ بند کر کے خوب روتی۔

وہ رات معراج شریف کی تھی۔

عام طور پر رات کے اس پہر میں سیاہی کسی بیوہ کی آنکھوں کی طرح بے حد بے رونق اور ویران لگا کرتی تھی۔ مگر آج کی رات تو ہزار ہا راتوں سے افضل تھی اور سب کو اس حقیقت کا ادراک بھی تھا۔ سو مسجد سے اسپیکر پر کیے جانے والے خطابات اور نعتوں کی آوازیں گھر گھر جا رہی تھیں۔ باری باری سبھی عقیدت مند اسپیکر سنبھالتے اور عرشوں کی سیر کرنے والے کو عقیدت سے بھرپور آنسوؤں بھری آواز میں درود و سلام پہنچاتے۔ وہ چھت پر بچھائی گئی چارپائی پر سفید دلائی ڈالے اس پر رحل میں قرآن شریف اور ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی تھی۔ بہو اور پوتا نیچے جبکہ داؤد احمد، فیروز احمد کے ساتھ مسجد میں تھا۔

معراج النبیؐ کے جشن کی نیت سے آج گھر میں میسر سارے بلب روشن تھے۔ گلی میں دروازے پر لگا

بلب تو یوں بھی روشن ہی رہا کرتا۔

سبک خرام، ہلکی ٹھنڈی ہوائیں درختوں کو چھوتی یہاں وہاں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ گزرتے وقت میں کچھ ایسا سرور تھا کہ دل چاہتا، یہ وقت بس تھم سا جائے۔ صبیحہ کبھی چارپائی سے نیچے اُتر کر جائے نماز بچھاتی، نوافل پڑھتی اور کبھی جائے نماز لپیٹ کر چارپائی کے پائے پر اٹکاتی اور پھر سے قرآن پاک پڑھنے لگتی۔

مسجد کا اسپیکر اب مولوی صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ اپنے مخصوص طرزِ خطابت کے باعث حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتے ہوئے مختصراً چیدہ چیدہ پیغمبرانِ کرام کی زندگی کا احوال بیان کرتے آخری رسول رسولؐ اور آج کی رات عرشوں کے مہمانِ خصوصی بننے کا اعزاز حاصل کرنے والے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج مبارک کے واقعہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہلکے پھلکے، سادہ فہم اور روزمرہ کی زندگی ہی میں استعمال ہونے والے الفاظ کا سہارا لے کر وہ یوں بات کرتے کہ پھر سامع کو اپنے دل میں اُترتی محسوس ہوتی۔

چند لمحوں کے لیے قرآن پاک بند کر کے نفل ادا کرنے کی غرض سے نیچی منڈیروں والی چھت پر جائے نماز ڈالتی صبیحہ کے کانوں میں جب ان کی گفتگو کے چند الفاظ پڑے تو بڑی دلچسپی سے وہ بھی وہیں جائے نماز پر ہی بیٹھی اُن کا پُر اثر خطاب سننے لگی۔ اس وقت وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر قرآن پاک کے ساتھ رکھی تسبیح اُٹھائی اور بند آنکھوں اور حرکت کرتے لبوں کے ساتھ جسم کے تمام مساموں کو سماعت بنا دیا۔

''بھائیو! حضرت ابراہیم علیہ لسلام کو جب اللہ کی بارگاہ سے اپنی سب سے محبوب چیز اُس کی راہ میں قربان کرنے کا اشارہ ملا تو خدا گواہ ہے کہ شیطان کے ڈالے گئے تمام وسوسوں کے باوجود اُنہیں اپنے جگر گوشے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے محبوب چیز کوئی نظر نہ آئی اور بالآخر شیطان مردود ہارا اور حُبِّ الٰہی یوں جیتی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں سے قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا..... اور بیٹا بھی وہ جس نے اللہ کا حکم جانتے ہوئے باپ کی رضا کے آگے گردن جھکا دی..... بھائیو اور بزرگو! ذرا سی دیر کے لیے اپنے گریبانوں میں جھانکو اور اپنے دل کو جواب دو، کیا آج ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹوں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟''

ایک جھٹکے سے صبیحہ کی آنکھیں کھلیں اور تسبیح کرتے ہاتھوں کے ساتھ ہلتے لب ساکت ہو گئے تھے۔

مسجد میں بیٹھے لوگ چونکہ لاؤڈ اسپیکر سے دُور تھے، اس لیے واضح طور پر نہیں مگر دھیمی آواز میں تمام نمازیوں کے ''لبیک اللھم لبیک'' کا نعرہ لگانے کے بعد نعرۂ تکبیر کہنے کی آواز صبیحہ کو بھی سنائی دی۔

''سبحان اللہ!'' مولوی صاحب یقیناً نمازیوں کا جوش دیکھ کر سرشار ہوئے تھے۔

''اور پھر سوچنے کی بات تو یہ ہے نا کہ ہم تو صرف اُسی کی دی گئی امانتیں اُس کے حضور پیش کرتے

ہیں، وہ کس کو یہ اعزاز بخشے۔"

"یہ تو بڑے کرم کے ہیں فیصلے، اور بڑے نصیب کی بات ہے۔"

تمام نمازیوں نے مل کر بڑی عقیدت سے نعت کے دو مصرعے پڑھے تھے۔ اس کے بعد پھر مولوی صاحب بولے۔

"اُسے ہماری قربانیوں کی ضرورت نہیں ہے بھائیو! وہ اور اُس کا دین تو لازوال ہیں۔ ارے یہ تو ہم ہیں جو اس کی چیز، اسی کے سامنے پیش کر کے اپنی دنیا اور آخرت سنوار لیتے ہیں۔ اور یاد رکھنا کہ گھاٹے کا سودا کرتے ہیں وہ لوگ جو اپنے لیے بہترین چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں مانگنے والے فقیر یا سائل کو گھٹیا اور فالتو چیز دے کر کہتے ہیں کہ ہم نے کبھی سائل کو خالی نہیں لوٹایا۔ ارے کم عقلو! یہ سوچو کہ (نعوذ باللہ) کیا خدا ہماری استعمال شدہ چیزوں کا حق دار ہے؟ اُس کی راہ میں دینا ہے تو اپنی پسندیدہ ترین اور محبوب چیز اس کے سامنے لا رکھو اور عرض کر دو کہ یا باری تعالیٰ! تیرے دیئے میں سے دیتے ہیں مالک! تُو عرشوں کے دولہا کے صدقے قبول کر لے۔"

صبیحہ کو لگا جیسے معراج شریف کی اس بابرکت رات میں وہ اپنے خیالوں میں معراج کو چھو آئی ہو۔ دل ہر قسم کے بوجھ اور دکھ سے خالی بارش کے بعد دُھلے ہوئے آسمان کی طرح صاف شفاف ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کے دل کے اندر جذبات کی کنڈی بالکل سیدھی لگی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں موڑ کر مضبوطی سے بند کرتے ہوئے دوبارہ یکدم نہ کھلنے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ اسی لیے مولوی صاحب کے الفاظ تیز ہوا کی طرح اس کنڈی سے یوں ٹکرائے کہ وہ کھٹ سے خود بخود کھل گئی۔

منزل واضح ہو گئی تھی.....

آگے کون سی گلی بند ہے یا کون سا راستہ کس طرف مڑتا ہے؟ یہ فکر اُس نے اپنے کندھوں سے اُتار پھینکی تھی۔ اب ذہن میں تھی تو بس منزل اور اسے پانے کا جنون۔ چھاچھ کو بلوتے رہنے سے کبھی مکھن نہیں نکلتا۔ صرف سطح پر جھاگ ہی جھاگ نظر آتے ہیں اور بلونے والے کے بازو شل ہونے لگتے ہیں۔ یہی حال آج سے پہلے صبیحہ کے ذہن میں اُمڈتے خیالات کا بھی تھا۔ مگر اب نہیں۔

اب وہ جانتی تھی کہ اس کی دعاؤں کا دھارا کس طرف مڑنا چاہئے۔ اور تب اس رات جب اس نے عرش کے سوہنے رب کے حضور اپنا دامن پھیلایا تو حلق کی اندرونی سمت سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے پکارا۔

بی بی کے منہ سے نکلی سرگوشی کو پکار بن جانے کا اِذن اُس نے اسی رات دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا اور اُس کی اوقات کیا۔

بھلا وہ کون ہوتی تھی اپنی منزل کا خود انتخاب کرنے والی۔

کیوں وہ اب تک خیر کے اس رستے سے دُور رہی اور پھر اس کے حضور سرخرو ہونے کی حسرت لیے تو لوگ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھے قربان ہونے کی تڑپ دل میں لیے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے والوں کو حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور رب کی طرف سے منظوری نہیں ہوتی اور وہ.....وہ کیوں اس تڑپ میں پیچھے رہ گئی۔

اُسے یاد تھا، بی بی نے اُس سے سرگوشی میں کہا تھا کہ.....

''پُتر! مجھے نہیں پتہ کہ میں کب تک جیوں گی اور کب تک ان ہونٹوں کا دعاؤں سے رابطہ رہے گا۔ مگر میری صرف اِکو اِک خواہش ہے جو اگر تُو پوری کرنے میں میرا ساتھ دے۔''

''جی بی بی.....!'' نئی نویلی دُلہن کی طرح اُس نے بڑی سعادت مندی سے یوں سر جھکا دیا کہ اُن کی ٹھوڑی اور سینے کے پنجرے میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہا تھا۔ یوں بھی ریل میں رش ہونے کی وجہ سے وہ دونوں آپس میں یوں جڑی بیٹھی تھیں گویا دو سیب ساتھ ساتھ ایک ہی ٹہنی پر اُگ آئے ہوں۔

''معراج شریف کی رات سے لے کر اب تک میں نے جو دعا سب سے زیادہ مانگی ہے وہ پتہ ہے کیا ہے؟''

صبیحہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

''عرشوں کے سوہنے رب سے میں صرف اُس کے محبوبؐ کے نواسوں کی سنت پر پورا اُترنے کی دعا مانگتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اب اور ہماری آنے والی سب نسلوں میں سے اللہ سوہنا کسی نہ کسی کو اس کے لیے چُن کر ہم جیسے گلیوں کے روڑے کُوڑے کو اپنی راہ میں قربان ہونے کے قابل سمجھے۔

''بی بی.....!'' منہ دکھائی میں ساس کی طرف سے ملنے والی یہ نصیحت نما دُعا اُسے کچھ عجیب لگی تھی۔

''رب جانے معراج شریف کی کس گھڑی کے صدقے میری دعا سنی گئی اور سوہنے رب نے مجھ کو بھی اور نکّی کو نہ سہی پر جگنی اور اُس کے ابا کو پسند کر لیا۔ اب آگے باری تیری ہے۔ اور میری پھر دعا ہے کہ اللہ میرے فیروز احمد کی اولاد میں سے بھی کسی کو پسند کرے اور یہ سلسلہ تا قیامت چلتا رہے۔''

''آمین!'' جانے کیوں اس دن بھی صبیحہ نے یہ لفظ محض زبان ہلانے کی حد تک ادا کیا تھا۔

''یہ جند (جان) ویسے بھی تو چلی ہی جانی ہے نا، سوہنے ربّ کے نام کرنے کی یہ خواہش دل میں پکی کر لے، پھر آگے اُس کی مرضی۔ کروڑوں عرضیوں میں سے ہماری عرضی نکلتی ہے کہ نہیں، یہ پھر قسمت۔''

تب اُسے بی بی کی ہمت پر بلا شبہ رشک آیا تھا جو اپنی نوعمر پھول سی بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھنے اور شوہر کا آخری دیدار تک نصیب نہ ہونے کے باوجود اب تک اسی رستے پر، اسی منزل کی تلاش میں سفر جاری رکھے ہوئے تھیں۔

سکھبیر سنگھ نے تو اُنہیں اکیلے زندہ رہنے اور سسکنے کے لیے چھوڑا تھا مگر وہ تو ایک نئے جذبے سے پھر

اسی میدان میں کھڑی تھیں۔

سیاہ مگر جگمگاتی رات میں صبیحہ کو لگا جیسے وہ صرف سانس کے سہارے اپنے زندہ ہونے کا یقین کر سکتی تھی۔ سانسوں کی آواز بھی اتنی اُونچی ہو چکی تھی کہ لگتا جیسے کوئی قلعی گر بیٹھا اپنی بھٹی جلا رہا ہو۔

خشخش جناں قدر نہ میرا
میرے صاحب نوں وڈے آئیاں
میں گلیاں دا روڑا کوڑا
مینوں محل چڑھایا سائیاں

(میری اوقات تو خشخاش کے ایک دانے برابر بھی نہیں ہے اور سب میری بڑیائیاں اسی پاک ذات کے لیے ہیں۔ میں تو گلیوں کے کُوڑے کرکٹ کے برابر ہوں۔ مگر بے شک مجھے اتنی عزت دینے والا وہی یعنی رب تعالیٰ ہے)

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے بڑے رقت آمیز انداز میں پڑھے گئے یہ اشعار صبیحہ کے کانوں سے بھی ٹکرائے تھے۔ اور تب اس نے کسی مزار کے مجاور کی طرح انتہائی بے خودی کے عالم میں اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو کر نہ صرف اپنی اس بلکہ آئندہ آنے والی تمام نسلوں کے لیے عرشوں کے دولہا کے نواسوں کی سنت پر پورا اُترنے کی دعا مانگی تھی۔ شدت سے آرزو کی تھی کہ اُسے بھی اس راہ کے لیے پسند کر لیا جائے جو صراطِ مستقیم ہے۔

کینچوے کی طرح کبھی آگے اور کبھی پیچھے کا سوچنا چھوڑ کر دھیان صرف منزل کی طلب میں لگایا تو راستے تختی پر چھپی الف ب پ کی طرح نہایت واضح اور آسان ہو گئے۔

داؤد احمد فوج میں بھرتی ہوا اور کچھ عرصے بعد بارڈر پر تعیناتی بھی ہو گئی۔

دونوں بھائی باری باری چھٹی ملنے پر بھی آیا کرتے۔ صبور احمد کا پہلا بیٹا چلنے کے قابل ہوا تو ایک اور بچے کی آمد بھی ہو گئی۔

گھر کا نظام راوی کے پانیوں کی طرح بڑے سکون میں تھا۔ خود صبیحہ بھی اپنا سب کچھ مال اور اولاد ربّ کے حوالے کر کے بے فکر ہو چکی تھی۔ تبھی اُس کے دل میں داؤد کی شادی کا خیال ٹکرایا۔ بھلا دُور کیوں جاتی؟ حکیم صاحب کی بیٹی مذہب کے علاوہ دنیاوی تعلیم سے بھی بخوبی مالا مال تھی۔ سو داؤد احمد نے جب روٹین کے مطابق گھر آنا چاہا تو صبیحہ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ابھی نہ آ۔ بڑی عید کے بعد تیری شادی طے کی ہے، تُو تب آنا۔ تاکہ کم از کم مہینہ بھر کی چھٹی تو ملے۔"

سو داؤد احمد بارڈر کی خاردار تاروں کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی سرانجام دینے میں ایک بار پھر حسبِ سابق مصروف ہو گیا۔

صبیحہ اپنی بہو کے ساتھ مل کر آنے والی نئی دُلہن کے لیے کپڑے وغیرہ تو تیار کر ہی چکی تھی۔ زیور کے نام پر ایک ہلکا سا سیٹ سنار سے قسطیں طے کرنے کے بعد لیا گیا تھا۔ داؤد کے لیے شیروانی یا پینٹ کوٹ کے بجائے سفید کلف لگے کُرتہ شلوار کو سلوا کر استری کر کے صبیحہ نے پہلے ہی الماری میں جا ٹانگا تھا۔ ساتھ ہی گہرے نیلے رنگ کا اِستری شدہ رومال اور اپنے ہاتھ سے بنایا گیا ازار بند!..... داؤد کی تیاری مکمل تھی۔ صرف کلاہ باقی تھا جو داؤد کے آنے پر ہی خریدا جانا تھا۔ صبور احمد اور اس کے ننھے بیٹوں کی تیاری بھی مکمل تھی۔

آس پڑوس اور گاؤں والے ان کے گھر میں ایک بار پھر اُترنے والی اس خوشی پر ہر طریقے سے اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔

عید الاضحیٰ پر قربانی کے لیے فیروز احمد کل ہی منڈی سے بکرا لایا تھا اور اب پوتے کے ساتھ مل کر اُسے چارہ کھلانے اور پانی پلانے میں مصروف تھا۔

صبیحہ بیٹھی بہو کے ساتھ شادی کے موقع پر دیئے جانے والے نیگ پر بحث کر رہی تھی کہ اچانک اُنہیں محسوس ہوا جیسے دروازہ بجا ہو۔

تینوں نے یقین دہانی اور تصدیق کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اتنی نامانوس دستک بھلا کس کی ہو سکتی ہے؟..... ایسی جیسے کوئی چڑیا اُڑتے اُڑتے ایک دم دروازے سے آ ٹکرائی ہو اور پھر، باہر ہی ہوا میں معلق رہتے ہوئے بار بار اپنی چونچ ٹکراتی ہو۔

گھاس نیچے ٹاٹ کی بچھی ہوئی بوری پر رکھے ہوئے فیروز احمد نے ہاتھ جھاڑے اور جا کر دروازہ کھولا تو سامنے چند فوجی جوان چہرے پر عقیدت و احترام سجائے داؤد احمد کی راہِ حق میں شہید ہو جانے کی خبر لیے کھڑے تھے۔

فیروز احمد کا پورا جسم اس وقت برف کی ڈلی سا یخ ہو گیا تھا۔

سامنے ہی چارپائی پر بیٹھی صبیحہ میکانکی انداز میں چلتی دروازے تک پہنچی تو لگتا تھا کہ اب اُس کی آنکھیں شاید کبھی بند نہ ہوں گی۔

ایک ہاتھ کھلے دروازے کے پٹ پر اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی بنائے کمر پر رکھے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کھڑے چاق و چوبند جوانوں کو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسیلے گھاس کی دھونی اُس کے حلق تک میں بھر گئی ہو۔ بات چند ماہ پہلے کی ہوتی تو شاید اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے، وہ زار و زار اپنے جوان بیٹے کی موت پر روتی اور اُنہیں بد دُعائیں دیتی جنہوں نے ناحق سرحد پار سے بلا جواز فائرنگ کر کے اُس کی گود اُجاڑ دی تھی۔ مگر اب ایسا نہ تھا۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ اظہارِ ہمدردی میں کھنچے چلے آ رہے تھے۔

ایک تو جوان موت، پھر شادی میں رہ جانے والے چند روز اور کی گئی تیاریاں اور موقع بھی کیسا کہ عیدالاضحیٰ میں رہ جانے والے صرف دو دن!

ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل غمگین تھا سوائے صبیحہ کے۔

سو جاؤ عزیزو کہ فصیلوں پر ہر طرف
ہم لوگ ابھی زندہ و بیدار کھڑے ہیں

پاک فوج کی ایمبولینس پر تحریر یہ شعر پڑھ کر گزرنے والا ہر شخص بے ساختہ ایمبولینس کو سلیوٹ کر کے فیروز احمد کے گھر میں داخل ہوتا۔

اور جب شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر خواتین سینہ کوبی کرنے لگیں تو اپنی نسوں میں برقی روسی دوڑتی محسوس کر کے صبیحہ نے ایک دم سب کو منع کر دیا۔

''کیوں..... کیوں رو رہی ہو تم سب؟..... کیوں سینہ پیٹ رہی ہو؟''

صبیحہ کے بولنے پر سب نے اُسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا، جسے اتنا بڑا غم سہنے کو ملا تھا۔

''خبردار! کوئی میرے بیٹے کا نام لے کر بین نہ کرے۔ وہ شہید ہوا ہے۔ یعنی ایک اور دنیا میں ہم سے کہیں بہتر لوگوں کے درمیان قیامت تک امر ہو گیا ہے۔ یہ دن رونے کا نہیں جھلّیو! ربّ سوہنے کے حضور شکر کرنے کا دن ہے۔'' دونوں ہاتھ جوڑ کر صبیحہ نے ہلکے نیلے آسمان کو دیکھا۔

''آج میں سرخرو ہو گئی۔ سب سے پیاری چیز کو اللہ سوہنے نے اپنے راہ کے لیے چنا۔ ورنہ میں کہاں گلیوں کا روڑا کوڑا اور کہاں وہ اونچی شانوں والا۔''

بات ختم کر کے اُس نے اس روز سے آنکھیں میچیں جیسے اوپلے جلاتے ہوئے کچا دُھواں آنکھوں میں آ گھسا ہو۔

قربانی والی عید سے پہلے اپنے بیٹے کی رب کی راہ میں قربان ہو جانے کی اطلاع صبیحہ کو لگا جیسے بی بی تک جا پہنچی ہو۔ ڈھاکہ کی سفید ململ کے دوپٹے میں نور کا سا چہرہ لیے وہ اُسے اپنے خیالوں میں اُترتی محسوس ہوئی تھیں۔ چہرے پر خوشیوں کی چاندنی بکھیرے صبیحہ کو مبارکباد دی تو اُس کی نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے لبوں کو دیکھ کر تمام عورتوں نے دوپٹوں کے پلّو سے آنکھیں اور ناک رگڑتے ہوئے ناسمجھی سے ایک دُوجے کو دیکھا۔ مگر صبیحہ کی نظر سب عورتوں کے درمیان بیٹھی اپنی بہو پر جا رُکی کہ سب عرشوں کے مالک اس سوہنے ربّ کے حضور عرضیاں بھیجنے اور دُعائیں مانگ کر سرخرو ہونے کی ادنیٰ سی کوشش کرنے کا عمل اب اس تک منتقل ہونا تھا۔

میں کس کے ہاتھ پہ.....

''ارے یار! کیوں نہ ہم جنجال پورہ کرلیں۔''

اچھے بھلے سیریز ڈرامے کا سکرپٹ لکھتے لکھتے عماد کے دل میں جانے کیا آیا کہ ایک دم سر اُٹھا کر اپنا ''نواں نکور'' آئیڈیا سب کے سامنے پیش کر دیا۔

وہ لوگ پروفیسر حسام کی کلاس کے بعد کینٹین میں اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھے پیٹ پوجا کرنے کے ساتھ ساتھ ڈراما فنکشن کی تیاریاں بھی ڈسکس کر رہے تھے۔ لیکن اُس کا یہ چٹکلا سن کر تو سب حیران رہ گئے اور سبوخ ہاتھ کھول کر تالی بجانے کے مخصوص اسٹائل کے ساتھ خود ہی گاتے ہوئے کسی تیز رفتار ویگن کی طرح ڈولنے لگا تو اس مردانہ اور بے ڈھنگے رقص پر وہ سب بلند آواز میں قہقہے لگاتے ایک دوسرے کے ہاتھوں پر تالی مارتے انجوائے کرنے لگے جبکہ باقی سب بمشکل اسے بٹھاتے ہوئے باقاعدہ پیٹ پر ہاتھ رکھے ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ گھنگھرو بجانے اور بالوں کو خیالی جھٹکا دینے کا اسٹائل اُس کا واقعی زبردست تھا اور وہ تھا بھی تو ایسا ہی۔ کب کسی کی پروا کرتا تھا؟ جو، جب جی میں آیا، کر ڈالا۔ لوگ کیا کہیں گے جیسا جملہ اُس کے ذہن کی سلیٹ پر کبھی نمودار ہی نہیں ہوا تھا۔

اُس کے رقص کی ''جدت'' دیکھ کر کینٹین میں ایک دم ہی سیٹیوں، تالیوں اور ہوٹنگ کا جو طوفان بلند ہوا تو جہاں چند لڑکیاں کھسیانے لگیں، وہیں کچھ لڑکیوں کو فوراً اپنے بیگ اور فائلز سنبھال کر اُٹھتے ہی بنی۔

''لو بھلا، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ چھیما گرو کا رول تو یہ اپنا سبوخ بھی خوب کر لے گا۔'' عماد ابھی تک اپنے چٹ پٹے خیال کی تائید چاہتا تھا۔

''ہاں بھئی۔ اور لیڈی ہیلتھ ورکر بن جائے گا شموئیل۔'' زیمل نے ہنستے ہنستے سیاہ آنکھوں سے نکل آنے والے آنسو اپنی مخروطی انگلی کی پور سے صاف کرتے ہوئے شموئیل کو مخاطب کیا جسے شاید سبوخ کی

بے باک پرفارمنس بری لگ رہی تھی لہٰذا خاموشی سے کوئی بھی جواب دیئے بغیر حسبِ سابق چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر کولڈ ڈرنک سے اپنے اندر کی گرمی مٹاتا رہا۔ قہقہے بکھیرتے ماحول کا کوئی رنگ اس کے سپاٹ چہرے کی دہلیز کو چھو کر نہیں گزرا تھا۔

''ٹینشن وینشن کیوں لیتا ہے جانِ جاناں
چار دن کی زندگی ہے ، مسکرا ناں''

سبوخ ایک بار پھر ٹون میں آ گیا تھا۔ یہ اُس کا اپنا فلسفہ اور زندگی گزارنے کا اصول تھا جو وہ شموئیل کو بھی سمجھانا چاہتا تھا۔

''ہاں شموئیل! تم بھی کبھی ہنسی مذاق میں شریک ہو جایا کرو۔ اُتار ڈالو خود پر سے یہ پراؤڈنیس کا چولا۔'' ایمان نے بھی سبوخ کی تائید کی۔

''میں جیسا بھی ہوں، ٹھیک ہوں اور مجھے اس طرح کے فضول جوکس بالکل پسند نہیں۔'' سبوخ پر نظریں جماتے ہوئے اُس نے کولڈ ڈرنک ٹیبل پر پٹخی۔

''لیکن ہم تو ایسے ہی فضول ہیں۔'' عین اس کے سامنے بیٹھ کر سبوخ نے کہنیاں ٹیبل پر ٹکا دیں۔ ''ہمت ہے تو کر اس کر، ورنہ برداشت کر۔''

''سبوخ! تم اپنی اوقات میں رہا کرو۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں گروپ میں شامل ہوئے اور لگے میری ہمت کو للکارنے۔'' شہادت کی اُنگلی اس کی طرف کر کے وہ ایک دم دہاڑا تھا۔

''چچ چچ..... تم نے ایک انگلی مجھ پر اُٹھائی، باقی تین خود تم پر اُٹھ گئیں۔ ارے یار! للکارنا کیا، ہم سب تو گپیں مار رہے تھے، شغل کر رہے تھے اور بس۔''

''بس میں تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتا۔'' اس کے ایک دم ہائپر ہو جانے پر وہ سب حیران رہ گئے تھے۔ یہ ٹھیک تھا کہ سبوخ نے ان کے گروپ کو کچھ ہی عرصہ پہلے جوائن کیا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اپنی چلبلی فطرت کی بدولت اس نے سب میں جیسے جان ڈال دی تھی۔ ''اور ہاں کر سکتا ہوں کر اس تم سب کو، سمجھے... فنش..... ایوری تھنگ اِز فنشڈ ناؤ۔'' باری باری سب کو دیکھتے ہوئے اُس نے الفاظ چباتے ہوئے جملہ مکمل کیا اور پھر سب کے واپس بلانے یہاں تک کہ سبوخ کے ایکسکیوز کہنے پر بھی بغیر رُکے گروپ چھوڑ کر چلا گیا۔

❀---❀---❀

یونیورسٹی میں پہلا دن سبوخ کو اچھی طرح یاد تھا جب وہ برآمدے میں کھڑا نوٹس بورڈ پر سے سبجیکٹس اور متعلقہ پروفیسر کے حوالے سے دی گئی ابتدائی معلومات پڑھ رہا تھا کہ ایک دم اسے اپنے پیچھے چند لوگوں

کی موجودگی کا احساس ہوا جو فول بنانے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک آئیڈیاز دے رہے تھے۔ نوٹس بورڈ تو وہ پڑھ ہی چکا تھا، سو ذرا سا رُخ موڑ کر یوں کھڑا ہو گیا کہ منی پلانٹ سے ڈھکے ستون کے ساتھ کھڑے ان سب کے چہرے آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ دو لڑکیاں اور تین لڑکے بڑے ہی جوش و خروش سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ لیکن یہ کیا..... ''ایک طرفہ محبت'' جس پر وہ ہمیشہ ہنسا کرتا تھا، آج سمجھ آئی تھی۔

بلیو ٹائٹ جینز پر پیرٹ گرین شرٹ اور گلے میں بلیک کلر کے اسکارف کی ناٹ بنائے شارٹ باب کٹ بالوں کے ساتھ وہ اسے اپنے دل میں موجود محسوس ہوئی۔ ہنستے ہوئے اس کے گالوں میں نمودار ہونے والے ڈمپل نے تو اسے بے خود سا کر ڈالا۔ اپنی اس کیفیت پر وہ نہ صرف حیران بلکہ پریشان بھی تھا لیکن دل میں سر اٹھاتے یہ جذبات اُسے اچھے بھی لگے تھے۔ گویا آنکھوں کی طرف سے پیش کردہ عرضی پر دل نے نہ صرف سائن بلکہ مُہر تک لگا دی تھی جبھی اس نے آگے بڑھنے کا سوچا۔ دوست بنانے میں تو وہ ماہر تھا ہی لیکن اب چونکہ معاملہ دوست سے بڑھ کر محبوب تک جا پہنچا تھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ سو جب وہ لوگ تمام آئیڈیاز فائنل کر چکے تو ایک دم سامنے آ کر بغیر کسی تکلف اور جھجک کے نہایت اعتماد سے کہنے لگا۔

''میرا تو خیال ہے دونوں پاؤں باندھ کر ''تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے'' پر ڈانس کروایا جائے۔''

باقاعدہ دونوں پاؤں جوڑ کر اُس کا ہلکا سا ٹریلر پیش کیا تو وہ سب اُس کی اس قدر خود اعتمادی پر حیران رہ گئے۔ لہٰذا خوش دلی سے اُس کی تجویز کی تائید کرنے کے بعد تعارف کا مرحلہ بھی طے پا گیا۔

''لیکن کوئی بچ نہ پائے اور یہ چیک رکھنا تمہاری ڈیوٹی ہے۔'' زیمل نے یہ مشن جاذب کے سپرد کیا تھا۔ سبوخ نے چونکہ سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے بعد اب اُنہیں جوائن کیا تھا، لہٰذا سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے نیا ہونے کی وجہ سے وہ بھی پھنس جائے۔ اُن کی باتوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو ''فول پروف'' رکھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ زیمل اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ جاذب کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اُسے ہی دیکھ رہا ہے اور گلے میں جھولتے گولڈ کے کراس نے اُسے کافی حد تک بے چین کر دیا تھا۔

''سبوخ! ہماری کشتی میں گھات لگا کر سوراخ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' گو کہ آپ جناب کے بجائے وہ لوگ ایک دم ہی تم پر آ گئے تھے لیکن اس طرح مخاطب کرنے پر جب ان سب نے ایک دم ہی اسے دیکھا تو وہ لمحہ بھر کو گڑبڑا سا گیا۔

''میں..... سمجھا نہیں؟'' خود کو پُر اعتماد ظاہر کرنے کے لیے اُس نے خوامخواہ ہی ہاتھ جیبوں میں ڈالے تھے۔

''بھئی، مطلب یہ ہے کہ ہمارے تمام آئیڈیاز جان کر تم ضرور اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچ رہے ہو گے۔'' گلابی لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ سجائے یقیناً وہ اُس کے خیالات جان گئی تھی۔

'ارے بچ ہی تو نہیں پایا زیمل بی بی!' اس نے دل میں کہا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ایسا کچھ نہیں۔'' وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا جبھی شانے اُچکاتے ہوئے بولا۔

اب وہ برآمدے کے عین سامنے واقع کامن رُوم کی طرف دیکھ رہا تھا، جہاں نوٹس بورڈ کے اردگرد کافی اسٹوڈنٹس اُن کے متوقع ''شکار'' کے طور پر جمع تھے۔

''زیمل! یار تم بھی ناں بس ایویں ہو۔ ارے اسے کیا فول بنانا؟ یہ تو اپنا کلاس فیلو ہے۔ چل جگر دوستی کر۔'' عماد نے آگے بڑھ کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سبوخ کے ساتھ ساتھ زیمل، ایمان اور جاذب بھی حیران رہ گئے۔ شموئیل اس دن اتفاق سے یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ ورنہ شاید وہ لوگ ایک دم اتنا فرینک نہ ہو پاتے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے دن وہ اس کی گروپ میں شمولیت پر نہایت چراغ پا ہوا تھا۔

''ارے چھوڑو یار!..... گلے ملو۔ آج سے تُو بھی اپنا ساتھی ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، وہ سب چیخے ہی تو تھے۔

''عماد!'' وہ تینوں ایک ساتھ بولے جبکہ سبوخ اس صورتِ حال پر حیران تھا لیکن اُسے حیران ہونے کا مزید موقع دیئے بغیر وہ دونوں بازو وا کرتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا اور بڑے ہی دوستانہ انداز میں اُس سے گلے ملنے لگا۔

''تو دوستو! آج میری طرف سے ٹریٹ۔'' شاید وہ حیرت سے سب کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔

''نیک کام میں دیر کیسی؟'' جاذب نے کہا۔ سبوخ بھی اب قدرے مطمئن ہو چکا تھا۔

''تو چلو پھر کینٹین۔'' عماد نے کہہ کر قدم بڑھائے تو ناسمجھی کی کیفیت میں وہ سب اُس کے پیچھے چل دیئے۔

''اتنا کھانا کہ مزید دو دن پھر میں کسی کو کھاتا ہوا نہ دیکھوں۔'' وہ لوگ کینٹین میں داخل ہو گئے تھے۔

''کیا یاد کرو گے، کبھی عماد سے پالا پڑا تھا۔'' فرضی کالر جھاڑتے ہوئے اس نے کہا تو کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے وہ لوگ مسکرا دیئے لیکن سبوخ کی نظریں تو شاید اِدھر اُدھر دیکھنے پر راضی ہی نہ تھیں۔ بیٹھا بھی تو عین زیمل کے سامنے والی کرسی پر تاکہ خوامخواہ ٹائم ضائع ہونے سے بچے اور جب نظر اٹھے تو اسی کے چہرے پر پڑے۔ اتنا دل پھینک تو وہ ہرگز نہ تھا لیکن شاید وہ چہرہ ہی کچھ خاص تھا۔

عماد نے کولڈ ڈرنکس، پیٹیز، سموسوں، چاٹ اور آئس کریم وغیرہ کا آرڈر دیا اور سب کو باقاعدہ اصرار کر کے کھلایا بھی اور اتنا کھلایا کہ لنچ تو کیا یقیناً وہ لوگ ڈنر بھی نہ کرتے۔ سبوخ کو ان سب کی کمپنی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب کتنے ہی پرانے دوست معلوم ہونے لگے تھے۔

''اوہ نو! یاد ہی نہیں رہا۔ پروفیسر ہمدانی نے بلایا تھا۔'' آئس کریم پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے ایک دم عماد کو یاد آیا تو جیسے ان سب ہی کو ایمرجنسی کال یاد آ گئی۔

''سبوخ یار! تم بیٹھو، ہم ابھی آئے۔'' کہہ کر وہ چاروں جلد بازی میں جو باہر نکلے تو کافی دیر تک نہ لوٹے۔ یہاں تک کہ وہ پہلو پہ پہلو بدلنے لگا لیکن جب کینٹین سے شوکت نے آ کر پیسوں کی طلبی کی تو گویا سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ گویا وہ لوگ اُسے بڑے مزے سے اُلّو بنا گئے تھے اور اتنے عام سے جوک کو وہ نظرانداز کر گیا تھا۔ خیر جو کچھ بھی تھا، جس جال سے وہ بچنا چاہتا تھا، دوستی کا دانہ دیکھ کر اسی میں قید ہو گیا تھا۔ اپنے تئیں وہ پہلا دن ہونے کی وجہ سے ذرا زیادہ روپے لایا تھا لہٰذا والٹ کھولا تو مطلوبہ رقم برآمد ہو جانے اور عزت بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

کینٹین سے باہر نکلا تو سب نے لان میں قہقہے برساتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ وہ تو شروع ہی سے ایسی رفاقتوں کا طلب گار تھا لہٰذا برا منائے بغیر کھلے دل سے ان کے ساتھ ہنسنے میں شریک ہو گیا کہ وہ مزید کوئی ٹینشن نہیں لینا چاہتا تھا۔ زندگی کو بڑی مشکل سے اُس نے سہل راہ پر ڈالا تھا۔

والدین کے انتقال کے بعد رشتے داروں کے روایتی سلوک نے اُسے اتنا بددل کر دیا تھا کہ وہ اپنا شہر ہی چھوڑ آیا اور جو تھوڑی بہت رقم اُس کے پاس تھی، اس سے پہلے تو ایک معمولی سی رہائش کا انتظام کیا اور اس کے بعد عرصہ پانچ سال سے وہ ہاسٹل میں مقیم تھا۔ تعلیم ہمیشہ سے اُس کی ترجیح رہی تھی اور پھر محنت کرنے میں اس نے کبھی عار نہیں سمجھا تھا کیونکہ تعلیم حاصل کرنے اور زندہ رہنے کے لیے اُسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ انہی دنوں اس نے جانا کہ پیسہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنا کچھ ہے۔ اور پھر جیسے جیسے اس کی تعلیمی قابلیت بڑھتی گئی، جاب بھی بتدریج بہتر ہوتی چلی گئی۔

❀---❀---❀

''مے آئی کم اِن سر!'' دروازہ نوک کر کے اُس نے رسماً اجازت طلب کی تھی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہوا۔

''ویل ڈن سبوخ رضا! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔'' ضیا صاحب کے ہاتھ میں سیلنگ رپورٹ تھی۔ صرف دو ماہ میں ان کے تیار کردہ ایڈورٹائز کی پروڈکٹ 70 فیصد لوگوں میں مقبول ہو چکی تھی جس کی سب سے بڑی وجہ اچھی اور مؤثر ایڈورٹائزمنٹ تھی۔

''سر! یہ تو آپ کی مہربانی ہے آپ نے مجھے کام کرنے کا موقع دیا۔ ورنہ اس فیلڈ میں نہ تو میری قابلیت تھی نہ ہی تجربہ۔''

''ارے نہیں سبوخ رضا! آپ میں واقعی بہترین صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اور مجھے فخر ہے کہ آپ میری فرم کا حصہ ہیں۔'' وہ اس کے کام سے بے حد خوش تھے جبھی فراخ دلانہ تعریف کر رہے تھے۔

یونیورسٹی اور ہاسٹل کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے پارٹ ٹائم جاب کر رکھی تھی اور یہ

ساری صورتِ حال ضیا صاحب کے علم میں تھی جبھی انہوں نے جاب دیتے وقت مکمل ذمے داری سونپنے کے بجائے اُسے اسسٹنٹ ایڈورٹائزمنٹ آفیسر کے طور پر رکھا تھا جہاں روزانہ پانچ گھنٹے وہ مقبول صاحب کو اسسٹ کیا کرتا تھا لیکن ان دنوں چونکہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ ورلڈ ٹور پر گئے ہوئے تھے سو جب ایک مشہورِ زمانہ کمپنی نے مارکیٹ میں پروڈکٹ لانچ کرنے کے لیے ایڈورٹائزمنٹ کے لیے ان لیے ان سے رجوع کیا تو ساری ذمے داری اُس پر آن پڑی، جسے اُس نے اَن تھک محنت سے پورا کرنے کی کوشش کی اور آج آنے والی سیلنگ رپورٹ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ یہ کام کرنے میں مکمل مہارت رکھتا ہے۔ جبھی خوش ہوتے ہوئے ضیاء صاحب نے اس کے لیے بونس کا اعلان کر دیا۔

❀---❀---❀

آج زیمل کی برتھ ڈے تھی۔ صبح تو ان لوگوں نے یونیورسٹی میں ہی اس دن کو سیلیبریٹ کیا لیکن شام کو سبوخ نے اُسے خود انوائٹ کیا تھا۔ وہ بات جو آج تک اُس کے دل میں تھی، اُس وہ زبان تک لے آنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں آج وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ نیوی بلیو بیل بوٹم پر ہمیشہ کی طرح چھوٹی سی شرٹ پہنے وہ اس کے سامنے موجود تھی۔ تازہ پھولوں سے مزین بکے اور اظہار کے لفظوں میں گندھا خوبصورت سا کارڈ جب اُس نے زیمل کو دیا تو پڑھ کر وہ یوں مسکرائی جیسے یہ سب حسبِ توقع تھا۔

''اُسے کہو کہ بہت نامراد شے ہے جنوں
اُسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اُس کا''

''ہوں! شعر تو زبردست ہے۔'' گہری مسکراہٹ سے سبوخ کی طرف دیکھا جو اس کے جذبات جاننے کو بے تاب تھا۔

''یہ صرف شعر نہیں ہے بلکہ..... بلکہ میرے دل کی سچائی بھی ہے۔'' اُس کی بات سن کر وہ ہنستے ہوئے آگے کو جھکی تو ایک بار پھر اس کی نظریں اس کے گلے میں پڑے کراس سے اُلجھنے لگیں۔

''سبوخ! تم نے تو بہت دیر میں اقرار کیا ہے جبکہ یہی بات تمہاری نظروں نے مجھے کافی پہلے سمجھا دی تھی۔'' وہ اس کی بے چینی کا مزہ لیتے ہوئے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میرے اور تمہارے جذبات ایک جیسے ہیں لیکن کیا تم جانتے ہو کہ میں کرسچن ہوں؟''

''ارے تو کیا ہوا؟ اہلِ کتاب سے شادی تو جائز ہے نا یار!'' وہ اتنی بے تابی اور برجستگی سے بولا کہ بے ساختہ اُس کا قہقہہ اُمڈ آیا۔

''مجھ سے شادی کرو گی..... مجھ سے شادی کرو گی.....'' سلمان خان کے ہی انداز میں ایک بار پھر وہ ٹون میں آ چکا تھا اور اُس کے لبوں پر گیت تھا۔

❀---❀---❀

پروفیسر حسام چونکہ مارکنگ کرتے وقت اٹینڈنس کو بھی خاص اہمیت دیا کرتے تھے لہٰذا کوئی چاہے یا نہ چاہے، اُسے بقول سبوخ کے یہ ''حبس بے جا'' ضرور بھگتنا پڑتا۔ زیمل، جاذب، ایمان اور عماد دو ہفتوں کے لیے ٹور پر گئے ہوئے تھے اور ان سب کے بے حد اصرار اور ضد کے باوجود وہ اپنی پروفیشنل مصروفیت کی وجہ سے جا نہیں پایا تھا لہٰذا پروفیسر حسام کی کلاس اٹینڈ کرتے ہوئے ایک دم ہی اس کے دل میں شرارت کا خیال آیا۔ آج ان سب کی غیر حاضری کا پہلا روز تھا، سو دوستی نبھانے کا سوچتے ہوئے ان کے نام آنے پر مزے سے آواز بدل کر ''یس سر'' کہنے لگا۔ پھنسا تو تب جب ایمان کی باریک سی نسوانی آواز بنانے کی کوشش میں اُسے ''مردانہ وار'' چھینک آ گئی۔ اس کے بعد تو جیسے کلاس کے در و دیوار قہقہوں سے گونجنے لگے اور شاید دیر تک کمرے میں یہی سماں رہتا لیکن ڈائس پر پروفیسر حسام کی ٹک ٹک نے ماحول کو پھر سے سنجیدہ بنا دیا تھا۔

''سبوخ رضا! آپ کلاس کے بعد مجھ سے ملیں۔'' کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ ملا تو ان سے یہ سوچ کر تھا کہ اب یقیناً کافی دیر تک ان کا نصیحتوں بھرا لیکچر سننا پڑے گا لیکن اس کے برعکس اس کے سوری کہنے پر مسکرا دیئے۔

''میں جانتا ہوں بیٹا! طالب علمی کے دور میں اسٹوڈنٹس کی طرح کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں کو اپنے اوپر واجب خیال کرتے ہیں۔'' ان کے لہجے کا ٹھہراؤ اور دھیمی سی مسکراہٹ اُسے اپنے بچپن اور والد کی یاد دلا گئی کہ وہ بھی شرارتوں کو بچوں کا فطری حق سمجھ کر مسکرا دیا کرتے تھے۔

''یونیورسٹی کے بعد آپ کی کیا روٹین ہے؟'' وہ چونکہ جانتے تھے کہ سبوخ رضا ایک ہائپر ایکٹیو لڑکا ہے لہٰذا اس سے بات کرنے میں وہ ہمیشہ لطف محسوس کیا کرتے تھے۔ خود تو ینگ تھے ہی لیکن پھر بھی اپنے مرتبے کے لحاظ سے اسٹوڈنٹس کو بیٹا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

''سر! یونیورسٹی کے بعد ایک ایڈ کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔ گھر ہے نہ گھر کی فکر، ہاسٹل کی بے فکر زندگی ہے اور بس۔'' اب وہ اپنی ازلی فرینک نیس سے ریلیکس ہو کر بات کر رہا تھا۔

''ہوں.....'' وہ کسی سوچ میں تھے۔

''کبھی مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی آپ نے؟''

''جی؟.....میں سمجھا نہیں۔'' اس اچانک سوال پر وہ حیران تھا۔

''میرے ساتھ درس اٹینڈ کرنے چلو گے؟''

''شیور سر! وائے ناٹ۔'' زیمل تو تھی نہیں لہٰذا آج کل وہ فارغ ہی فارغ تھا لہٰذا فوراً ہامی بھر لی۔

سبوخ کے بنا زیمل کا دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ اتنی بے تابی اور بے خودی تو اس پر بھی عیاں نہ تھی اپنی اس کیفیت کو وہ کس سے بیان کرتی کہ وہ سب تو اسے چھیڑنے پر تُل جاتے۔ موبائل سبوخ کے پاس تھا نہیں کہ بات ہوتی یا وہ SMS کے ذریعے اپنے دل کا حال اُس سے بیان کر ڈالتی۔ ہاسٹل کے نمبر پر وہ کتنی ہی مرتبہ فون کر چکی تھی جو کبھی تو انگیج ملتا ورنہ اس سے بات نہ ہو پاتی۔ نتیجتاً اس نے جلدی واپس جانے کا شور مچا ڈالا۔

''اے لڑکی! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟'' عماد اور ایمان شاپنگ کر کے لوٹے تھے کہ جاذب کی اطلاع پر فوراً اُس کی طرف دوڑے آئے۔

''بس، میرا دل نہیں لگ رہا، اب واپس چلیں۔'' جمائی لیتے ہوئے اپنے اوپر مزید سستی طاری کر کے وہ بولی تو ایمان ہنس دی۔

''پہلے چیک تو کر لو، دل ہے بھی یا.....''

''اوووو.....'' معنی خیز انداز میں تینوں نے اُسے چھیڑا تو وہ بجائے بلش ہونے کے مزید ڈھیٹ بن گئی۔

''ہے تو۔ لیکن اگر نہ ہو تو کوئی اعتراض؟''

''اوووو.....'' ایک بار پھر ان سب نے اُسے چھیڑا۔

''زیمل! بور نہیں کرو۔ اگر شہر سے باہر نکلنے کا پروگرام بن ہی گیا ہے تو چند روز انتظار کر لو نا۔'' ایمان بولی۔

''وہ لوگ ایمان کے چچا کے گیسٹ ہاؤس میں رُکے تھے جو کہ کوئٹہ کا مشہور گیسٹ ہاؤس تھا۔ اس کے بعد ان کا سوات جانے کا پروگرام تھا جس کے لیے سب سے زیادہ بے چین زیمل ہی تھی لیکن کیا کرتی۔ اُس کا دل جواب سبوخ کے لیے بے چین ہوا جا رہا تھا جس نے خود سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

''آج جانے کی ضد نہ کرو.....ووو.....آج جانے کی ضد نہ کرو۔''

آج شاید عماد نے سبوخ کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی تھی اور سب نے مل کر اس کا ساتھ دیا تو اسے ماننے ہی بنی۔ اور ویسے بھی یہاں آ کر سبوخ کے لیے جو جذبات اُس پر آشکار ہوئے تھے، وہ قریب رہ کر کبھی نہ ہوتے۔

❀---❀---❀

دو دن بعد ان کی روانگی تھی۔ وادیٔ سوات کی دلفریبی کو وہ سب ہی اپنے دل میں اُتار لینا چاہتے تھے۔ کیا یورپ اور کیا اس کی حسین ریاستیں۔ جتنا حُسن اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو عطا کیا ہے، اس کے آگے دنیا کا ہر خطہ ہیچ نظر آتا ہے۔ پاکستان کی اکثر خوب صورت ترین جگہوں کا سیاحوں کا تو کیا، خود وطنِ عزیز

کے باسیوں تک کو علم نہیں ہے۔

''اگر ہمارا ٹورازم ڈیپارٹمنٹ ایسی تمام حسین جگہوں کی مناسب کوریج پیش کرے تو سیاحوں کے ذریعے ہمارا ملک کتنا زرِمبادلہ کما سکتا ہے۔'' وہ لوگ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں بیٹھے تھے، سامنے آتی سیاحوں کی جوڑی دیکھی تو جاذب بول اُٹھا۔

''ارے، سوات تو پھر ویل نون جگہ ہے بھئی۔ کچھ جگہیں تو ایسی ہیں جہاں تک پہنچنے کے لیے نہ تو گاڑی میسر ہوتی ہے نہ سڑکیں۔'' عماد نے بھی جاذب کے خیال کی تائید کی جبکہ زیمل اور ایمان باریک موتیوں سے مزین ہاتھ کے کام والی ٹوپیاں پہنے سبز چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ ایک دم موبائل کی میسج سے زیمل چونک گئی۔

''دُور جا کر قریب ہو اتنے
ہم سے تم کب قریب تھے اتنے''

چاروں طرف I Miss U کا فریم بنا کر الفاظ کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کر دیا گیا تھا۔ ایک ایک لفظ کو نظروں کے رستے دل میں اچھی طرح save کر لینے کے بعد اس نے موبائل میں بھی save کیا اور میسج کے آخر میں درج نمبر پر فون کرنے لگی لیکن اتفاق سے اس کے موبائل کی چارجنگ ختم ہو رہی تھی سو ان میں سے کسی کا لینے کے بجائے اس نے یہ کام رات تک کے لیے موقوف کر دیا کہ اگر وہ ان کی ''خدمت'' حاصل کرتی تو سب اُسے چھیڑ چھیڑ کر اُس کی ناک میں دم کر دیتے۔

❀---❀---❀

کہاں تو ڈیپارٹمنٹ کا کوئی اسٹوڈنٹ اُس کی شوخیوں سے محفوظ نہ تھا لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ آہستہ آہستہ اس میں کافی تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ وہ جو بے حد آزاد خیال اور ہر لحاظ سے کیئر فری تھا، مذہب کی طرف اُس کا رجحان کافی بڑھتا جا رہا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد درس کی کلاسز اٹینڈ کرتا اور ہلکے پھلکے انداز میں دوسروں کو بھی اس جانب مائل کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ تو بس چلتا پھرتا گیت مالا مشہور تھا۔ ہر وقت گانا گنگنانا اور اگر موڈ کچھ زیادہ ہی بہتر اور موج میں ہوتا تو لان میں ہو یا کینٹین، بھنگڑا ڈالنے یا ڈسکو کرنے میں بھی عار نہ سمجھتا۔ اپنے اندر کی تنہائی دُور کرنے کی کوشش میں وہ ایک من موجی طبیعت کا مالک مشہور ہو چکا تھا۔ ہنس مکھ اور ملنسار اتنا کہ ہر کوئی اسے اپنا ہی دوست خیال کرتا۔ لیکن اب اس کی گفتگو میں گانوں کے بجائے آیاتِ قرآنی اور احادیث شامل ہونے لگی تھیں لیکن وہ یہ سب کسی پر بھی زبردستی مسلط نہیں کرتا تھا۔ اس کی طبیعت میں پختگی لانے اور شخصیت کی درست سمت میں تعمیر کا سہرا یقیناً پروفیسر حسام کے سر تھا جن سے پہلی ملاقات میں ہی ان کے اندازِ گفتگو

(جو کہ وہ کلاس کے برعکس بالکل دوستوں کی طرح کر رہے تھے) نے اسے اتنا متاثر کیا کہ جب انہوں نے درس میں چلنے کا کہا تو وہ انکار نہ کر سکا۔

زیمل چونکہ ان دنوں وہاں موجود نہیں تھی لہٰذا باقاعدگی سے درس میں جانے لگا۔ اور پھر تو جیسے اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ تبھی اس نے جانا کہ آج سے پہلے کی گزاری گئی تمام زندگی لاحاصل تھی اور جب اسے احساس ہوا کہ یہ طرزِ زندگی آخرت میں کس قدر تکلیف کا باعث بنے گا، چاہتا تھا کہ تمام لوگ دنیا کی چکاچوند میں سے مناسب وقت آخرت کی تیاری کے لیے وقف کریں۔ لیکن یہ سعادت بھی خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آتی تھی اور اس کی شدت سے خواہش تھی کہ وہ زیمل کو بھی اسی رستے پر ساتھ لے کر چلے جسے وہ خود سے زیادہ چاہنے لگا تھا اور جو اس کے بدلتے ہوئے روّیے اور عادات کو دیکھ کر تذبذب کا شکار تھی۔

انجانے میں ہی دونوں ایک دُوجے کے اتنے قریب آ چکے تھے کہ اب دُوری ممکن نہیں رہی تھی اور اس حقیقت سے بھی سبوخ انہی دنوں آشنا ہوا تھا کہ اہلِ کتاب سے شادی کر لینا جائز تو ہے لیکن سوچوں اور عقائد کا یہ تضاد کبھی اذہان کے تصادم کا باعث بھی بن جاتا ہے جبھی اس نے پروفیسر حسام کا طریقہ اختیار کرنے کا سوچا۔

''زیمل!'' وہ دونوں لائبریری میں اکنامکس کی بُک سامنے رکھے بظاہر نوٹس بنا رہے تھے لیکن شاید دونوں ہی موقع سے غیر حاضر تھے۔

''ہوں..... آں..... ہاں.....'' زیمل نے جیسے کسی خیال سے چونکتے ہوئے سر اوپر اٹھایا تو سبوخ کی سیاہ آنکھوں میں لمحہ بھر کو اپنا دل ڈولتا محسوس ہوا۔ ٹراؤزر شرٹ پر خوب صورت صراحی دار گردن سے مس ہوتا گولڈ سے بنا صلیب کا نشان اب اسے ایک دیمک کی طرح کھانے لگا تھا۔ مختلف ڈیزائن اور میٹریل کے جانے کتنے کراس اُس کے پاس تھے جنہیں محض اسٹائل کے لیے وہ استعمال کیا کرتی تھی کہ مذہب سے اُس کا واسطہ صرف کرسمس یا ایسٹر تک ہی تھا۔

''شام کو فارغ ہو؟'' اُس کی دِلی کیفیت جاننے کے باوجود وہ بولا تو وہ سفید کاغذ پر خوامخواہ آڑھی ترچھی لائنیں لگانے لگی۔

''کیوں؟''

''میرے ساتھ درس لینے چلو گی؟''

یہ درست تھا کہ وہ اُسے اسلام کی دعوت دینا چاہتا تھا لیکن وہ خود سے اُسے کچھ کہنا مناسب خیال نہیں کرتا تھا کہ ایسا نہ ہو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر محض اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے وہ یہ قدم اُٹھا لے بلکہ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد وہ مختلف کتابوں کا مطالعہ کرے۔ ذہن میں موجود اُلجھنوں،

دل کے وسوسوں اور دماغ کے سوالات کے ساتھ ٹھوس دلائل سے نمٹے اور تب اگر وہ اپنے دل و دماغ کو مطمئن کر پائے، تب یہ انتہائی قدم اٹھائے تاکہ بعد میں یہ عمل اس کے لیے پچھتاوے کا باعث نہ بنے۔

''درس اور میں.....؟'' اُس کی حیرت بجا تھی۔

''ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' کتاب بند کر کے اب وہ والٹ میں لائبریری کارڈ چیک کر رہا تھا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے سبوخ! لیکن.....'' وہ ہنوز متذبذب تھی۔

''زیمل! سچ کہوں؟'' وہ لمحہ بھر کو رُکا۔ ''تو سچ یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے مذہب سے متعارف کروانا چاہتا ہوں۔'' اُس کے چہرے پر موجود کشمکش دیکھتے ہوئے وہ کاؤنٹر پر بک ایشو کروانے چل دیا۔

❀---❀---❀

''زیمی بی بی! شازل صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی وہ فیشن میگ کی ورق گردانی کے ساتھ ساتھ میڈونا کا میوزک کنسرٹ دیکھ کم اور سن زیادہ رہی تھی جب جمیلہ نے ان کے بزنس پارٹنر مسٹر پیٹرک کے بیٹے کی آمد کے بارے میں بتایا۔

''اوہ نو، اُسے بھی اسی وقت آنا تھا۔'' برا سا منہ بناتے ہوئے سلک کے بھاری پردوں کے عین اوپر لگے خوب صورت سے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے میگ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''مما کہاں ہیں؟'' بیزاری سے پوچھا گیا۔

''وہ تو جی چرچ کے ساتھ جو مشنری اسکول بن رہا ہے نا جی، اُس کی میٹنگ میں گئی ہیں۔'' جمیلہ نے مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

''اسے ٹال دو کہ میں پریکٹس کے لیے گئی ہوں۔'' نہ صرف خود وہ نازک سی تھی، اس کی آواز بھی بے حد سریلی تھی۔ یوں تو وہ کبھی اتوار کو بھی چرچ نہیں جاتی تھی لیکن خصوصی تقریب میں مما کی ضد پر اُسے ضرور حصہ لینا پڑتا جبھی اُس نے یہ عذر تراشا تھا۔

''وہ.....وہ جی میں نے کہا ہے کہ.....کہ آپ گھر پر ہیں۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''ہزار دفعہ سمجھایا ہے پہلے پوچھ لیا کرو۔ لیکن وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ جاؤ اب میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو؟.....آتی ہوں۔'' میگ سائیڈ ٹیبل پر پٹخ کر بالوں کی ننھی سی پونی بنائے وہ باہر آ گئی۔

''اوسویٹی!.....کتنا انتظار کرواتی ہو تم۔'' شازل صوفے پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کا نرم و نازک ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

''ارے نہیں تو۔ بس یونہی.....''

وہ زبردستی مسکرائی تھی کہ وہ بزنس میں 60 فیصد کا حصے دار تھا اور مما کی خصوصی ہدایت تھی کہ اُسے کسی

طور ناراض نہ کیا جائے۔

''جانتی ہو تمہارے انتظار میں ایک لمحہ بھی صدی بن کر بیتتا ہے مجھ پر۔'' وہ بولا تو ایک دم ہی اُسے سبوخ کا خیال آیا لہٰذا آہستگی سے ہاتھ چھڑا کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھی۔

''کوئی کام تھا شازل؟'' جمیلہ چائے کے لوازمات سرو کر رہی تھی جب اس نے پوچھا۔

''تمہیں دیکھنا بھی تو ایک کام ہے۔'' عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ بولا تو اسے پھر سبوخ کا خیال آ گیا۔ کتنی عزت اور احترام ہوتا ہے اس کی نظروں میں۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے کیوں آج وہ بار بار سبوخ کا موازنہ کر رہی تھی جبکہ ان دونوں میں تو کوئی ایک بھی قدر مشترک نہ تھی کہ وہ موازنہ کرتی۔ ابھی وہ سوچ میں تھی کہ اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے تو آج سبوخ سے درس میں پہنچنے کے بارے میں کہا تھا۔

''شازل! آئی ایم سوری۔ مجھے ایک ارجنٹ کام یاد آ گیا ہے۔ تم چائے پیو، پھر ملیں گے۔ ہاں، بائے۔'' یاد آتے ہی اس نے چائے کا کپ ٹرالی میں رکھا اور عجلت میں اس سے ایکسکیوز کرتے ہوئے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھے بنا تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

دس منٹ میں فریش ہو کر حسبِ معمول جینز اور گھٹنوں کو بمشکل چھوتی اپنی دانست میں لمبی شرٹ پہن کر کلائی پر موتیوں، لیدر اور دھاگوں سے بنے دو تین بریلسٹ جو وہ سوات سے لائی تھی، پہنے۔ وہ بالکل تیار تھی سو فوراً گاڑی کی چابی اُٹھا کر ہوا کی سی رفتار سے لاؤنج، ڈرائنگ رُوم عبور کر کے کار پورچ تک پہنچی اور سبوخ کے بتائے گئے ایڈریس کے مطابق ڈرائیو کر کے مقررہ مقام تک جا پہنچی۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک منفرد قسم کی بھینی بھینی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ گتے کے بورڈ پر سیاہ روشنائی سے دائیں طرف برائے خواتین اور بائیں طرف مرد حضرات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ کچھ جھجکتے ہوئے وہ دائیں جانب مڑی، جہاں سب کی جوتیاں ترتیب سے رکھی گئی تھیں سو تقلید کرتے ہوئے اس نے بھی جھک کر جوتے کے اسٹرپ کھولے اور اندر داخل ہو گئی جہاں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ تمام خواتین نہایت عقیدت اور توجہ سے خاتون مقررہ کا بیان سن رہی تھیں۔ کچھ پر تو باقاعدہ رقت طاری تھی۔ سب کے لباس مختلف رنگ اور ڈیزائن کے ضرور تھے لیکن ایک بات جو سب میں مشترک تھی، وہ یہ کہ تمام سر ڈھکے ہوئے تھے۔ بلکہ کچھ خواتین نے تو اسکارف کے ذریعے سر کے تمام بالوں تک کو چھپا رکھا تھا۔

اس سارے ماحول میں اُسے اپنا آپ کچھ مس فٹ سا لگ رہا تھا۔ نہ تو اس کے پاس سر ڈھانپنے کے لیے کوئی چیز تھی، نہ ہی محفل کے لحاظ سے معقول لباس۔ یوں تو جینز شرٹ ہمیشہ سے اس کا پسندیدہ لباس رہا تھا لیکن آج اسے نہ صرف اپنے لباس کے انتخاب پر افسوس کرنا پڑ رہا تھا بلکہ اپنی عقل پر بھی کہ اس نے سوچا ہی نہیں آخر وہ درس اٹینڈ کرنے جا رہی ہے تو کپڑے کس طرح کے ہونے چاہئیں۔ ویسے اسلام کیا،

اسے تو اپنے مذہب کے متعلق کوئی معلومات نہ تھیں کہ مسٹر اور مسز جیکب کی حد سے زیادہ سوشل لائف انہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس کچھ دیر ہی بیٹھ کر مذہب کیا، اس کی ذات ہی کو ڈسکس کر سکیں۔ لیکن بہرحال وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ کم از کم ایسی جگہ پر اُسے ''ڈھنگ'' کے لباس میں آنا چاہئے تھا۔

خاتون مقررہ کے کہنے پر تمام خواتین با آواز بلند شاید کوئی عربی آیت پڑھ رہی تھیں جس کے بعد اب درس کا سلسلہ وہیں سے جوڑا گیا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''یہ دنیا انسانوں کا سمندر ہے جس کی تمام موجیں وحدت کی تابع ہیں اور یہ وحدت نہ صرف انسان بلکہ شاید کائنات کی ہر چیز کی فطرت میں داخل ہے کیونکہ کائنات کا خالق و مالک بذاتِ خود ''وحدہٗ لاشریک ہے'' اور کہو کہ اللہ ایک ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور اُس کا کوئی ہمسر نہیں۔ ہاں عزیز بہنو! توحید کی سچائی کو اپنے دل میں ثبت کر لیں اور پھر اسی صراطِ مستقیم پر آگے سے آگے قدم بڑھانے کی سعی کریں تو رب العزت خود رہنمائی فرمائے گا۔ ذرا سوچیں کیا اس کا یہ احسان کم ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا کر کے روزِ اوّل سے ایمان کو ہمارے دل میں جگہ دے ڈالی تو پھر کھوجنا تو ہمارا کام ہے، بالکل اسی طرح جیسے گھر میں کوئی شوپیس موجود ہو۔ لیکن اس پر روز پڑنے والی دھول مٹی صاف نہ کی جائے تو ایک دن آئے گا کہ وہ اپنی شناخت کھو دے گا اور یہ شوپیس اگر گھر میں موجود نہ ہو تو خرید کر بھی رکھا جا سکتا ہے جس کی قیمت صرف کلمۂ شہادت ہے یعنی اسلام یا ایمان صرف ہم مسلمانوں کی جاگیر نہیں۔ یہ تو کھلی اراضی ہے۔ مالک کے حضور عرضی پیش کر کے جو چاہے اپنے نام الاٹ کروا لے اور ہو سکتا ہے پھر ہم سے بھی آگے نکل جائے۔'' مقررہ لمحہ بھر کو رُکیں تو تمام خواتین عقیدت سے پڑھنے لگیں۔

''یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے''

''ہمیں چاہئے کہ ہمارے جسم کا رُواں رُواں انکساری کی تصویر ہو۔ دل و دماغ اس کے سامنے بچھے ہوئے ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ جسم بھی اس کے آگے جھکا ہو اور ہم اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنے ایمان کی سلامتی اور اس کے سدا راضی رہنے کی دعا قبولیت کے یقین کے ساتھ مانگیں تو اِن شاء اللہ وہ ہمیں خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔''

خاتون درس دے رہی تھیں لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اسی سے مخاطب ہیں۔ اسے ایک دم ہی اپنا آپ تضادات میں گھرا محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ پیاس، کچھ تشنگی، اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنی کیفیت کو کیا نام دے۔ درس کے خاتمے پر خاتون ذاکرہ نے سب سے درود شریف پڑھنے کی استدعا کی تو با آواز بلند تمام خواتین وہی عربی آیات دُہرانے لگیں جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی پڑھی گئی تھیں۔ وہ خالی الذہن بیٹھی یہ

سب دیکھ رہی تھی کہ درود شریف پڑھتے ہوئے ان کے چہرے کتنے پُرسکون ہیں۔

''آپ کو آپا نے اندر بلایا ہے۔'' مکمل حجاب لیے معصوم سے چہرے والی ایک نوعمر لڑکی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئی۔

''مجھے؟.....مگر.....'' وہ ایک دم حیران ہوئی تھی۔

'نہ جان نہ پہچان۔ آخر مجھے کیوں بلایا ہے؟ ہوسکتا ہے میرے لباس پر باتیں سنائیں یا شاید آئندہ آنے کو منع کر دیں۔' انہی سوچوں کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی تو ایک مہربان سی مسکراہٹ کے ساتھ آپا اُس کی منتظر تھیں۔

''سب سے پہلے تو بیٹا! آپ کو خوش آمدید اور پھر بے حد مبارک باد کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل کو ہدایت کے لیے منتخب کیا۔''

''جی..... جی شکریہ!'' ان کے شفیق لہجے اور اپنے اندازوں کے غلط ثابت ہو جانے پر وہ تھوڑا سا گڑبڑا گئی تھی۔ شاید وہ اس کے گلے میں جھولتا صلیب دیکھ نہیں پائی تھیں یا شاید دیکھ کر نظرانداز کر گئی تھیں۔

''گو کہ ہم سب جانتے ہیں کہ کیا اچھا اور کیا برا ہے۔ لیکن رہنمائی اور پھر بتائی گئی تعلیمات پر مستقل مزاجی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔'' وہ اُٹھیں اور ساتھ ہی موجود کتابوں سے بھری الماری کی دراز کھول کر کچھ نکالا اور پھر اس کے قریب آ گئیں۔

''بیٹا! آپ چونکہ آج پہلی دفعہ یہاں آئی ہیں سو یہ تحفہ میری طرف سے آپ کے لیے۔'' خوبصورت سرورق سے مزین ایک کتاب اور سیاہ رنگ کا حجاب اسے دیتے ہوئے وہ بولیں تو وہ ایک دم ہی پُرسکون ہو گئی ورنہ اسے تو خدشہ تھا کہ شاید وہ اسے اتنی پاکیزہ محفل میں اس حلیے میں آنے پر باتیں سنائیں گی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اتنے خوب صورت انداز میں انہوں نے یہ مقصد پورا کیا تھا کہ وہ جھوم کر رہ گئی۔

''بے حد شکریہ!'' اس نے مشکور ہوتے ہوئے دل سے کہا تھا۔

''مجھے امید ہے کہ آپ اس تحفے کو استعمال بھی کریں گی۔'' انہوں نے ایک بار پھر دھیمی مسکراہٹ سے کہا یا شاید یہ مسکراہٹ ان کے نقوش ہی کی طرح چہرے کا ایک حصہ تھی جو مستقل ان کے چہرے کا احاطہ کیے رکھتی۔

''جی، جی اِن شاء اللہ۔'' سبوخ کے منہ سے اس طرح کے الفاظ سن کر آج پہلی دفعہ اس کے منہ سے بھی نکلا تھا جبھی اس نے دل میں آئندہ بھی آنے کا ارادہ کر کے آپا سے مسکراتے ہوئے اجازت چاہی جو اپنے اس عمل اور خوبصورت مشفقانہ لہجے سے اس کے دل میں گھر کر گئی تھیں۔

''سبوخ! تم موبائل کیوں نہیں لیتے؟'' بلیک ٹراؤزر پر اورنج شرٹ پہنے بالوں کو بمشکل کومب کلپ میں جکڑے وہ اس کے سامنے تھی۔

''موبائل.....ہونہہ!'' اس نے ٹالنے والے انداز میں گردن ہلائی۔

''بھئی وقت کی بیسک نیڈ ہے یہ۔'' پاس سے گزرتے عماد کو مسکرا کر ہیلو کہتے ہوئے وہ ہنوز اپنی بات پر جمی ہوئی تھی۔

''زیمل! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے والا بندہ ہوں اور دوسری بات یہ کہ مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہاسٹل میں فون کی سہولت موجود ہے اور کسی بھی وقت وہاں کال کی اور سنی جا سکتی ہے۔'' اب کے اسے تفصیلاً جواب دینا پڑا تھا تاکہ وہ مطمئن ہو جائے۔

''ہاں ہاں، میں بیس بائیس دن تم سے دُور رہی لیکن صرف تین مرتبہ بات ہو سکی تھی ہماری۔'' وہ اِٹھلائی۔

''ان دنوں میری مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ درس باقاعدگی سے اٹینڈ کرنا تبھی تو شروع کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، تم میرا رکھ لو۔'' بِنا سوچے سمجھے بیگ میں سے جدید ماڈل کا چھوٹا سا موبائل نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ بولی تو اُس کی رگیں تن گئیں۔

''زیمل.....!'' قدرے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے محض اس کا نام ہی تو لیا تھا لیکن اسی لمحے زیمل کو احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط کر بیٹھی ہے۔ سبوخ کی آنکھوں میں پھیلا اضطراب زیمل کو اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہا تھا۔

''اوہ.....آئی ایم ریئلی سوری۔'' نازک انگلیوں کو مسلتے ہوئے اس نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ جانتی تھی کہ سبوخ کو اس طرح کی آفرز سے سخت چڑ ہے۔

''اِٹس او کے!'' توقع کے برعکس اس نے ہاتھ کے اشارے سے فوراً اسے معاف بھی کر دیا۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ کتنا بدلتا جا رہا ہے وہ۔ اتنی متانت، اتنا ٹھہراؤ۔ لیکن یہ الگ بات کہ سارا غصہ اس نے محض جبڑوں کی مضبوطی آزمانے پر صرف کیا تھا۔

''وہ دراصل، میں کل درس میں گئی تھی۔ وہاں تم کہیں نظر نہیں آئے تو فوراً تمہارے ہاسٹل فون کیا جو مستقل انگیج ملتا رہا بس اسی لیے۔'' یوں وضاحت کرتی وہ کتنی معصوم لگ رہی تھی۔

''کیا..... واقعی تم درس میں گئی تھیں؟'' حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی اس کے چہرے اور لہجے پر غالب تھی۔

''ہاں، آپا بہت اچھی طرح ملی تھیں۔ شاید دوبارہ بھی جاؤں۔'' اس کے چہرے پر پھیلتے خوشی کے رنگ دیکھ کر تو ڈھیروں اطمینان اسے اپنے خون میں سرایت کرتا محسوس ہونے لگا۔ اور یہی تو وہ چاہتی تھی۔ ایسے ہی سپنے تو وہ دن رات جاگتی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی جن میں وہ تھی، سبوخ اور خوشیاں.....اور

اسی کی خاطر اس نے دوبارہ درس اٹینڈ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ کھوجنا چاہتی تھی کہ وہاں ایسا کیا سحر ہے جس نے سبوخ کو سرتا پا بدل کر رکھ دیا ہے۔

❀---❀---❀

سبوخ رضا اس وقت آفس میں ہی موجود ایک کمرے میں نمازِ مغرب ادا کر رہا تھا جس کے لیے اس نے ضیا صاحب سے خصوصی اجازت لے رکھی تھی۔ ابھی سلام پھیر کر وہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ فرید بابا نے اسے ضیا صاحب سے مل لینے کو کہا۔ لہٰذا نماز مکمل کر لینے کے بعد جائے نماز تہ کر کے اس نے دراز میں رکھی اور جوتے پہن کر اندر داخل ہوا۔

''سر! آپ نے مجھے بلایا تھا؟'' کرسی سنبھالتے ہی وہ گویا ہوا۔

''جی ہاں..... وہ غیاث صاحب کا کام کہاں تک پہنچا؟'' ٹیبل پر موجود فائل پر سائن کرنے کے بعد اسے ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''جی سر! ان کی پروڈکٹ کی ایڈورٹائزمنٹ کے لیے چند آئیڈیاز گرافکس کے ساتھ اس فائل میں اٹیچ کر دیئے ہیں۔ ایک دو دن میں ان سے مل کر فائنل کر لیں گے تاکہ مزید ورک آؤٹ کیا جا سکے۔'' ساتھ لائی گئی فائل اس نے ضیا صاحب کی طرف بڑھائی۔

''تمام آئیڈیاز ہی نو ڈاؤٹ بہترین ہیں۔ لیکن سبوخ!..... اُن کی ڈیمانڈ تمہارے سابقہ کام سے مختلف اور ہٹ کر ہے۔'' فائل میں موجود پرنٹ آؤٹس کی ورق گردانی کرتے ہوئے وہ بولے تو سبوخ کے چہرے پر سوالیہ تاثر اُبھر آیا۔

''گو کہ ہمارا تمام کام انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کا ہوتا ہے لیکن دراصل.....'' وہ چونکہ اس کی شخصیت کے نئے رُخ سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے ہچکچا رہے تھے۔

''دراصل وہ پروڈکٹ کے ساتھ ساتھ ماڈلز کو بھی ایکسپوز کرنے کے خواہاں ہیں اور ان کی مطلوبہ ماڈلز کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' بات مکمل کرنے کے دوران وہ سبوخ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور تاثرات کا بخوبی جائزہ لے رہے تھے جو ہرگز موافق نظر نہیں آتے تھے۔

''سر! ظاہر ہے کہ میں یہاں کام ہی کرنے کا معاوضہ وصول کرتا ہوں۔ اپنے نظریات یا خیالات کسی پر زبردستی تھوپنا ہرگز میرا مقصد نہیں۔ لیکن سوری سر! اب اس طرح کا کام کرنے کے لیے میرا دل اجازت نہیں دیتا۔ اور جس کام میں دل ڈگمگائے، میں اسے چھوڑ دینا بہتر خیال کرتا ہوں۔'' دھیمے لہجے میں بات مکمل کر کے اب وہ اگلے حکم کا منتظر تھا۔

''سبوخ! میں سب جانتا ہوں۔ لیکن وہ ہمارے پرانے کلائنٹس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی

کمپنی کے مالک بھی ہیں جن کے لیے کام کرنا ہر کوئی اپنے لیے فخر اور اعزاز کی بات سمجھتا ہے اسی لیے ہم مجبور ہیں۔ بہر حال تم پھر بھی سوچ لو۔'' بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ریسیور اٹھایا جس کا صاف مطلب تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے۔

''زیمی ڈیئر! کہیں جا رہی ہو؟'' مسز جیکب، حسین چغتائی کے ساتھ محوِ گفتگو تھیں، اُسے سیڑھیوں سے اُترتے دیکھا تو فوراً پکار لیا۔

''ادھر آؤ! تم نے شاید دیکھا نہیں۔ ان سے ملو، یہ ہیں ملک کے نامور سرمایہ کار حسین چغتائی جو عنقریب سیاست میں بھی اپنے جھنڈے گاڑنے والے ہیں۔'' ہمیشہ کی طرح اپنے نئے دوست سے زیمی کو ملوانا انہوں نے ضروری خیال کیا تھا اور یقیناً اب ان کی خواہش تھی کہ وہ ان سے فرینک نیس بڑھائے اور پہلی ہی ملاقات میں ان پر اتنا گہرا اثر چھوڑے کہ وہ بار بار ملنے کی حسرت کریں۔ جبکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

''ہیلو! نائٹ ٹو میٹ یو۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا تو زیمی کو بھی رسپانس دینا پڑا۔ گرے بالوں اور چندھی چندھی آنکھوں میں ہوس لیے ادھیڑ عمر کا یہ شخص بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا تھا، جہاں زن کے لیے زر کو بے دریغ استعمال کر کے محض اپنے نفس کو خوش رکھا جاتا ہے۔ ایک دم ہی اسے جی بھر کر بے زاری محسوس ہوئی۔ آہستہ آہستہ وہ تمام باتیں جو پہلے اس کے نزدیک قطعاً قابلِ اعتراض نہ تھیں، اب کوفت کا درجہ اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ ان کی سوسائٹی میں مردوں کو اپنے گرد پروانہ وار گھمانے والی لڑکیوں کو ''خوش قسمت'' قرار دیا جاتا تھا۔ دوسری ہم عمر لڑکیاں ان سے حسد کرتیں تو والدین کے لیے وہ رشک کرنے کا باعث بنتیں۔ لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ جب سے اس نے درس اٹینڈ کرنا شروع کیا تھا، آہستہ آہستہ اس کے خیالات میں تبدیلی آنے لگی اور اپنی سوسائٹی کی ان اوچھی حرکتوں سے وہ دل ہی دل میں جی بھر کے نفرت کرنے لگی۔ اپنے ہی لائف اسٹائل سے اس کا دل اُوبنے لگا تھا۔

''می ٹو۔ لیکن سوری میں جلدی میں ہوں، ٹائم نہیں دے پاؤں گی۔'' کھڑے کھڑے دکھاوے کا اخلاق نبھاتے ہوئے وہ بولی۔

''اوہ شیور! ٹیک یور ٹائم۔ اب احساس ہوا ہے کہ آپ سے ملنا ہو تو ٹائم لے کر آنا چاہیے۔'' سگار کا چھوٹا سا کش لگاتے ہوئے وہ شخص نظروں ہی نظروں میں اس کے سراپا کو داد دے رہا تھا۔ اس کی نظریں زیمی کو اپنے وجود میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جبھی ناگواری کے تاثرات اُس کے چہرے پر اُبھر آئے۔

''ارے رے..... چغتائی صاحب! آپ کے لیے ٹائم ہی ٹائم ہے۔ غیروں والی باتیں تو نہ کریں۔''

سلک کی خوبصورت ساڑھی کا ڈھلکتا پلّو ایک ادا سے دوبارہ کندھے پر رکھتے ہوئے مسز جیکب بولیں تو وہ اِترا کر ہنس دیئے۔

''انہی باتوں سے تو آپ ہمارے دل میں گھر کرتی جا رہی ہیں۔''

جواباً دونوں کا مشترکہ قہقہہ فضا میں گونجا تو وہ ایکسکیوز کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس لمحے اسے اپنی ماں کی آواز نہایت کریہہ محسوس ہو رہی تھی اور پھر یہ کوئی فردِ واحد تو نہ تھا۔ سوسائٹی میں وہ بے حد ''ملنسار'' مشہور تھیں جبھی اس جیسے کئی مرد آئے روز ان سے ''ملنے'' کو موجود ہوتے۔ ماں کا تصور اور اس کا کردار ذہن میں آتے ہی اب وہ خود سے شرمندہ ہونے لگی۔ اور پھر وہ اکیلی تو نہ تھیں۔ ہر طرح کے کیل کانٹوں سے لیس سوسائٹی کی تمام خواتین اس ''دوڑ'' میں شریک تھیں۔

آپا کے لیکچرز اٹینڈ کرنے کے بعد اسے یوں لگتا جیسے اس کی سابقہ زندگی کے حوالے سے دل و دماغ میں موجود تمام اُلجھنیں عائد کی جنگ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں اور وہ اپنے دماغ کو سوچنے کے لیے کھلا راستہ فراہم کرتی کہ یہی راستہ سبوخ کی طرف بھی جاتا تھا۔

'اور شاید سیدھا راستہ بھی یہی ہے۔' وہ سوچتی۔

''مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت کی اور سیدھے راستے کے لیے چُن لیا ہے۔'' ایک شفقت بھری آواز کی بازگشت اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ انہی سوچوں میں اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اس کا رُوٹ بدلا اور وہ درس کی طرف جانے لگی۔ گاڑی میں موجود گھڑی کی طرف دیکھا تو ٹائم ہو چکا تھا۔ گاڑی کی دراز سے حجاب نکالا اور بیک مرر کی مدد سے اچھی طرح سر ڈھانپنے کے بعد گاڑی سے نکل کر اندر داخل ہو گئی۔ جلدی میں وہ موٹر سائیکل سے اُترتے سبوخ کو نہیں دیکھ پائی تھی جو پہلے تو اسے حجاب میں دیکھ کر ٹھٹکا لیکن دوسرے ہی لمحے طمانیت کا ایک بھرپور احساس اُسے پُرسکون کر گیا۔ سو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس معصوم سی لڑکی کے لیے ڈھیروں دعائیں کرتا ہوا بھرپور طریقے سے مسکرا دیا۔

❀---❀---❀

اُن کی کلاس فیلو لالہ رخ کے لندن میں مقیم منگیتر کی اچانک آمد سے اسے اپنا MBA چھوڑ کر اس وقت پیا دیس جانے کی تیاریاں کرنی پڑیں جب ان کے امتحانات میں کچھ عرصہ ہی رہ گیا تھا۔ جیسے ہی تمام کلاس فیلوز کو پتہ چلا، پہلے تو سب نے مل کر اسے خوب چھیڑا اور پھر طے یہ پایا کہ ساری کلاس کی طرف سے مل کر اسے الوداعی پارٹی دی جائے۔ آج اسی سلسلے میں سب کامن روم میں موجود تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر بلش ہوتی لالہ رخ کا یہ روپ ان سب کے لیے نیا تھا کہ وہ تو کافی بولڈ اور بے باک سی لڑکی مشہور تھی۔

لڑکیوں کے لیے پھولوں کے گجروں اور چھوٹی سی ڈھولکی نے تو کامن روم میں مہندی کا سا سماں پیدا

کر دیا تھا۔ نہ صرف ریفریشمنٹ کا انتظام تھا بلکہ زیمل اور ایمان نے سب کی طرف سے ایک خوبصورت سا گفٹ بھی خرید رکھا تھا جو کہ ہپی میرج کے خوبصورت پیغام سے مزین گفٹ پیپر میں پیک کر کے ٹیبل کے اوپر رکھ دیا گیا تھا۔ لالہ رخ کے نہ نہ کرنے کے باوجود اسے گوٹا کناری سے مزیّن دوپٹہ اوڑھایا گیا البتہ مہندی لگانے سے پرہیز کیا گیا تھا کہ پھر اس کی مہندی کی اور یجنل تقریب تک شاید رنگ نہ اُتر پاتا۔ لالہ رُخ کے جانے کا سوچ کر ایک دو لڑکیاں جذباتی ہوتے ہوئے رو بھی پڑیں۔

''لارو! اگر اس طرح چھوڑ کر جانا تھا تو دوستی کیوں کی تھی؟ اب میں تمہارے بغیر اکیلی کیسے رہوں گی؟'' یہ زمین تھی جس کی واحد دوست لالہ رخ تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر کہیں نظر نہ آتیں جبھی تو عماد نے انہیں ایک دوسرے کی ''بیوٹی گارڈ'' کا خطاب دے رکھا تھا۔

''اسے افسوس تمہارے شادی کر کے جانے کا نہیں بلکہ اپنی شادی نہ ہونے پر یہاں رہ جانے کا ہے۔'' زیمل نے دُور کا نکتہ پیش کیا تو جاذب فرضی آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''فکر نہ کرو نرمین! یہ تمہارے پردیسی بابو کو بھیج دے گی۔ بس اللہ اسے زمانے کی گرم ہواؤں سے بچائے۔''

''یوں نہ کہو یار!..... برطانیہ کی سرد، ٹھٹرتی ہوئی برفانی ہواؤں میں یہ بے چاری ترسے گی مگر تمہاری دعاؤں کے سبب اسے گرم ماحول میسر نہ آئے گا۔ آ..... ہاہ۔'' مرتضیٰ نے بڑے اسٹائل سے بات مکمل کر کے آخر میں ٹھنڈی آہ بھری تو سب کے لیے ہنسی روکنی مشکل ہو گئی۔ لیکن ہنوز سنجیدہ سبوخ کو دیکھ کر زیمل ایک دم ٹھٹک سی گئی۔ واقعی سبوخ کب سے چپ چاپ اور کھویا کھویا سا ہے لیکن کسی نے نوٹ ہی نہیں کیا۔ اس نے سوچا۔

''ہاں یار بالکل اسی طرح جیسے مائیں تو اپنے بچوں کو پھلنے پھولنے کی دعائیں دیتی ہیں اور ہم جیسے بے چارے بچے ''پھولنے'' سے بچنے کے لیے ایکسرسائز کر کے نہ صرف اپنی جان جوکھوں میں ڈالے رکھتے ہیں بلکہ ان کی دعا سے بھی ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ضرار نے اس کی تائید کی تھی اور تبھی ڈھولکی سنبھالتا عماد چونک گیا۔

''اوئے سبوخ! تُو کیوں چپ بیٹھا ہے یار۔''

''نہیں نہیں، بس ایسے ہی۔'' شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا جبھی گڑبڑا گیا۔

''نہیں بھئی۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔'' مرتضیٰ ذومعنی انداز میں مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔ یقیناً وہ لوگ یوں ٹلنے والے نہیں تھے۔ زیمل کے چہرے ہی سے بے چینی اور پریشانی جھلکنے لگی تھی لیکن وہ خاموش رہی۔

''بتا نا یار! کیا پریشانی ہے؟'' لالہ رخ کو بھول کر اب سب ہی کو اس کی فکر ستانے لگی تھی۔

''وہ دراصل یار! میں ایک کلائنٹ کے سلسلے میں اُلجھا ہوا ہوں۔ سوچ رہا تھا کہ تم سب سے کس طرح اجازت لوں؟'' کوئی بھی بہانہ گھڑنے کے بجائے اس نے سچ بول دیا اور چونکہ سب ہی اس کی پیشہ ورانہ مصروفیت سے بخوبی آگاہ تھے اور دل سے اس کی محنت کی قدر بھی کرتے تھے لہٰذا انہوں نے بخوشی اجازت دے ڈالی۔ البتہ زیمل اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ دراصل وہ ضیا صاحب کی طرف سے دیئے گئے ایڈورٹائز ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اس قسم کا کام کرنا اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ضیا صاحب جیسے انچارج کم کم ورکرز ہی کو ملا کرتے ہیں کہ جنہوں نے سبوخ سے اس کی تمام تر صورتِ حال سننے کے بعد نہ صرف یہ کہ اسے اس کی اس وقت کی قابلیت سے بڑھ کر نوکری دی تھی بلکہ وقت اور کام کے معاملے میں بھی ہمیشہ اس سے تعاون کیا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ سبوخ بھی ہر کام کو اپنا ذاتی کام تصور کرتا تھا اور انتہائی محنت اور دیانت داری سے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتا اور پھر جب کلائنٹس مختلف جگہوں پر ان کا نام لے کر فرم کی تعریف کرتے تو خود اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا لیکن اب مسئلہ خود ان کی ساکھ کا تھا کہ ان کے کیے گئے ایگریمنٹ کے مطابق ان کی اگلی دو پروڈکٹس کو بھی انہوں ہی نے مارکیٹ میں انٹروڈیوس کروانا تھا لہٰذا وہ ان کی ڈیمانڈ پوری کرنے کے بھی پابند تھے جو کہ ایک لحاظ سے شاید ان کی مجبوری بھی تھی۔ سو اس نے استعفیٰ دینے کا ارادہ کر لیا۔

''چائے پینے جا رہا ہوں، چلو گے؟'' ابھی وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اس کے روم میٹ سعود نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ٹینشن ہے یار! جب سے آئے ہو، اسی طرح لیٹے ہو۔ جوتے اُتارے، نہ کھانا کھایا۔'' وہ اس کے بیڈ پر بیٹھ کر فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

''بس تھک گیا ہوں۔'' لمبی سی سانس خارج کرتے ہوئے سبوخ نے شانے اُچکائے۔

''جبھی تو کہہ رہا ہوں، نیچے چل کر کڑک سی چائے پیتے ہیں۔ گپ شپ میں ایک دم فریش ہو جاؤ گے۔'' نماز میں ابھی کچھ دیر باقی تھی لہٰذا وہ بلا توقف سعود کے ساتھ چل پڑا۔

❀---❀---❀

آج وہ مسز جیکب کے بار بار بلانے پر بھی کمرے سے نہیں نکلی تھی اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ شازل سے ملنا پسند نہیں کرتی لہٰذا بار بار اسے تنگ نہ کیا جائے۔ اس کے بدلتے روّیے کو تو وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی لیکن دوٹوک لہجے میں اس کا انکار سن کر تو حیران رہ گئیں۔ آج شاید وہ چوتھی مرتبہ اس سے ملنے آیا اور وہ ہنوز انکاری تھی۔

''زیمی! بند کرو یہ ڈرامے۔ عنقریب میں تمہاری شازل سے شادی کر رہی ہوں اور بس!'' نرمی کا اثر نہ ہوتے دیکھ کر اب ان کے لہجے نے ایک اور کروٹ لی تھی۔

''نہیں کرنی مجھے اس سے شادی۔ صرف اور صرف اپنے بزنس کے لیے آپ اپنی بیٹی کو استعمال کر رہی ہیں۔ مما! گھِن آتی ہے مجھے آپ کے وجود سے۔ ہوس ٹپکاتی نظروں اور ڈائیلاگ بازی سے۔'' اُن کا لہجہ بدلا تھا تو وہ بھی خود پر کنٹرول نہ رکھ پائی اور دل کھول کر ماں کے سامنے رکھ دیا۔ معصومیت تو اس کے چہرے پر تھی ہی، لیکن آج پنک کلر کی سادہ سی شلوار قمیص میں تو وہ کلی لگ رہی تھی۔ ماں کا ''انکشاف'' سن کر اس کی گلابی رنگت ایک دم سرخی مائل ہوئی تھی۔

''اوہ یُو.....'' ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ شازل کی شان میں کوئی بھی گستاخی کیسے برداشت کر پاتیں؟ اور پھر انہیں اپنے بزنس پلان ادھورے رہ جانے کا خیال بھی تو آیا تھا۔

''بند کرو اپنی بکواس اور یہ ماسیوں والا ڈریس چینج کر کے اسی وقت ڈرائنگ روم میں آؤ۔'' قہر برساتی نظروں سے اسے شلوار قمیض پہنے دیکھا اور آرڈر دے کر غصہ دروازے پر اُتارتی چلی گئیں جہاں شازل، زیمی کے انتظار میں ایک ایک پل کو دس دفعہ گِن رہا تھا۔

❀---❀---❀

''عزیز بہن! آپ کی اُلجھن کی سلجھن نہایت سادہ فہم ہے۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں نا کہ قرآن پاک کے ایک حرف پر دس نیکیاں دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے تو پھر یہ لفظ ''خنزیر'' جب قرآن پاک جیسی کتاب میں درج ہے تو اسے ادا کرنے پر تو ہمارے نامۂ اعمال میں 50 نیکیوں کا اضافہ ہوا نا۔ اور پھر قرآن شریف میں تحریر کردہ ہر لفظ پاک ہے اور یہ لفظ ادا کرنے سے بھی نہ تو زبان پلید ہوتی ہے اور نہ ہی چالیس دن تک نماز فاسد۔''

درسِ قرآن کے بعد اب سوال جواب کا سیشن چل رہا تھا جس میں خواتین اپنے اذہان میں پیدا ہونے والے سوال پوچھ کر اپنی اُلجھنیں دُور کیا کرتی تھیں۔ زیمل بھی ان سب کی گفتگو نہایت توجہ اور شوق سے سن رہی تھی کہ یہ تمام معلومات یقیناً اس کے لیے نئی تھیں۔

''تو پھر ہمارے بڑے بوڑھے اس بات کو کیوں سینہ بہ سینہ منتقل کرتے رہے؟'' مطمئن ہو جانے کے باوجود وہ خاتون مکمل تشفی چاہتی تھیں۔

''یہ بات تو آپ سب کے علم میں ہے کہ کس طرح سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمام ارواحِ خبائث کو اس جانور کے اندر منتقل کیا گیا اور اس کی ہیئت یکدم تبدیل ہو گئی۔ اور ظاہر ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے

اسے حرام قرار دے دیا گیا تو ہمارے بزرگوں نے شاید اس کی برائی ظاہر کرنے کی غرض سے اپنی نسلوں کو اس سے دُور رکھنے کی غرض سے محاورتاً کہا جو ہوتے ہوتے دلوں میں پختگی اختیار کر گیا۔''

وہ خاتون تو نہایت مطمئن نظر آنے لگیں لیکن وہ خود بے چین ہو گئی تھی کہ اس کے گھر میں نہایت ذوق وشوق سے کھایا جانے والا خوان کتنا ''کریہہ'' تھا۔

پاکستان میں رہ کر چونکہ ان کے لیے یہ سب ممکن نہ تھا لیکن باہر جا کر وہ لوگ بے دریغ کھاتے اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مسز جیکب کے کچھ ''خیر خواہ'' تو بیرونِ ملک سے واپسی پر ''سوغات'' کے طور پر ان کے لیے یہ گوشت لاتے۔

'مجھے عنقریب کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔' اس نے سوچا اور پُر خیال نظروں سے آپا کی طرف دیکھنے لگی جو بڑی محبت سے اپنا پیغام سب کے دلوں تک پہنچا رہی تھیں۔

❀---❀---❀

فائنل ایگزیمز شروع ہو چکے تھے۔ کتابوں میں سر کھپا کھپا کر سبھی ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ پھر موسم بھی ساتھ دینے پر آمادہ نظر نہ آتا تو مزید خواری ہوتی۔ لیکن آج موسم اچھا تھا اور دھوپ نہ تھی۔ لہٰذا وہ دونوں پھولوں کی کیاریوں سے سجے ڈیپارٹمنٹ کے خوب صورت سے لان میں بیٹھ گئے۔

''آج تو بڑے خوش لگ رہے ہو؟'' ہینڈ بیگ لان کی سرسبز گھاس پر رکھتے ہوئے زیمی نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''ہاں، خوش تو میں ہوں۔'' زیمی سے وہ کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔ ''میں نے تمہیں استعفیٰ دینے کے متعلق بتایا تھا نا۔'' اس نے جیسے یاد دلانا چاہا۔

''ہاں ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

''تو اللہ کا کرنا دیکھو کہ مقبول صاحب اپنی چھٹی ختم ہونے سے پندرہ دن پہلے ہی واپس آ گئے ہیں۔ اس لیے ''متنازعہ'' ایڈورٹائز مکمل طور پر وہی بنائیں گے۔''

''رئیلی.....؟'' وہ بھی اس اچانک حل ہو جانے والی مشکل پر حیران ہوئی تھی۔

''دیکھو میں نے صرف ایک برائی سے بچنے کا دل میں ارادہ ہی تو کیا تھا۔ ساری مشکلات تو خود اللہ تعالیٰ نے دُور کر دیں۔ جبھی تو وہ فرماتا ہے کہ اگر بندہ میری طرف محض ایک قدم بڑھائے گا تو میں اس کی جانب دس قدم بڑھاؤں گا۔'' ساری بات وہ اپنے مکمل تاثرات سمیت بتا رہا تھا اور زیمل سوچ رہی تھی کہ وہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے وہ گنگنا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا کرتا تھا لیکن اب وہ مسلسل اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ جو روزانہ یونیورسٹی آنے سے قبل تقریباً پندرہ منٹ رگڑ رگڑ کر، دل لگا کے شیو

کیا کرتا تھا، اب چہرے پر موجود گھنی مونچھوں کے علاوہ ہلکی ہلکی داڑھی نے اس کی شخصیت کو کیسا سحر انگیز بنا دیا تھا۔ ہر دفعہ نیا ہیئر اسٹائل آزمانے والا اب سلیقے سے کٹے بالوں میں بھی خوب جچ رہا تھا۔ وہ جو اپنی شوخی و شرارت اور باتونی پن کی وجہ سے پورے ڈیپارٹمنٹ کی جان تھا، اب اپنی سنجیدگی اور کم سخنی سے سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔

''زیمی! یہ تو ہم انسانوں کی غلط فہمی ہے کہ دنیا کے ناخداؤں سے ڈر کر ان کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ میرا تو ایمان ہے کہ اگر صرف اسی وحدہٗ لاشریک کے آگے جھکنے کو اپنا معمول بنا لیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے آگے جھکنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔'' اس کے خیالات سے بے خبر وہ اپنی ہی رو میں بولے چلا جا رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ مخاطب کے دل پر یہ الفاظ کتنی شدت سے دستک دے رہے ہیں۔

❀---❀---❀

پیپرز ختم ہو جانے کے بعد مسز جیکب نے اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کسی طور شازل کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتی تھیں کہ آج کے فائدے کے لیے انہوں نے بڑی محنت کی تھی۔ لیکن اب زیمل کے خیالات نے تو جیسے ان کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں۔ ابھی وہ شازل کے ایک بار پھر مایوس لوٹ جانے کے بعد انہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ براؤن کلر کی خوب صورت سی لائننگ پرنٹ کی شلوار قمیض میں ملبوس زیمل سیڑھیاں اُترنے کے بعد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

''کہاں تو تم جینز شرٹ کے علاوہ کچھ پسند نہیں کرتی تھیں اور اب تو بڑی شلوار قمیض پہننے لگی ہو؟'' کافی پیتے ہوئے کپ انہوں نے ٹیبل پر رکھا اور طنزیہ لہجے میں بولیں۔ اس کے اطوار میں تبدیلی کی وجہ جاننے کی انہوں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

''مما! خیالات بدلتے دیر تو نہیں لگتی۔ اور بعض اوقات تو خیالات کیا، ایک لمحہ میں ساری دنیا ہی بدل جاتی ہے۔' دھیمے لہجے میں اس نے نہایت متانت سے جواب دیا تھا۔

''ہونہہ! ایسی دنیا کا کیا اعتبار جو لمحے لمحے بدلتی ہو۔''

''تو مما! بھروسہ دنیا پر نہیں، دنیا بنانے والے پر کریں۔ اُس پر کریں جو دنیا بدل ڈالنے کا اختیار رکھتا ہے۔''

''اچھا اچھا زیادہ فلسفہ بگھارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگلے ہفتے کوئٹہ سے فادر آ رہے ہیں۔ چرچ کی طرف سے ان کی پارٹی ہے۔ کوائرل پریکٹس کے لیے چلی جانا۔'' شاید وہ جلدی میں تھیں لہٰذا گردن کو دائیں طرف جھٹکا دے کر اُٹھیں اور گفتگو لپیٹتے ہوئے قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے۔

''آئی ایم سوری! میں جا نہیں پاؤں گی۔'' تیز قدموں سے چلتے ہوئے انہیں کراس کرتی ہوئی وہ باہر

نکل گئی کہ اس وقت وہ مزید بحث کے موڈ میں ہرگز نہ تھی۔

جب سے آپا کو یہ پتہ چلا تھا کہ وہ کرسچن ہے لیکن اسلام اور تمام عقائد کے متعلق مکمل معلومات چاہتی ہے اور دین کو سمجھنے میں بھی شدید دلچسپی رکھتی ہے تو انہوں نے اس پر خصوصی توجہ دینی شروع کی۔ درس کے علاوہ ان کی خصوصی اجازت سے جب جی چاہتا، ان کے گھر چلی جاتی۔ ذہن میں موجود اُلجھنوں کو ڈسکس کرتی اکور ہر بات کے جواب میں وہ اتنی خوبصورت اور ٹھوس دلیل پیش کرتیں کہ وہ حیران رہ جاتی۔ گھر آتے ہوئے مختلف کتابیں وہ ساتھ لے آیا کرتی تھی۔ یونیورسٹی سے تو ظاہر ہے ایگزیمز کے بعد مکمل فراغت تھی لہٰذا دیر تک ان کا مطالعہ کرتی۔ نہ سمجھ آنے والی بات کو پنسل سے انڈر لائن کرتی اور اگلے روز آپا سے مکمل رہنمائی حاصل کرتی۔

کبھی کبھار وہ سوچتی تھی کہ اتنی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ کیسے ان تمام حقائق کو نظرانداز کرتی رہی اور آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس نے مکمل طور پر عقیدۂ تثلیث سے عقیدۂ توحید پر ایمان لے آنے کا اٹل فیصلہ کرلیا۔

اس روز وہ آپا کے گھر سے واپس آرہی تھی کہ اتفاقاً راستے میں موٹر بائیک چلاتے سبوخ کو دیکھا تو ایک دم ہی اسے اپنے وجود میں جذبوں کی لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔

''سبوخ!'' گاڑی عین اُس کے نزدیک لاکر اس نے پکارا۔

''ارے زیمی! کیسی ہو؟'' موٹر بائیک کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے اب وہ دونوں تقریباً ساتھ ہی تھے۔ آنکھوں میں اُترتی خوشیوں کی چمک اور مسکراتے چہرے والا سبوخ اسے اپنے دل سے کبھی دُور محسوس نہیں ہوا تھا۔

''سگنل کے ساتھ والے ریسٹورنٹ میں چلو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اس کے چونکنے کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ بولی اور اس کی طرف سے اثبات کا اشارہ پا کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں آمنے سامنے موجود تھے۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد آج وہ پہلی مرتبہ مل رہے تھے۔ گو کہ دونوں ہی ایک دُوجے کی محبت میں بری طرح گرفتار تھے لیکن زیمی نے اپنے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ جس رستے پر سبوخ نے اسے ڈالا تھا، وہ یا تو مکمل طور پر منزل کو پالے گی ورنہ اگر پلٹی تو یوں کہ پھر سبوخ سے دوبارہ کبھی نہیں ملے گی کہ بیچ کے رستے کی وہ ہرگز قائل نہ تھی۔

''سبوخ! میں اسلام قبول کر رہی ہوں۔'' ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے بلا تمہید کہہ ڈالا۔

''کیا..... کیا واقعی.....؟ تم جانتی ہو، تم کیا کہہ رہی ہو؟'' اُس کا حیران ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنی مستقل مزاجی سے نہ صرف درس لیتی رہی ہے بلکہ بڑی گہری نظر اور شوق سے اسلامی کتب کا بھی مطالعہ کرتی رہی ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ ایگزیمز کے بعد سے زیمی نے اسے رابطہ رکھنے کو منع کیا تھا اور چند ماہ انتظار کرنے کو کہا تھا۔ کیوں؟ یہ شاید وہ اب جان پایا تھا۔

''ہاں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ ''سبوخ! ذہنی طور پر تو میں پہلے سے مسلمان ہو چکی ہوں لیکن کل علامہ صاحب کے ساتھ مفتی صاحب کے پاس جا کر نہ صرف کلمۂ شہادت پڑھوں گی بلکہ آپا سے مشورہ کرنے کے بعد باضابطہ اعلان بھی کر دوں گی۔''

''زیمی! کہیں تم میری وجہ سے تو.....'' ویٹر آرڈر سرو کر کے گیا تو سبوخ دل میں مچلتے سوال کو زبان دے بیٹھا۔

''ہاں، میں مانتی ہوں کہ اس فیصلے کا محرک براہِ راست تمہاری ذات ہے۔ لیکن اگر صرف تمہاری وجہ سے میں نے اسلام قبول کرنا ہوتا تو اس کے لیے مجھے اتنے مطالعے اور تحقیق کی شاید ضرورت نہیں تھی لیکن..... لیکن میں اسلام کے متعلق مکمل سوجھ بوجھ اور آگاہی حاصل کرنے کے بعد اس کے دائرے میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔''

''زیمی! تم دیکھنا، خدا ہر مشکل وقت میں تمہیں اپنی رحمت بھری آغوش میں یوں لے گا کہ پھر کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔'' سبوخ نے اس کے عزم کو حوصلہ دیا۔ اس کی تو خوشی قابل دید تھی۔

''اِن شاء اللہ! مجھے بھی یہی امید ہے۔'' زیمی نے مسکرا کر چائے کا کپ اُٹھاتے ہوئے کہا اور سبوخ خدا کی اس عنایت پر تہ دل سے اس کا شکر ادا کرنے لگا جس نے اس کے دل کی مراد پوری کی تھی۔ زیمل کو درس میں جانے کی آفر کرنے کے بعد سے اس نے ڈھیروں دعائیں کی تھیں اور ہمیشہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں شرفِ قبولیت سے نوازا تھا۔

❀---❀---❀

اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا کہ جب اللہ کی رحمت سے حقیقی معنوں میں اس کی دنیا بدلنے والی تھی۔ علامہ صاحب (آپا کے شوہر) اور سبوخ کے ساتھ پہلے سے طے شدہ وقت پر وہ شہر کے نامور مفتی اور عالمِ دین کے پاس جا پہنچی جو علامہ صاحب کی زبانی اس کے تمام حالات سے پہلے ہی واقف ہو چکے تھے۔ لہٰذا چند ضروری سولات کے بعد اسلام قبول کروانے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد چند ضروری دستاویزات پر دستخط کروائے اور دیر تک اسے مذہب اسلام کے متعلق مزید معلومات دیتے رہے۔ اس کی اپنی خواہش پر اس کا نام ''عائشہ'' رکھا گیا تھا۔

''عائشہ! اس بات سے تم بھی اچھی طرح واقف ہو کہ تمہارے اس اسٹیپ سے خود تمہارے لیے کس قدر مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ تمہاری ماں کا اس سوسائٹی میں بے حد اثر و رسوخ بھی ہے۔''

آپا نے ان دونوں کے لیے گھر پر کھانے کا انتظام کر رکھا تھا سو کھانے کے دوران اس سے مخاطب تھیں جس کے چہرے پر بلا کا سکون اُتر آیا تھا۔

''آپا! آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔ لیکن میں ایک بار اُن کا ردِعمل ضرور جاننا چاہوں گی۔'' وہ فرمائش پر تیار کروائی گئی چکن بریانی پر رائتہ ڈالتے ہوئے بولی۔ کسی قسم کی ٹینشن یا پریشانی کا اس چہرے پر شائبہ تک نہ تھا۔

''ضرور ضرور..... تم اپنے ہر ردِعمل میں آزاد ہو۔ لیکن ہاں، جب کبھی میری ضرورت محسوس ہو یا خود کو غیر محفوظ تصور کرو تو دن رات کی تخصیص کیے بغیر بلا جھجک چلی آنا۔ اِن شاء اللہ خدا تمہیں محفوظ رکھنے کے اسباب خود پیدا فرمائے گا۔'' سبوخ، علامہ صاحب کے ساتھ ڈائننگ روم میں کھانا کھا رہا تھا جبکہ وہ دونوں کچن ہی میں موجود ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھا رہی تھیں۔ اور یوں جب وہ سبوخ، آپا اور علامہ صاحب کی ڈھیروں دعاؤں کا حصار لیے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تو اسے اپنا آپ بے حد پاکیزہ اور معتبر لگنے لگا تھا۔ جس کے لیے اس کے دل اور زبان پر خدا کا شکر جاری تھا۔

❀---❀---❀

''زیبی! آج فادر کے اعزاز میں پارٹی ہے۔ کتنے بجے تک چرچ پہنچ جاؤ گی؟''

مسز جیکب ابھی ابھی پارلر سے لوٹی تھیں اور سیدھی اس کے کمرے ہی میں چلی آئیں جہاں وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ چہرے کی تازگی اور چمک بتا رہی تھی کہ بیوٹیشن نے آخری حد تک اپنا ہر حربہ استعمال کر دکھایا تھا۔

''مما! میں پہلے بھی آپ سے ایکسکیوز کر چکی ہوں۔'' کتاب میں بک مارک رکھتے ہوئے وہ بولی۔

''آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟..... کن لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگی ہو؟..... مس فٹ ہوتی جا رہی ہو تم سوسائٹی میں، مس فٹ۔'' آہستگی سے بات شروع کرتے ہوئے آخر تک وہ چیخنے لگی تھیں جبکہ زیمل خاموش بیٹھی جانتی تھی کہ ابھی اسے مزید بہت کچھ سننا ہے۔

''ڈریسنگ اور اسٹائل دیکھو اپنا۔ کیا غریب غرباء والی حرکتیں ہیں تمہاری۔ جانتی ہو..... جانتی ہو تم، مسز روپرٹ تمہیں اپنی کام والی جیسا کہتی ہیں اور میڈم آفندی وہ تو..... ہونہہ کس قدر مذاق اُڑاتے ہیں لوگ تمہارا حلیہ دیکھ کر۔'' تیزی سے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے وہ اس کی اسٹڈی ٹیبل کے قریب

آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''میں کل ہی کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے تمہارے لیے اپائنمنٹ لیتی ہوں۔'' اب وہ اس کے بیڈ پر بیٹھی ٹانگ ہلاتے ہوئے دلاسا دینے کے انداز میں بات کر رہی تھیں۔

''اوہ مما! آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ۔'' اسٹڈی ٹیبل سے اٹھ کر وہ بیڈ پر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور بڑے لاڈ سے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''بولو ڈیئر! میں سن رہی ہوں۔'' اس کا سر اپنی گود میں رکھے دُلار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے وہ بولیں۔

''مما! میں مسلمان ہو رہی ہوں۔'' دانستہ طور پر اس نے ''ہو چکی'' کے بجائے ''ہو رہی ہوں'' کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ سر اُٹھا کر وہ ان کے تاثرات جانچتی، ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے نرم گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔

''تمہیں ہمت بھی کیسے ہوئی یہ سوچنے کی؟'' دائیں ہاتھ کا مُکا بنا کر دوسری ہتھیلی پر مارتے ہوئے ایک جھٹکے سے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''یاد رکھو زیمی! اگر تم نے دوبارہ ایسا سوچا بھی..... تو آئی وِل کل یو۔'' سفاک نظروں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تو وہ جان گئی کہ کچھ بعید نہیں..... کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا، جب گیبریئل کارپینٹر کی بیٹی نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی تھی تو انہوں نے اپنے ''بندوں'' کے ذریعے اس لڑکے پر اتنا تشدد کروایا تھا کہ کمیونٹی کی دوسری تمام لڑکیوں کے لیے یہ واقعہ عبرت کا نشان بن گیا تھا اور روزلین..... اس کا تو کچھ اتا پتا نہ تھا اور اسی لمحے جب اسے اپنا گھر ''غیر محفوظ'' محسوس ہوا تو اس نے ایک سادہ کاغذ پر اپنے اسلام قبول کرنے کے بارے میں لکھ کر مسز جیکب کے بیڈروم میں رکھا اور آپا کی آفر قبول کرنے میں بالکل دیر نہ لگائی۔

❀---❀---❀

آپا تو ظاہر ہے پردہ کرتی تھیں۔ لہٰذا علامہ صاحب کے توسط سے انہیں معلوم ہوا کہ سبوخ، عائشہ سے شادی کا خواہش مند ہے اور عائشہ کے جذبات سے تو وہ اچھی طرح واقف ہی تھیں کہ اس تمام عرصے میں وہ اس کی بہت اچھی اور لازوال دوست بن چکی تھیں۔ مسز جیکب نے چونکہ کبھی عائشہ کے فرینڈز اور ایکٹیوٹیز میں میں دلچسپی نہیں لی تھی، لہٰذا وہ سبوخ کو بالکل نہیں جانتی تھیں اور ویسے بھی یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد وہ زیادہ ملے بھی نہیں تھے اس لیے سبوخ اپنے روزانہ کے معاملات پہلے کی طرح سرانجام دے رہا تھا۔ البتہ عائشہ ابھی تک گھر سے نہیں نکلی تھی کہ نہ جانے کیسے اس کے مسلمان ہونے کی خبر پورے شہر میں

پھیل گئی تھی۔ البتہ اخبارات میں مسز جیکب نے پُرزور طریقے سے تردید ضرور کی تھی لیکن یہ الگ بات تھی کہ اس کا ایک دم سے نظر نہ آنا سوسائٹی میں اس خبر کی تصدیق کرتا نظر آتا تھا۔ مسز جیکب خود ذہنی دباؤ کا شکار تھیں اور کسی نہ کسی طریقے سے اُسے حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ صورت خواہ کوئی بھی ہو، اس سے اُنہیں قطعاً کوئی سروکار نہ تھا۔ جبھی آپا نے یہ حل نکالا کہ ان دونوں کو شادی کے بعد یہ شہر چھوڑ دینا چاہئے اور کسی دوسری جگہ رہائش اختیار کرنے کا سوچنا چاہئے۔

اس تجویز کو سراہتے ہوئے مستقل سکونت کے لیے دونوں نے کراچی جیسے وسیع شہر کا انتخاب کیا تھا کہ سبوخ کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کا ہیڈ آفس بھی وہیں تھا اور ضیا صاحب کے کہنے پر باآسانی اس کا ٹرانسفر وہاں ہو بھی جاتا۔ لہٰذا طے یہ پایا کہ پہلے سبوخ وہاں جا کر رہائش کا کوئی معقول انتظام کرے اور پھر شادی کے بعد دونوں کو علامہ صاحب خود کراچی چھوڑ کر آئیں گے۔ تب تک عائشہ کا آپا ہی کے گھر میں رہنا قرار پایا تھا۔

❀---❀---❀

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ ابھی جانماز لپیٹ ہی رہی تھی کہ نہ جانے کب سبوخ مسجد سے واپس آ کر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

''نئی زندگی کی پہلی صبح مبارک ہو۔'' قریب ہوتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تو وہ چونک ہی تو گئی۔

''شکریہ!'' مسکراتے ہوئے جواب دے کر اس نے جانماز الماری پر رکھی۔ وہ ابھی تک اسی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

''تم بہت خوش قسمت ہو عائشہ! کہ خدا نے تمہارے دل کو ایمان جیسی روشنی سے منور کیا۔'' وہ بیڈ پر بیٹھی تو سبوخ نے دھیرے سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''واقعی سبوخ! خدا نے تو مجھے میری حیثیت و اوقات سے بھی بڑھ کر نواز دیا ہے اور اتنا دیا ہے کہ اکثر مجھے اپنا دامن تنگ محسوس ہوتا ہے۔ اور خود اللہ تعالیٰ ہی تو فرماتا ہے نا کہ تم میری کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ تو نعوذ باللہ جھٹلانا تو دُور کی بات سبوخ!..... میری تو سوچ کی وسعت اتنی نہیں کہ میں اس کی دی گئی نعمتوں کو شمار ہی کر سکوں۔'' آنکھوں میں اُترتی نمی کے ساتھ اس کے دل کی سچائی لفظوں میں ڈھل رہی تھی۔

''اللہ ہمیں ہر دم اپنا شکر ادا کرنے کی توفیق دے، آمین!'' ایک ہاتھ سے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے وہ بولا تو جواباً مسکراتے ہوئے اس نے بھی اِن شاء اللہ! کہہ کر سر ہلا دیا۔

❀---❀---❀

یہ چھوٹا سا فلیٹ ہی اب ان کی کُل دنیا تھی۔ ضیا صاحب کی مہربانی کی بدولت اس کا ٹرانسفر بغیر کسی تردّد کے کراچی ہیڈ آفس میں کر دیا گیا تھا اور جب علامہ صاحب کے ساتھ وہ کراچی آئی تو چونکہ وہ مکمل

طور پر نقاب میں تھی لہٰذا اُنہیں شہر چھوڑنے سے کراچی پہنچنے تک کسی قسم کی دُشواری نہیں ہوئی۔ مسز جیکب نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کروانے کے علاوہ اپنے ذرائع سے بھی پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن چونکہ انہیں خدا کا ساتھ حاصل تھا لہٰذا کوئی ان کا بال تک بیکا نہ کر سکا اور وہ بحفاظت کراچی پہنچ گئے۔

زندگی اپنے معمول کی طرف رواں دواں تھی۔ ماسٹرز کر لینے کے بعد سبوخ مکمل طور پر اپنی جاب کی طرف توجہ دے رہا تھا۔ کمپنی کی طرف سے اسے ایک گاڑی بھی دی گئی تھی۔ آفس سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں درسِ قرآن سننے ضرور جاتے۔ دیگر چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے وہ آپا سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے میں تھی، بصورتِ دیگر گھر داری چونکہ عائشہ کے لیے ایک بالکل ہی نیا تجربہ تھی لہٰذا وہ اسے بھی انجوائے کرتی۔ کتابوں کے ذریعے آہستہ آہستہ کھانوں میں ذائقہ اور مہارت شامل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ اپنے چھوٹے سے گھر کو شیشے کی طرح چمکانے کا بھی اُسے کریز تھا۔ فارغ ہوتی تو اسلامی کتب اس کے زیرِ مطالعہ رہتیں۔ غرضیکہ زندگی میں اتنا سکون در آیا تھا کہ بعض اوقات وہ خود حیران ہوتی۔

سبوخ کو خوش رکھنا اُس کی اوّلین ترجیح تھی۔ جانتی تھی کہ اس عمل کا بھی ہزار درجہ ثواب ہے۔ اُس کی ہر بات کو وہ اپنے لیے حکم تصور کیا کرتی تھی۔ اُس کا ہر کام اتنی محبت اور دل سے کرتی کہ وہ خود کو خوش قسمت ترین انسان گردانتا۔ آج سبوخ نے آفس سے فون پر ٹھیک پانچ بجے تیار رہنے کو کہا تھا کہ آج ان کا باہر کھانا کھانے اور لانگ ڈرائیو کا پروگرام تھا، اسی لیے میرون اور وائٹ کلر کی شلوار قمیض کے ساتھ خوبصورت رنگوں سے سجا ٹائی اینڈ ڈائی کا دوپٹہ لیے وہ بھتے ہوئے بالوں کی چٹیا بنانے میں مصروف تھی۔ ایک تو اس نے کچھ عرصہ پہلے اُنہیں نہایت شارٹ کروا دیا تھا اور پھر بالوں کے بڑھنے کی رفتار بھی نہایت کم تھی اس لیے بے شمار پنیں لگانے کے باوجود اِدھر اُدھر سے نکل کر اس کی گردن سے لپٹنے لگتے۔

''آوچ!'' ابھی وہ بالوں کے ناز اُٹھانے میں مصروف تھی کہ اچانک پیچھے سے آ کر سبوخ کے گدگدی کرنے سے وہ گڑبڑا گئی۔ چونکہ ڈپلیکیٹ چابی ہر وقت اس کے پاس موجود رہتی تھی اس لیے اکثر وہ اُسے چونکا دیا کرتا۔

''تو مسز! بنا سنورا جا رہا ہے۔'' ڈریسنگ ٹیبل سے ٹیک لگا کر شیشے کی طرف رُخ کیے عین اُس کے سامنے کھڑا دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ بڑی ہی پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں جی! جناب کو خوش بھی تو رکھنا ہے نا۔'' اسی کی ٹون میں بولتی ہوئی وہ دوبارہ بالوں میں مصروف ہو چکی تھی۔

''زہے نصیب، زہے نصیب! خدا ہر ایک کو تم جیسی بیوی عطا کرے۔''

''تمہاری چاہت میں تو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوں۔'' اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے وہ

بولی تو سبوخ نے فوراً اسے اپنے بازوؤں کی مضبوط پناہ گاہ میں قید کر لیا۔

''ارے عاشو! تم کیا، میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ کبھی کہہ کر تو دیکھنا۔'' چہرے کو چھوتے ریشمی بالوں کو پرے کرتے ہوئے وہ مسکرایا۔ لہجے کی صداقت چیخ چیخ کر آپ اپنی گواہی دے رہی تھی۔

''کچھ بھی کر سکتے ہیں.....؟'' کچھ زیادہ ہی موڈ میں آتا دیکھ کر وہ اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکلی کہ اب اس کی آنکھیں بھی کچھ بول رہی تھیں لیکن وہ شرارت پر آمادہ تھی جبھی ٹھٹک کر پوچھا۔

''شک ہے کیا؟'' لہجہ ہنوز محبت سے چُور تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دل میں مچلتے جذبات کی عملی تصویر پیش کرتا، ایک بار پھر اس نے تصدیق چاہی۔

''واقعی؟''

''100 فیصد واقعی۔''

''اچھا تو پھر میری چٹیا بنا دیں۔ گھنٹے بھر سے لگی ہوں لیکن بن کے نہیں دے رہی۔'' چہرے پر آئی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ اس معصومیت سے بولی کہ پہلے تو وہ حیران ہوا لیکن پھر اس کی شرارت سمجھ کر ایک جاندار قہقہہ کمرے کی فضا میں گونجنے لگا۔

''تو بھئی یہ جو تمہارے بال ہیں، انہیں بے شک کھلا رہنے دو یا پونی بنا لو۔ اسکارف کے بعد تو تمہارا ایک بال بھی نظر نہیں آتا۔''

''لیکن میں تو آپ کی خوشی کے لیے کر رہی تھی کہ آپ کو چٹیا پسند ہے۔'' بالوں کو برش کر کے اب وہ بنانا کلپ لگا رہی تھی۔

''تم کیا جانو، تم نے میری زندگی میں کتنی خوشیاں بھر دی ہیں۔ ایک ایک پل تمہیں اپنی زندگی میں شامل کر لینے کی دعائیں مانگنے کے ساتھ خدا سے تمہارے اسلام قبول کرنے کی دعائیں مانگتا تھا۔ میرے خیال میں تو یہ سب ناممکن تھا لیکن دیکھو اللہ تعالیٰ نے کس طرح تمہیں میری زندگی میں لا کر مجھے دائمی اور سچی خوشیوں سے اس طرح روشناس کروایا ہے کہ میں سابقہ تمام محرومیاں بھلا بیٹھا۔'' ایک جذب کے عالم میں وہ بولتا جا رہا تھا۔

''بے شک، وہ ہمارا سب سے بڑا محسن ہے۔'' اچھی طرح اسکارف لینے کے بعد بائیں طرف پن لگا کر وہ اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

''کاش وہ ہمیں اپنے پسندیدہ لوگوں میں شامل کرے۔'' سبوخ کی اس دعا پر دونوں کے لب آمین کے لیے ہلے تھے۔

آج کل وہ دونوں ہی بے حد خوش تھے۔ اور خوش کیوں نہ ہوتے۔ دونوں بہت جلد والدین کے معتبر عہدے پر فائز ہونے والے تھے۔ خاص طور پر سبوخ تو اس آنے والے مہمان کے لیے بے حد ایکسائٹڈ تھا۔ گھنٹوں بیٹھ کر اس کا نام ڈسکس کیا جاتا۔ قرآن پاک میں اتنے خوب صورت اور بامعنی نام موجود تھے کہ ان کے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ جبھی اس نے ایک آسان سا حل نکالا اور تمام ناموں کو اس نے پرچیوں پر لکھ دیا اور طے یہ پایا کہ جس دن ننھا منا اس دنیا میں آئے گا، کلمہ پڑھ کر تمام پرچیوں میں سے قرعہ نکالا جائے گا جو کہ اس کا نام قرار پائے گا۔

چونکہ ڈلیوری میں ایک ڈیڑھ ماہ ہی باقی رہ گیا تھا سو عائشہ کی طبیعت کے پیش نظر وہ اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتا۔ اس کے ناں ناں کرنے کے باوجود سالن خود بنا کر روٹیاں باہر سے لے آتا۔ البتہ اسے اتنی اجازت ضرور تھی کہ اس کے کھانا بناتے وقت وہ کچن میں موجود چیئر پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ سکتی ہے۔ شروع سے ہاسٹل لائف گزارنے کی وجہ سے نہ صرف وہ کھانا خود بنا سکتا تھا بلکہ ہر چیز کو سلیقے قرینے سے خود سنبھال کر رکھنے کی بھی اسے عادت تھی۔ گو کہ پہلے یہ تمام ذمے داری عائشہ نے اپنے سر لے رکھی تھی لیکن اب تو سبوخ نے اس کے جھاڑو پونچھا کرنے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی اور طے یہ پایا تھا کہ جھاڑو پونچھا صرف اتوار کو ہوا کرے گا۔

اس دن وہ ابھی سو رہی تھی کہ کھٹر پٹر کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ فجر کی نماز اور تلاوت کے بعد اس نے الارم لگایا تو تھا لیکن شاید سبوخ نے اُٹھتے ہوئے آف کر دیا تھا۔ ذرا جو کروٹ بدل کر دیکھا تو کھلے دروازے سے سبوخ پر نظر پڑی جو عائشہ ہی کی طرح ہاتھوں پر دستانے پہنے بڑی پھرتی سے پونچھا لگا رہا تھا۔

پہلے تو اسے سبوخ پر ڈھیروں پیار آیا اور اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے کتنا محبت اور خیال رکھنے والا جیون ساتھی عطا کیا ہے لیکن پھر ایک دم ہی اسے بے پناہ شرمندگی نے آن گھیرا جبھی فوراً بستر چھوڑا اور اس کے پاس پہنچ گئی۔

''سبوخ! یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' اسے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی۔

''کیا کر رہا ہوں بھئی، اپنے گھر میں اپنے کام کر رہا ہوں۔'' بالٹی میں پونچھا نچوڑتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں بولا۔

''لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ سب عورتوں کے ہاں بچے ہوتے ہیں لیکن وہ آخر دن تک کام کرتی ہیں۔ میں بھی ان ہی سب کی طرح ہوں۔ کرنے دیا کریں مجھے کام۔'' عائشہ اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی لیکن اس نے آہستگی سے ہاتھ ہٹا دیا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی قسم کا کام کرنے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ خود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ

آلہ وسلم نے کتنے ہی کام اپنے ہاتھ سے کیے ہیں۔ اور ویسے بھی میں جانتا ہوں کہ یوں تو ہمیشہ لیکن خصوصاً اس حالت میں بیوی کو خوش رکھنے اور آرام پہنچانے کا بے حد ثواب ہے تو بھئی لکھوا لینے دو کچھ نیکیاں مجھ گناہ گار کو اپنے نامۂ اعمال میں۔'' چونکہ تمام کام ختم ہو چکا تھا لہٰذا باتھ روم میں دستانے اتار کر ہاتھ دھونے کے بعد اب وہ اسے لیے کچن میں آ گیا تھا۔

''اور سب عورتیں نہ تو عائشہ ہیں اور نہ سب مرد مابدولت سبوخ رضا کہ ایک دُوجے کا یوں خیال رکھیں۔ جبھی تو کہتا ہوں..... ہم سا ہو تو سامنے آئے۔''

سلائس ٹوسٹر میں ڈال کر چائے چڑھاتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا تو اُس کا روم روم سبوخ کے پیار میں جھوم اُٹھا۔

''ایسے ہی سگھڑ شوہروں کی لڑکیاں تمنا کیا کرتی ہیں۔'' بغیر کسی بوکھلاہٹ یا افراتفری کے سلیقے سے اسے کام کرتا دیکھ کر اسے نہ سراہنا واقعی زیادتی ہوتی لہٰذا کرسی پر پاؤں سمیٹ کر بولی۔

''اپنا حال دیکھو ذرا۔ تمہارے پاؤں سوج رہے ہیں۔ بی پی کی پرابلم تمہیں ہے، پھر بھی زبردستی ہر کام میں گھسنے کی کوشش کرتی ہو۔'' اس کی تعریف کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے وہ بولا تو اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''نماز تو تم بیٹھ کر پڑھتی ہی ہو۔ بس ہر وقت ''**یا حی یا قیوم برحمتک استغیث**'' کا وِرد رکھا کرو اور قرآن پاک پڑھ کر دعا مانگا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی پیدا فرمائے، سمجھیں!'' ہلکے سے اس کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے اس نے کہا اور ہمیشہ کی طرح دل ہی دل میں خود بھی اس کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔

❀---❀---❀

آج اُس کی گائنا کالوجسٹ کے ساتھ اپائنٹمنٹ تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں آئس کریم کھا کر گھر لوٹے تو سبوخ نے نیوز سننے کے لیے ٹی وی آن کر دیا جہاں دنیا بھر میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی ڈاکومنٹری تیار کی گئی تھی۔ عراق، فلسطین، بوسنیا، کشمیر اور مختلف جگہوں پر مسلمان جبر و زیادتی کا نشانہ نظر آ رہے تھے۔ جہاں بے کس و مجبور مائیں بہنیں زیادتی کا شکار ہو رہی تھیں، وہیں بوڑھے اور جوان گولیوں سے چھلنی کیے جا رہے تھے۔ وہ ملک جہاں ایک کتے کو زخمی کر دینے کی بھی سزا مقرر ہے، جو اپنے بجٹ تک میں جانوروں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے لیے رقم مختص کرتے ہیں، وہ انسانیت کی اس قدر تذلیل پر خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ ڈاکومنٹری کا دوسرا حصہ خودکش حملوں پر مشتمل تھا۔ دوسری جگہوں کے علاوہ پاکستان میں مختلف جگہوں پر کیے گئے خودکش حملوں کی تصویر کشی بہت بہترین اور مؤثر انداز میں کی گئی تھی۔ سبوخ انتہائی کرب کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ عائشہ چینج کر کے آئی تو اس سے رہا نہ گیا۔

''عاشو! کیا یہ خودکش حملے کسی بھی طرح جائز یا ہمارے مفاد میں ہیں؟..... کیوں ہم اپنے ہی کنبے کو ختم کر دینے پر تُلے ہیں؟..... کیا دوسری اقوام کی طرف سے کوئی کسر رہ گئی ہے کہ ہم بھی اپنوں کے خون میں ہاتھ رنگ لیں؟'' حملوں کے بعد کے مناظر واقعی دل دہلا رہے تھے۔

''نہیں نہیں سبوخ! یہ لوگ کسی صورت مسلمان نہیں ہو سکتے۔ اللہ کو ماننے اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو ماننے والا کوئی بھی شخص اس طرح کا کام نہیں کر سکتا۔ نہیں..... میں نہیں مانتی۔'' مسلسل نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ کسی طور پر ماننے کو تیار نہ تھی کہ اس گھناؤنی حرکت کا ذمے دار کوئی مسلمان ہو سکتا ہے۔ سبوخ یہ سب دیکھ کر بے حد دلگرفتہ ہو گیا تھا لہٰذا اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود خاموش ہو گیا۔

❀---❀---❀

ڈلیوری کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ ممتا کا نور مکمل طور پر اس کے چہرے کا احاطہ کیے رکھتا اور مسکراہٹ نے تو جیسے اس کے لبوں پر ڈیرا سا جما لیا تھا۔ اتنی خوب صورت زندگی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے نصیب میں لکھ دی تھی، اس کا تو کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کبھی بھول کر بھی اسے اپنے گھر یا ماں کی یاد نہیں آئی تھی۔ اور ویسے بھی سنا تھا کہ کافی تلاش بسیار اور خواری کے بعد بھی جب وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئیں تو انہوں نے روڈ ایکسیڈنٹ میں اُسے مُردہ قرار دے کر لوگوں سے تعزیتیں تک وصول کر لی تھیں۔ حاصل کی گئی لاش کا چہرہ چونکہ ناقابلِ شناخت تھا لہٰذا اپنے مذہب کے مطابق آخری رسومات ادا کر کے اسے دفنا بھی دیا گیا تھا کہ اس کے مسلمان ہو جانے کی تو وہ ہمیشہ سے تردید کرتی آئی تھیں۔ ویسے بھی عائشہ کو ان سے یہی توقع تھی اس لیے اسے بالکل افسوس نہیں ہوا۔

❀---❀---❀

ربیع الاول کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ خوش گلو تو وہ تھی ہی پھر جس جذب اور نم آنکھوں سے وہ نعت پڑھتی تو سننے والوں کی آنکھیں بھی عقیدت اور فرطِ جذبات سے نم ہو جایا کرتیں۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر کے مطابق ڈلیوری کے دن نزدیک تھے سو اپنی حالت کے پیشِ نظر وہ محافلِ میلاد میں جا نہیں پا رہی تھی جس کا اسے بے پناہ قلق تھا۔ جبھی سبوخ کے کہنے پر اس نے بھی 12 ربیع الاوّل کے دن محفلِ میلاد اپنے ہی گھر میں منعقد کروانے کا سوچا۔ اس دن کے لیے اس نے بے حد انتظار کیا تھا اور جس دن میلاد ہونا تھا، ان دونوں ہی کی خوشی قابلِ دید تھی۔ منع کرنے کے باوجود اس نے سبوخ کے ساتھ مل کر گھر کا کونا کونا چمکایا تھا کہ ایسی بابرکت محفل میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے متعلق وہ بخوبی آگاہ تھے۔ سو بے حد جوش و خروش کے ساتھ ہر کام کرتے ہوئے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اندراج کرواتے رہے۔ عائشہ کے

لیے تو خیر یہ تھا ہی پہلا موقع لیکن سبوخ بھی نہایت جوش وخروش سے ہر کام میں حصہ لے رہا تھا۔

میلاد کا وقت چونکہ عصر کی نماز کے بعد رکھا گیا تھا سو ظہر تک ڈرائنگ روم اور اس سے ملحقہ ٹی وی لاؤنج سے فرنیچر ہٹا کر فرش پر چاندنی بچھا دی گئی تھی۔ میلاد پڑھنے والیوں کے لیے گلاب کے پھولوں کے ہار اور چنبیلی کے گجرے جبکہ حاضرینِ محفل کے لیے گلاب اور موتیے کے گجروں کا انتظام تھا۔ برقی قمقموں سے خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کا ماڈل جو آپا اور علامہ صاحب نے گفٹ کیا تھا، کمرے کے عین وسط میں رکھا گیا تھا۔ ایک طرف تسبیحیں جبکہ دوسرے کونے میں رکھے سائیڈ ٹیبل پر عطر دان اور پھولوں کی پتیاں رکھی گئی تھیں جو کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور سلام پیش کرتے ہوئے حاضرین پر نچھاور کی جاتیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کھانے کا بھی بہترین انتظام کیا گیا تھا جس کے لیے مسز بشیر کی دونوں کام والیوں، حنیفہ اور نصرت کے علاوہ مسز اکمل کے گھر کام کرنے والی روزینہ کو بھی بلوا لیا گیا تھا اور یہ سارا انتظام اسی کے سر تھا۔ سفید رنگ کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کا معصوم سا چہرہ بے حد پاکیزہ لگ رہا تھا۔ گو کہ آج اس نے خلافِ معمول سبوخ کے ساتھ کام بھی کروایا تھا لیکن تروتازہ چہرے پر تھکن کی کوئی لہر چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ حالانکہ کیس میں متوقع پیچیدگیوں کے باعث ڈاکٹر نے اسے مکمل بیڈ ریسٹ بتایا تھا لیکن آج اس نے سبوخ کی بھی نہیں سنی۔

''میرا خیال ہے کہ سارا کام مکمل ہو گیا ہے۔'' کلف دار سفید کُرتہ شلوار پہنے اس کا چہرہ اتنا پُرکشش اور شخصیت اتنی سحر انگیز لگ رہی تھی کہ ایک ٹک دیکھتی عائشہ نے فوراً نظریں جھکا لیں مبادا اس کی نظر ہی نہ لگ جائے۔

''ہاں بالکل 100 فیصد۔'' ایک تنقیدی نظر سارے کمرے پر ڈالنے کے بعد اس نے سارے انتظامات کو پاس کر دیا۔

''اللہ ہمارے گناہ معاف فرما کر ہمارا یہ جذبہ بھی قبول فرما لے۔'' وہ بولا اور پھر ایک دم ہی گھڑی کی طرف دیکھ کر چونک گیا۔ ''اوہ..... تین تو بج گئے ہیں۔ چار بجے تک مجھے ایک جلسے میں شریک ہونا ہے۔ میرا خیال ہے اب میں چلوں۔ اور ہاں اپنا خیال رکھنا۔'' جاتے جاتے وہ مڑا اور اس کے رخسار پر بھرپور پیار کی مہر ثبت کر کے واش روم کی طرف بڑھ گیا کہ وہ ہمیشہ گھر سے باوضو نکلتا تھا۔

❀---❀---❀

میلاد شریف کی محفل اختتام پذیر ہو چکی تھی اور سب ہی نے اس کی نعت گوئی کے انداز کو بے حد سراہا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھلا دیا گیا اور آہستہ آہستہ تقریباً تمام خواتین رخصت ہو چکی تھیں۔ تینوں کام والیاں بڑی مستعدی اور تیز رفتاری سے سارا کام سمیٹ رہی تھیں جبکہ وہ مسز بشیر اور مسز اکمل کے ساتھ بیٹھی تھی اور ان کا اصرار تھا کہ ان کے گھر پر سوں ہونے والے میلاد میں وہ نعت خوانی کرے اور چونکہ

ان کا اپارٹمنٹ آمنے سامنے تھا لہٰذا اس نے بڑی خوش دلی سے ان کے گھر آنے کی ہامی بھر لی باوجود اس کے کہ آج اس کے پاؤں کی سوجن میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''نو بج گئے ہیں۔ ذرا ہیڈ لائن نیوز سن لوں۔'' فلور کُشن پر بیٹھتے ہوئے مسز اکمل نے ریموٹ سے ٹی وی آن کیا کہ وہ اور ان کے شوہر ملکی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے جبھی ان کے گھر کم و بیش تین چار نیوز پیپرز آیا کرتے تھے۔

لیکن یہ کیا؟.....ٹی وی اسکرین پر تو جیسے نظریں جم سی گئی تھیں۔ ربیع الاوّل کے جلوس میں خودکش حملہ کیا گیا تھا اور نیوز چینلز سے اس سانحے کی براہِ راست کوریج کی جا رہی تھی۔ چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہجوم تھا، افراتفری کے عالم میں زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر ہاسپٹل پہنچایا جا رہا تھا۔ مختلف جگہوں پر ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ مشتعل عوام پولیس یا کسی بھی فورس کو نشتر پارک میں داخل ہونے نہیں دے رہی تھی۔ وہ جگہ جہاں کچھ دیر پہلے عاشقانِ رسولؐ اپنی جبینیں خدا کے حضور جھکائے ہوئے تھے، اب وہی جگہ خون سے سرخ ہوئی کسی قربان گاہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ امامت کی خوش نصیب جگہ کا شرف حاصل کرنے والا اسٹیج تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ ہر آنکھ اشک بار اور ہر دل نوحہ کناں تھا۔ ایسی پاک اور بابرکت محفل میں ایسی قبیح حرکت.....! پولیس فورس اور ضلعی انتظامیہ کے وجود کی نفی کرتا ایک اور واقعہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کا مذاق ہی تو اُڑا رہا تھا۔

وہ تینوں اپنی اپنی جگہ بے خودسی ہو کر بیٹھی رہ گئی تھیں۔ کچن سے حنیفہ، نصرت اور روزینہ بھی آ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔ عائشہ چونکہ جانتی تھی کہ شہر بھر کے تمام جلوس آخر میں نشتر پارک میں جمع ہوتا تھے لہٰذا سبوخ کا خیال آتے ہی اس کا دل بیٹھنے لگا۔ کچھ لمحے تو اس نے صبر و ضبط سے کام لیا لیکن پھر رہا نہ گیا۔ خون میں لت پت لاشوں کو دیکھ کر اس کا تمام حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔

''سبوخ..... یا اللہ! میرے سبوخ کی خیر..... سبوخ..... یا اللہ.....!''

صبر و ضبط کے متعلق اجر و ثواب سے گندھے آپا کے خوب صورت لیکچرز اسے اچھی طرح یاد تھے جبھی بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور لمحہ بھر میں پپڑی جمے ہونٹوں سے ادا ہونے والے یہ آخری الفاظ تھے اور اس کے بعد اسے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ رہی۔

اُس کی بگڑتی حالت دیکھ کر مسز اکمل اور مسز بشیر کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک تو سبوخ کی پریشانی، پھر اس کی فکر..... مسز اکمل نے موبائل سے اپنے ہسبنڈ کو سبوخ کے نشتر پارک میں موجود ہونے کے بارے میں بتا کر اس کی خیریت دریافت کرنے کو کہا تو مسز بشیر نے فوراً ٹیلی فون کے ساتھ رکھی ڈائری سے اس کی ڈاکٹر کا نمبر دیکھ کر سای صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد فوری طور پر ہسپتال پہنچنے کا کہا۔

تب تک روزینہ ان کے بڑے بیٹے مہید کو بلا لائی تھی۔ اس طرح وہ دونوں سبوخ اور عائشہ کی خیریت کی دعائیں کرتے ہوئے جلد از جلد ہسپتال پہنچنے کی تگ و دو کرنے لگیں لیکن.....لیکن باہر کی تو صورتِ حال ہی عجیب تھی۔ مشتعل نوجوانوں نے جگہ جگہ سے سڑکیں بلاک کر رکھی تھیں۔ کہیں گاڑیوں پر پتھراؤ کیا جا رہا تھا تو کہیں کسی پارک کی گئی گاڑی کو آگ لگا دی گئی تھی۔ مختلف قسم کی نعرے بازی کرتے ہوئے نوجوانوں نے مزید خوف کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ نہ تو سانحے کی اطلاع ملنے پر عزیز، رشتے داروں کی خبر گیری کے لیے نکلنے والے لوگوں کو راستہ مل پا رہا تھا، نہ ہی ایمبولینسز کو۔ بلکہ کئی جگہوں پر تو ایدھی ایمبولینسز کے شیشے بھی توڑ دیئے گئے تھے۔

عائشہ کی حالت بے حد نازک تھی لیکن ہاسپٹل پہنچنے کے لیے راستہ ملنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ مختلف جگہوں سے گاڑی واپس موڑنے کے بعد آخر کار مہید لمبا سا ٹرن لے کر ہسپتال پہنچنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس وقت تک عائشہ کی حالت کافی بگڑ چکی تھی سو فوری طور پر آپریشن تھیٹر لے جایا گیا لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ بقول ڈاکٹر کہ اگر وہ لوگ عائشہ کو لے کر وقت پر ہسپتال پہنچ جاتے تو کیس اتنا زیادہ سیریس ہرگز نہ ہوتا۔ جبھی انتہائی کوشش کے باوجود وہ بچے کو نہیں بچا پائی تھیں اور کسی اندرونی پیچیدگی کی بنا پر وہ آئندہ ماں بننے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں اس کے منہ سے بے ربط انداز میں اللہ کے حضور سبوخ کی خیریت کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس پر کیا قیامت بیت گئی ہے۔

اکمل صاحب فون سننے کے فوراً بعد وقوعہ پر پہنچ گئے تھے اور وہاں سے ہسپتال جا کر مختلف زخمیوں کو دیکھنے کے بعد دھڑکتے دل سے انہوں نے مُردہ خانے میں قدم رکھا جہاں تمام لاشیں رکھی جا رہی تھیں اور لواحقین اپنے پیاروں کو آس نراس کی کیفیت میں تلاش کرتے وہاں تک پہنچ رہے تھے اور.....اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ نمازِ مغرب ادا کرتے ہوئے سبوخ اپنے مالکِ حقیقی کے پاس جا پہنچا تھا۔ سفید کلف لگا کُرتہ شلوار خون سے سرخ ہو کر ململ کی طرح نرم پڑ چکا تھا لیکن چہرے پر ابھی تک مسکرانے کا گمان ہو رہا تھا کہ وہ بھی اپنی خواہش کے عین مطابق ان خوش نصیبوں میں شامل ہو گیا تھا جو اس کا نام لیتے اس کی بارگاہ تک جا پہنچے تھے۔

حُسن دیکھے نہ کسی کی یہ جوانی دیکھے
کتنی بے رحم الٰہی یہ قضا ہوتی ہے
اچھے لوگوں کو چھینتی ہے موت
کتنی مردم شناس ہوتی ہے!

تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے جونہی اس نے زینہ عبور کیا، رفتار میں ایک دم سستی آ گئی تھی۔ بھری دوپہر کی چلچلاتی دھوپ تو تھی لیکن لُو نہ تھی۔ لہٰذا ہوا گنگناتی ہوئی آتی تو بے اختیار نفوس کھِل سے اُٹھتے۔ لیکن اُسے تو ہوا کے لمس میں بھی کرختگی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ دھوپ کے ساتھ اس کا اپنا وجود قطرہ قطرہ موم کی طرح پگھل جائے گا۔ ڈپریشن کا ایک نہ ختم ہونے والا ریلا تھا جو دماغ میں کسی کوہِ غم کی طرح براجمان تھا اور اس کوہِ غم میں اُس کے اَن بہے اشک لاوے کی طرح جمع ہو رہے تھے لیکن.....

لیکن اب اُس کا غمگسار سبوخ دنیا میں موجود نہ تھا جس کے سینے پر سر رکھ کر وہ اپنے اندر کے تمام بوجھل پن کو آنسوؤں کی صورت بہہ جانے دیتی..... وہ آنکھ تو لمحہ بھر میں اوجھل ہو گئی تھی جو اس کے اندر کے غم کو کھوجتی، پا لیتی اور ہمیشہ کے لیے کُھرچ ڈالتی۔ آخری دیئے گئے بوسے کی حدت وہ ابھی تک اپنے دائیں گال پہ محسوس کرتی تھی۔ کبھی کبھار تو اسے اپنی ذات اِسے اُلجھے ہوئے دھاگے کے مانند لگن لگتی تھی جسے سلجھانا ناممکن تھا۔ اور اگر بالفرض سلجھا بھی لیا جاتا تو صورت یہ بنتی کہ جگہ جگہ سے ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جوڑا گیا دھاگا رفو تک کرنے کے کام نہ آتا۔ انہی سوچوں میں گم وہ کتنی ہی دیر برگد کے درخت کے نیچے جڑ کے پاس اُگی پیلی گھاس سے اپنی ذات کا موازنہ کرتی رہی لیکن..... لیکن اذانِ ظہر کی صدا کان میں پڑتے ہی اِک خیال جیسے بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا تھا۔

جی ہاں! آج وہ کراچی ہی میں ذاکرہ کے طور پر لوگوں کے دلوں پر جمے زنگ کو کُھرچنے میں مصروف ہے کہ اب یہی اس کے لیے مقصدِ حیات بھی ہے اور عین عبادت بھی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی

ماہی ماہی مینوں چھلّا پوا دے
کھچ میری فوٹو تے بٹوے وِچ لا دے
ماہی ماہی مینوں چھلّا پوا دے

گلابو بڑی ادا سے آئی بروپنسل پھرے ابرو اُٹھا کر اپنی کاجل لگی گول مٹول آنکھیں مٹکاتے ہوئے شہر کے سب سے معروف اور مین بازار میں دکان کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ دیر کے لیے گڑوی بجاتی اُنہیں اپنی لوچ دار آواز کے اُتار چڑھاؤ، نظروں کی جادوگری اور آتشی گلابی رنگ کی لپ اسٹک میں چھپے ہونٹوں کی معنی خیز مسکراہٹ سے محظوظ کر رہی تھی۔ جس کے عوض اس کے ہاتھ گاہے بگاہے سکّے اور نوٹ تھامنے کا بھی شرف حاصل کرتے رہے۔ اپنی اداؤں کے باعث وہ جب بھی اس بازار میں پھیرا لگاتی، نہ صرف دکانداروں کی توجہ بلکہ اچھی خاصی دیہاڑی بھی ضرور حاصل کر لیتی۔ سانولے ہاتھ جو گرد و غبار اور میل کچیل کی وجہ سے اپنی اصلی رنگت سے کہیں زیادہ سانولے دکھائی دے رہے تھے، گڑوی پر ایک مخصوص قسم کے ردھم سے جو تھاپ پیدا کرتے تو بعض اوقات خواتین گاہک بھی مول تول چھوڑ کر بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگتیں تو پھر مردوں کی تو کیا ہی بات تھی۔

ویسے یہ بات بھی حقیقت تھی کہ وہ اندھوں میں کانا راجا کے مصداق قبیلے کی سب سے صاف ستھری اور نخریلی لڑکی مانی جاتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ صبح سے شام تک دھول مٹی میں ہو کر وہ خود بھی اسی دھول کا حصہ لگنے لگتی۔ مگر پھر بھی جہاں موقع ملتا، وہ اپنے ہاتھ پاؤں ضرور اچھی طرح دھو کر صاف کرنے کی کوشش کرتی۔ اسی طرح آج بھی وہ گاتی بجاتی کپڑے والی گلی میں پہنچی تو حسبِ معمول دوپٹہ رنگنے والے کی

دکان کے عین نکڑ پر لگی قطرہ قطرہ پانی ٹپکاتی ٹونٹی کے نیچے مل مل کر ہاتھ اور پاؤں دھونے لگی۔

ویسے بھی جب سے قبیلے کے لوگوں نے اُسے ''بپاشا باسو'' جیسا قرار دیا تھا، تب سے وہ درحقیقت خود کو بپاشا ہی سمجھنے لگی تھی اور اُس کا ہر ہر انداز دل پر نقش کر کے وہی اپنانے کی کوشش بھی کرتی۔ ناخن بھی آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اس کے لیے قابلِ توجہ ہرگز نہ تھے مگر اب اس نے بپاشا ہی کی تقلید میں ناخن بھی بڑھا رکھے تھے جن پر ہمیشہ ٹھیلے سے خریدی گئی پانچ روپے کی کچی نیل پالش مختلف رنگوں میں موجود رہتی۔ ابھی وہ ناخن صاف کر کے خود ہی انہیں مختلف انداز سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سراہ رہی تھی کہ عقب سے آواز اُبھری۔

''ارے ارے اسے دیکھو ذرا۔ چیونٹی کے بھی پَر نکل آئے۔'' ساتھ ہی استہزائیہ ہنسی اُبھری۔

''ہونہہ، اور کیا۔ بھلا ان کا صفائی ستھرائی سے کیا واسطہ؟''

اس نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔ دو خواتین شاپرز سے لدی پھندی بڑی نخوت سے تمسخرانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے گزری تھیں اور یہ تو نہایت معمولی بات تھی۔ اسی طرح بعض اوقات کچھ من چلے نوجوان بھی اس پر اور اس کے طبقے کی دوسری لڑکیوں پر اپنے جذبات کی تسکین کے لیے مختلف قسم کے جملے اُچھال دیتے۔ یوں بھی یہ طبقہ ہمیشہ سے تمام عوام کے لیے ڈانٹ پھٹکار کرنے سے لے کر جملے پھینکنے تک سب سے آسان ہدف سمجھا جاتا ہے۔ جبھی وہ بھی اس طرح کی تمام باتیں سننے کی عادی تھی اسی لیے سر جھٹک کر ربر کی قینچی چپل ایک بار پھر پاؤں میں اڑسنے لگی۔ جس کا تلوا اب گھس گھس کر نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

❀---❀---❀

برتن دھونے کے بعد زویا نے فرش پر سرف ڈالا اور برش سے ساری چکنائی رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔ اس کے بعد دُھلے ہوئے برتنوں کی ٹوکری اٹھا کر دھوپ میں رکھی، اس کے اوپر جالی پھیلا دی۔ نل سے ذرا فاصلے پر رکھے گملوں کی گوڈی کی اور باتھ روم سے مگا لا کر انہیں پانی دینے لگی۔ کچن چونکہ چھوٹا سا تھا لہٰذا سنک کی جگہ نہ ہونے کے باعث انہوں نے صحن میں ہی بیرونی دروازے کے دائیں جانب دو گز لمبی اور پانچ انچ اونچی باؤنڈری سی بنا کر اسے برتن دھونے کے لیے مخصوص کر چھوڑا تھا۔ چونکہ بلدیہ کی طرف سے آنے والے پانی کا نل بھی وہیں لگوایا گیا تھا لہٰذا وہاں پر نہ صرف وہ برتن بلکہ کپڑے وغیرہ بھی دھو لیا کرتی۔

گملوں میں موجود مٹی کو اچھی طرح سیراب کرنے کے بعد وہ نل کے اوپر لگے پلاسٹک کے اسٹینڈ سے اسپرے بوتل اٹھا لائی۔ اسی اسٹینڈ پر اس نے برتن اور کپڑے دھونے کا صابن، نیل، برش اور سرف وغیرہ رکھا ہوا تھا تاکہ کام کے دوران بار بار اُٹھ کر اِدھر اُدھر نہ جانا پڑے۔ بارش ہونے کی صورت میں البتہ ان

تمام چیزوں کی منتقلی شیڈ تلے ہو جایا کرتی۔ اسپرے بوتل میں پانی ڈال کر پتوں اور پھولوں پر اسپرے کرتے ہوئے وہ ہمیشہ ہی بے حد طمانیت اور سکون محسوس کرتی تھی۔ یوں تو قدرت نے ابھی تک اس کے آنگن میں کوئی پھول نہیں کھلایا تھا مگر چنبیلی کے تروتازہ ننھے منے زرد اور سفید پھول اسے دیوانہ کر دیا کرتے تھے اور انہی پھول پودوں کی چاہت کا حق وہ ان کا بھرپور خیال رکھ کر بخوبی ادا بھی کرتی تھی۔

یوں بھی وہ گھر میں اکیلی تو تھی سو عائش کے آفس چلے جانے کے بعد وہ پڑوس کے آریان کو ٹیوشن پڑھاتی اور پھر یوں ہی گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں خود کو مصروف کیے رکھتی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا چھوٹا سا گھر اس کی نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کچی گلی ہونے کی وجہ سے گھر کے اندر بنا رکاوٹ کے چلی آنے والی دھول مٹی یا گرد کا بھی کہیں کوئی شائبہ نہ تھا۔

یہی نہیں بلکہ محلے میں اس کے اخلاق کا بھی بے حد چرچا تھا۔ جس فقیر کو سارا محلّہ چھان کر بھی کچھ ہاتھ نہ آتا، وہ بھی اس کے دروازے سے خالی نہ جاتا تھا۔ اتنی امیر کبیر تو وہ نہیں تھی کہ ہر آنے والے کو سو پچاس پکڑا دیتی لیکن اپنی حیثیت کے مطابق اُس نے عائش کی تنخواہ کا حساب لگا کر ایک تناسب سا نکال رکھا تھا اور وہ چند سکّے دروازے کی اندرونی سائیڈ پر موجود سیمنٹ کے قدرتی طور پر رہ جانے والے خلا میں روزانہ رکھ دیا کرتی تھی۔ اور کچھ نہ بھی ہوتا تو کچھ کھانے کو دے دیتی۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھی کہ نفلی استحقاق صرف غرور ہے، نفس کا دھوکا ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ کس کام کا ایسا روپیہ پیسہ جو کسی غریب کے کام آنے کے بجائے ان کی دل آزاری کا باعث بنے۔ وہ باقی سب جانتے تھے کہ حقیقتاً جو روپیہ پیسہ رضائے الٰہی کے لیے یا گیا وہی دراصل ہمارا اپنا اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ ورنہ ہمارے پاس موجود سب کچھ بھی اوروں کا ہے۔ وہ مال جسے ہم بچا بچا کر رکھتے رہے، وہ کسی اور کے کام آئے گا اور درحقیقت ہمارے لیے منافع بخش کاروبار وہی ہے جو ہم اللہ سے اس کے بندوں کے وسیلے سے کریں اور جس کا منافع کئی گنا زیادہ اور کبھی نہ گھٹنے والا ہے۔ اس سب کے باوجود اکثر جب وہ اپنے صحن میں موجود ہوتی تو آس پڑوس کے لوگوں کی آوازیں ضرور کان میں پڑتیں جو باآواز بلند فقیروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر دھتکار دیا کرتے تھے وہ بڑے کرب سے سوچا کرتی کہ ایک تو انہیں خالی ہاتھ لوٹایا جا رہا ہے اور پھر انہیں جھڑکنا دھتکارنا۔

یہ کہاں کا اصول اور کیسی انسانیت ہے؟ کچھ دینے کی توفیق نہیں بھی ہے تو شائستگی سے انہیں منع بھی تو کیا جا سکتا ہے۔ کیا معلوم وقت کب اور کہاں لے آئے۔ برے وقت سے بچنا ہی بھلا۔ اور پھر یہ فقیر بظاہر ہم سے کچھ لیتے ہیں لیکن حقیقتاً ہمیں بہت کچھ دینے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ اجر و ثواب، خدا کی رضامندی، سخاوت کا ابدی میڈل، نبی پاک ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہونے سے ملنے والا قلبی سکون اور نہ جانے کیا کیا۔ یوں بھی یہ فقیر بھلا ہر دروازے پر کہاں آتے ہیں؟ ہر شخص کے آگے کہاں دامن پھیلاتے

ہیں؟ ہاں مگر وہ، جن کی آزمائش مقصود ہو، وہ جنہیں اللہ کی پاک ذات دے کر آزما رہی ہو اور ان میں سے بھی خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں وہ اس آزمائش میں بخوبی کامیابی عطا کرے جنہیں اللہ کی طرف سے دیئے گئے رزق میں سے کسی کو دینے کی توفیق ہو۔

فقیر کیوں مانگتے ہیں؟ .....محنت کیوں نہیں کرتے؟..... ہاتھ پھیلانے کا گناہ کیوں مول لیتے ہیں؟ اس بات سے اسے قطعاً کوئی واسطہ نہ تھا۔ خدا جانے اور ہاتھ پھیلانے والے۔ اسے تو بس اوپر والا ہاتھ بن کر نیچے والا ہاتھ بننے سے بچنا تھا اور اسی لیے وہ ہزار بار شکر ادا کرتے نہ تھکتی کہ اللہ نے اُسے اس قابل بنایا کہ وہ دے سکے۔

❁---❁---❁

''مائی جرینہ، سرت میں لاویں تو جب گلابو پیدا ہوئی تو وے سلا کنجا بوند بھی ناں اُتری تھی اور وس کے پیدا ہونے سے پہلے جب وس کا مائی باپ دنیا سے گیا تو کیسے اودے کالے بادلوں نے بھیتر باپر ایک کی رکھی تھی۔ اینی رات بھر بولتی تھی اور مینہ کا شور کسی بیوہ کے بین ماتم کی طرح رات بھر دھرتی کو ڈرائے سہائے رکھتا تھا یاد ہے نا تھارے کو؟'' قبیلے کے سردار بابے بسیرے نے مائی جرینہ کی یادداشت کی پٹاری کا ڈھکنا ہلکا سا سرکایا۔

مکھ پر آڑی ٹیڑھی جھریاں، سوکھے اور خشک ہاتھ پیر، رات کے ماتھے سا سیاہ رنگ، کالی سفید بھنوئیں، ٹوٹے گرے دانت اور سر پر رکھی ململ کی بڑی سی چدر، جو ماسی جرینہ کی پوری کمر ڈھانپے ہوئے تھی۔

''تیں کیا سمجھے، جرینہ بھول گئی اوخت، پر اب کیا کروں بسیرے! بندے کے اپنے کنے تو کوئی اپنائے ناں، اتنے برس گجار لیے بیٹے بنا، اب تو گم کا پوکھر ایسا بڑا ہے کہ سوچو کوئی دن کو چولہے کا بالن ہی بن کر جل مروں۔'' بابے بسیرے نے پہلے سے دہکتے غموں کی آگ کو شاید مزید ہوا دی تھی اسی لیے اپنی ہتھیلی کا کٹورا بنا کر کان کے نزدیک رکھتے اور مائی جرینہ کی بات سننے کے دوران چلم میں بیٹھی ہوئی راکھ کو دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا، حقہ تازہ کیا، لال انگارے چلم میں بھرے گڑ کا سواد لگایا اور کئی برسوں بعد اب بھی سوگ کی ماری مائی جرینہ کے باجو میں آ بیٹھا۔

''تیں اپنے دکھ کی بات کرے، چاروں کھونٹ دستی میں نجر چلا۔ جمین پر کوئی سکھی نہ دیکھے منے اور جو جمین کے اندر ان کا رب جانے۔ پر کوئی دن کے لیے منے تاں دیکھ، مارا وہی نا جوان گبھرو منے چھوڑ کر چلا گیا ناں۔ کھٹور جالموں نے مارے بیٹے پر بھی بم پھوڑ دیو ہونہہ۔ اوناں کو کسی دوجے کا دکھ نجر نہ آوے وس پیسے کے سامنے۔'' بابے بسیرے نے اپنا نیلی ناڑوں والا ہاتھ آگے بڑھا کر حقہ اپنی طرف کر کے کش لیا۔

ایک قبیلے کا سردار تھا تو دوسری طرف ماسی جرینہ۔ مگر سانجھے دکھ نے دوناں کو ایک سی رنگیلی پیڑھی پر اکٹھا بٹھا دیا تھا۔ سو جب سمے ہوتا ایک دُوجے کے دُکھڑے سن کر دل ہلکا کرتے رہتے۔

''منے اپنے ہاتھاں سے اسے دفن کیا۔ پر تنے کبھی ماری نجروں میں آنسو دیکھے، کوئی نیر بہایا منے؟ ہاں بس کوئی دن چادر تانے الانی منجی پر پڑا رہا سانول کبھی مارے منہ سے پانی چھوا تا پر مارے سے پیا نہ جاتا۔ مارے پیراں اور ہاتھاں کو ملتا اور کیا کرتا۔ اس کی آواج سے مارے کو اٹھنا ہی پڑا اور اب میں کتنا شتابی بھول گیا اوسب۔'' ماسی جرینہ نے بسیرے کو دیکھا اور اس کے جھوٹ کو سراہنے لگی۔

''پر جرینہ! تیں کو غم اب تک چپ کرانا مسکل، ماری مان اب پچھلیاں باتاں کی پھکر نہ کر اور اپنے کھاندان سنگ کھوسی سے رہ۔ جو گجر گئی وس کو پیٹھ موڑ موڑ کر دیکھن سے بھلا ہے کہ بھول جا ماری تریو، اور تھاری تاں پوتی بھی کماؤ ہے تی کو کسی بات کی پھکر۔'' بابے بسیرے نے اپنی نحیف ٹانگوں پر گرم چادر لپیٹے گڑگڑایا اور ساتھ ہی ہلکا سا کھانس دیا۔

''دیکھ بھائی بسیرے! تُو مارے کو جس بات کی پھکر نہ کرنے کا کاہے ہے وس کی ہی تو پھکر ہے اور مان دل میں بات نہ رکھوں، بو جو رگ کہوے ہیں دل ماں رکھی بات کو خمیر کھا جاوے۔''

''ہاں تو دل میں کائے کو رکھتی؟ بول یہاں کوئی غیر ہوئے رہا کیا تھارے سامنے؟ تیں ماری بہن سمان ہے۔ کہہ گجر۔''

''ناں بھائی! رہن دے۔ کوئی دن اور کروں گی تھارے سے بات، اب تو میری کمر جباب دے گئی۔ نہ تو دھوپ ماں چین ملے نہ کھاٹ پر آرام۔ ورنہ مردے سمان پڑی رہوں کسی اور۔'' بابے بسیرے نے اسے دیکھا جو کمر پر پھیلی باریک سی چادر کو اب اپنے اوپر لپیٹ رہی تھی۔

''او بسیرے! کیا پالن ہار کی مرجی کون جانے سوچوں تاں اپنے اور وستی کے سب لوگاں کی جندگی پر ترس آوے، رونا آئے نیر بہاؤ تاں سمندر بنیں، ماں سوچوں کہ لاٹ بابوتاں اپنے کتوں کو بھی سویٹر پہناویں اور ہم جسے لوگاں رات ماں بھی گجھا مچھا پھٹی پرانی دری اوڑھ کر سوئیں وس کو کھبر تاں ہو گی نا بسیرے کہہ سردی تاں اس وستی کے لوگاں کو بھی لگے ہے۔'' مائی جرینہ نے سردی کے موسم میں دھوپ کی شدت حسب ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے بابے بسیرے کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی پوتی گلابو کے متعلق بات کو فی الحال پس منظر میں چھوڑا تھا۔

''سچ پوچھ بسیرے تاں وس ماگ کے سروع ہوتے ہی دل ماں یہی باتاں آویں پر چھائیں بن کر اُٹھوں بیٹھوں مارے دل ماں گھسی رہو، نجر چرا کر سوؤں تو خواب میں گھس آویں۔ منے بھی جندگی ایسی گجاری مارا پوت بھی اسی جندگی کو جیتا مر گیا اور اب ماری پوتی بھی۔''

''مائی جرینہ! ناں بول، ایسی ناں بن اتنی کھٹور۔ سکر کر اوپر والے کا کہ تھارے ہاتھ پاؤں سلامت

ہیں، تنے کوئی بیماری بھی نا ہیں، کوٹ پینٹ والا کی تان بیماریاں ہی بوت۔'' بابے بسیرے نے اپنے مہندی لگے لال لال بالوں کو نحیف کندھوں سے گرم چادر اٹھا کر اس سے ڈھانپا۔

''سرع میں کائے کی سرم جرینہ! وے بات کرنے کو جب بھی تھارا من حاجب دے مارے کو بلا لائیں۔''

''منے سوچن دے بسیرے! وے گلابو بھی آوے تاں وس کے ساتھ مسورہ کر کے تنے بتاؤں۔ اب تاں لگے میں کوں تاب چڑھن کو آوے منے لیٹن دے ہڈی ہڈی دُکھے آج تاں۔'' مائی جرینہ نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھوڑی دیر دبائے اور راسی جگہ مُکا سا بنا کر لیٹ گئی۔ بابے بسیرے نے حقہ گڑگڑایا اور چلم سیدھی کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

❀---❀---❀

عائش کے گھر لوٹنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ آج زویا نے اس کا پسندیدہ مرغ دو پیازہ بنایا تھا۔ سو وقت کا اندازہ کر کے سالن گرم کرنے کے لیے ہنڈیا چولہے پر چڑھائی۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر فریش ہونے کے بعد ہلکی سی لپ اسٹک اور مسکارا لگایا تب تک سالن بہت اچھی طرح گرم ہو چکا تھا۔ دھنیا دھو کر کاٹنے کے بعد ہنڈیا میں ڈالا اور چولہا بند کر کے روٹی ڈالنے کے لیے بیلن اور خشکی نکالنے لگی۔ ان کی شادی کو اس وقت چار سال ہونے کو آئے تھے لیکن عائش ہمیشہ یوں وقت پر گھر آتا کہ بعض اوقات وہ ہنس کر کہہ دیتی۔

''عائش! پتہ ہے اگر گھڑی کا ٹائم آگے پیچھے ہو جائے ناں تو میں نیوز کے بجائے آپ کے آنے سے ہی ٹھیک کر لیتی ہو۔''

اور یقیناً ایسا ہی تھا۔ عموماً ٹریفک کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہوتا کہ بندہ ہمیشہ ہی وقت پر گھر پہنچے لیکن وہ ہمیشہ مین روڈ کے بجائے نسبتاً پُرسکون راستے کا انتخاب کرتا۔ کیونکہ اس کی تاخیر زویا کے لیے ہمیشہ نہایت پریشانی کا باعث بنا کرتی۔

گرم گرم سالن ڈونگے میں ڈالنے کے بعد دسترخوان بچھا کر ہاٹ پاٹ، پانی اور سلاد چٹنی سمیت برتن وغیرہ رکھے۔ کمرے میں جا کر پرفیوم لگایا اور صحن میں موجود پلنگ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ یہ اس کی روزانہ کی روٹین تھی جس سے نہ تو وہ اُکتاتی تھی اور نہ ہی بور ہوتی تھی۔ اور اپنی اسی روٹین میں بے حد خوش اور مطمئن زندگی گزار رہی تھی کہ وہ پانی کی طرح ہر برتن میں ڈھل جانے والی لڑکی تھی جو ہمیشہ مثبت سوچتی اور خوش رہتی۔

''السلام علیکم! بھئی کیسا گزرا سارا دن؟'' عائش نے گھر آ کر موٹر سائیکل اندر لاتے ہوئے حسبِ معمول

پوچھا۔

''بہت اچھا۔ ٹائم گزرنے کا تو پتہ ہی نہیں چلتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے موٹر سائیکل کے ہینڈل سے فروٹ اُتارا۔

''کمال ہے یار! ایک میں ہوں، تمہارے بغیر خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں کہ ایک پل ایک صدی لگنے لگتا ہے۔ آفس ٹائم ختم ہوتے ہی یوں گھر کے لیے بھاگتا ہوں کہ اکثر کولیگز بھی چھیڑتے ہیں۔ اور جناب کو ٹائم گزرنے کا بھی پتہ نہیں چلتا۔'' مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عائش نے منہ پھلایا۔

''جی ہاں بالکل پتہ نہیں چلتا اور وہ یوں کہ میں تنہا ہوتے ہوئے بھی کبھی تنہا نہیں ہوتی۔ آپ کا خیال ہر وقت میرے ساتھ جو رہتا ہے۔'' دھیرے سے مسکرا کر زویا نے جواب دیا تو وہ اس کی حاضر جوابی پر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''اچھا تو یہ بات ہے یعنی.....

میں تمہارے ساتھ ہوتا ہوں زویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا''

عائش نے شعر میں بڑے دھڑلے سے ردّ و بدل کر کے پڑھا تو زویا کی مسکراہٹ بھی قہقہے میں بدل گئی جس پر عائش نے فوراً ماتھے تک ہاتھ لے جا کر شاعروں کے انداز میں داد سمیٹی اور دونوں ایک ساتھ گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے جہاں دسترخوان ان کا منتظر تھا۔

❀---❀---❀

''اوئے کمینے.....!'' دھان پان سی گلابو نے شاید حلق کے آخری حصے سے آواز نکالی تھی جب ہی تو اس کے اردگرد حرکت کرتے نفوس تجسّس سے مجبور ہو کر جامد سے ہونے لگے۔

''ابے او گنڈے! آواج بیچوں ہوں، اپنی عجت ناہیں بیچوں۔'' اُس کی آنکھوں میں تو لگتا خون اُترا ہوا تھا۔ ایک گھٹیا سی گالی کے ساتھ اس نے سامنے کھڑے آدمی کا گریبان جھنجوڑا۔

''بب..... بکواس کرتی ہے یہ..... گھٹیا عورت الزام لگا رہی ہے مجھ پر۔'' گلابو کی اس قدر غیر متوقع ہمت اور اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ گھگیا سا گیا تھا جب ہی تو گریبان چھڑانے میں بھی مکمل طور پر ناکام رہا۔

''اچھا..... تھارا مطبل ہووے ماں الجام لگاؤں ہوں، تنے جلیل کروں..... ارے گھٹیا! تاں تیں کھد رہے، ڈھونڈن نکلیں ناں تھارے جیسا نہ ملے۔'' ایک نہایت ہی واہیات سی گالی گلابو کے لپ اسٹک زدہ ہونٹوں سے نکلی۔

''تیں کیا سمجھے، مارے کو نجر نہ آئے گا؟ جباب دے.....اب کیوں منہ کا باجا ناں کھولے؟''

بس اسٹاپ پر ہجوم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شخص نے یقیناً کوئی نازیبا حرکت کی یا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا پالا کسی عام چھوئی موئی سی لڑکی سے نہیں، گلابو سے پڑا تھا جو برے کو اس کے گھر تک پہنچا کر چھوڑتی ہے اور پھر وہ تھی بھی تو انوکھی۔ اس کی جگہ اگر قبیلے کی کوئی لڑکی ہوتی تو یقیناً یوں مجمع نہ لگاتی بلکہ خود ہی صرف شور مچانے کی دھمکی دے کر معاملے کر لیتی لیکن وہ گلابو تھی جس کی ہر بات نرالی ہوا کرتی تھی اور جو گلاب کے پھول کی طرح سب میں منفرد تھی۔ اور پھر مائی جرینہ کی گود میں پروان چڑھنے والی گلابو کو مائی جرینہ نے ہو بہو اپنے ہی سانچے میں ڈھال کر یہ بات اچھی طرح باور کروا دی تھی کہ ادائیں دکھا کر پیسے نکلوانا الگ بات ہے لیکن اگر کوئی اس سب سے آگے بڑھنا چاہے تو اسے بیچ سڑک کے سبق سکھا دو کہ دوسری ٹائپ کا معاملہ طے کرنے سے بہتر دو وقت کا فاقہ ہے۔ اور اسی بنا پر وہ اپنے قبیلے میں بھی سب کے لیے کشش کا باعث بنتی کیونکہ وہ تھی صرف گڑوی بجا کے پیسے مانگنے والی اور دوسری قسم کی لڑکیوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ مگر وہ آدمی بھی شاید غلط فہمی ہی میں ہی پھنس گیا تھا۔

''ابے لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ ٹھہر تو سہی، تجھے تو میں سبق سکھاتا ہوں۔'' جوں ہی ایک آدمی آستین چڑھاتا ہوا دوسرے شخص کی طرف بڑھا، گلابو نے کاجل لگی آنکھیں مزید پھیلاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اسے وہیں روک دیا۔

''نئیں نئیں..... جیادہ ہمدردی نہ دکھا منے۔ میں آپ ہی اسے سیخ سخالوں۔'' اس کا گریبان ہنوز گلابو کے ہاتھ میں تھا جب کہ اس شخص کی بوکھلاہٹ اس کے چہرے پر اُڑتی ہوائیوں سے بخوبی نمایاں تھی۔ مزید یہ کہ اب وہ قابل رحم شکل بنائے مزاحمت تک نہیں کر رہا تھا کہ جانتا تھا ایسا کرنے کی صورت میں وہ آسمان سے گرا بھی تو کھجور میں لازماً اٹک جائے گا۔ کیونکہ اگر اس گلابو سے گریبان چھڑا بھی لیا تو اردگرد جمع ہوئے لوگ اسے نہیں چھوڑیں گے جو ایسے موقع پر کچھ زیادہ ہی پُرجوش ہو جاتے ہیں۔

''ارے او بابو وردی والے!'' گلابو نے کچھ فاصلے پر کھڑے دو باوردی پولیس اہلکاروں کو پکارا جو ڈرائیور کو بھگتا کر اب فروٹ کے ٹھیلے کے پاس کھڑے کوالٹی چیک کر رہے تھے لیکن اس کے پکارنے پر لپک کر آئے اور اپنے شکار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''سکائی کر دیو جی وس کی، بڑا بے قابو ہووے آج کل۔'' پولیس سارجنٹ کی آمد پر گلابو نے اس کا کالر چھوڑا تو حسبِ عادت قانون نے وہیں پر اپنے ہاتھ لمبے ہونے کا عملی مظاہرہ شروع کر دیا۔

❀---❀---❀

زویا اور عائش ایک دُوجے کی رفاقت میں انتہائی پُرکیف وقت گزار رہے تھے۔ ویسے بھی شادی کے پہلے چند سال ہی میاں بیوی کے ایک دوسرے سے تمام عمر رہنے والے رویّے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اب یہ

ایک الگ اتفاق تھا کہ شادی کے دو تین سال بعد ہی پروفیشنل جیلسی سے مجبور ہو کر عائش کے ایک کولیگ نے اسے باس کی نظروں سے گرانے کے لیے مخالف کمپنی کا خیر خواہ ظاہر کر کے مختلف ثبوت پیش کرنے کے بعد یہ ثابت کر دیا تھا کہ عائش کمپنی کے تمام اندرونی معاملات ان کے سامنے بیان کر کے خاطر خواہ معاوضہ وصول کرتا ہے حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس بات میں اگر صداقت بھی تھی تو بس اتنی کہ اتفاق سے اس کا ایک کالج فیلو اس کمپنی میں جاب کرتا تھا اور اچانک ملنے پر یہ چند ملاقاتیں محض پرانی یادیں کھنگالنے کا باعث بنی تھیں اور بس۔

لیکن اب وہ زمانہ گیا جب لوگ رائی کا پہاڑ بنایا کرتے تھے۔ اب تو رائی بھی خود ہی پیدا کر لی جاتی تھی۔ سو یہاں بھی وہی معاملہ تھا۔ لہٰذا باس نے ردِعمل کے طور پر اس کی بری طرح انسلٹ کر کے جاب سے نکال دیا تو ظاہر ہے کمپنی کی جانب سے دیا گیا مکان بھی خالی کرنا پڑا۔ پہلے اور بات تھی، وہ اکیلا تھا اور ایسی صورت میں کمبائن فلیٹ یا ہاسٹل کہیں بھی رہ سکتا تھا لیکن اب اس کے ساتھ زویا کی ذات بھی منسلک تھی۔ ویسے بھی وہ زویا ہی تھی جس نے بہت اصرار کے بعد اپنا سارا زیور اس کے حوالے کر دیا تھا۔

''کمپنی کی طرف سے تو ابھی بیس روز کی مہلت باقی ہے نا عائش!..... آپ پلیز میری جیولری بیچ کر سب سے پہلے گھر حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ باقی معاملات بھی آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' زویا نے زیر استعمال زیور بھی ڈبوں میں ڈال کر اس کے سامنے لا رکھا تھا۔

''زویا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' عائش کے اندر جیسے چھن سے کچھ ٹوٹا۔ چوڑیوں کی کھنک سے عاری سُونی کلائیاں، کانوں میں جھولتی خوب صورت جھمکیاں اور اوپر پہنے گئے ہارٹ شیپ ٹاپس اُتارنے پر کان جیسے اپنی زیبائش چھِن جانے پر افسردہ تھے اور مخروطی انگلیاں انگوٹھیوں کے بغیر دیہات کے ریلوے اسٹیشنز کی طرح سنسان ویران پڑی تھیں لیکن اس کے چہرے پر موجود طمانیت کے باعث جن رنگوں نے اس کا احاطہ کر رکھا تھا، وہ اس کی اندرونی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔

''زویا! یہ سب تمہارا اور تمہارے لیے ہے اور تمہارا حق ہے ان پر۔ پلیز مجھے یوں شرمندہ تو نہ کرو۔'' وہ بے حد رنجیدہ ہو رہا تھا، سوچ رہا تھا کہ اس نے تو زویا کو تمام تر خوشیاں دینے کا وعدہ کیا تھا، نہ کہ لینے کا۔

''تو عائش! کیا وہ سب جو میرا ہے، صرف میرا ہے اور جو آپ کا ہے، وہ صرف آپ کا ہے؟'' لمحے بھر کو اسے تاسف نے آن گھیرا تھا لیکن چونکہ اس وقت وہ عائش کی اندرونی کیفیت سے آگاہ تھی اور اسے اس گرداب سے نکالنا چاہتی تھی سو نظر انداز کرتے ہوئے سر جھٹک دیا۔

''میرا مطلب ہے.....؟''

''آپ کا جو بھی مطلب ہو عائش! لیکن میرا مطلب ہے کہ اب میں اور آپ میں کچھ نہیں رکھا۔ زندگی تبھی اچھی گزرے گی جب میں اور آپ، ہم ہو جائیں۔ اور پھر آپ مجھ سے زبردستی تو نہیں لے رہے نا۔

میں خود دے رہی ہوں اپنی رضامندی اور خوشی سے۔'' عائش کے کھوجنے کے باوجود اسے زویا کی آنکھوں میں کچھ کھو دینے کے ملال کی جگہ ایک الوہی سی چمک نظر آئی تھی۔

''میں نے ایسا تو کبھی بھی نہیں چاہا تھا زویا!'' عائش نے افسردگی سے کہا تو اس کی دل جوئی کرتی زویا اُٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''ہمیشہ وہی کچھ تو نہیں ہوتا نا جو ہم چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ ہوتا ہے جو ہمارا ربّ چاہتا ہے۔ اور میرا ایمان ہے کہ وہ ہمیشہ اچھا ہی سوچتا ہے ہم سب کے لیے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہمارا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ پاتا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' عائش نے بوجھل دل سے تائید کی اور اپنی نظریں زیورات کے ڈبوں پر جما دیں۔

❀---❀---❀

''دیکھ گلابو! مارا تاں اب سا اسُر پسید ہوا، منہ ماں دانت کہیں ہووے رہا کہی ناں، سانس کا بھی اب تاں منے تیار ناں ہی..... اسے ماں سوچوں کہ اگر منے جمین آوج دے بلالے تا تھاری پھکر کون کرے، تاں کس کے سنگ جیے منے بگیر.....؟'' مائی جرینہ اور گلابو سونے کے لیے لیٹیں تو کروٹ بدل کر مائی جرینہ نے آخر کار وہ بات چھیڑ ہی دی جو وہ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی۔

''مائی! پھکر نہ کر، جمین تھارے لیے بیٹھی ناں رہے، روج کتنے لوگاں وس کی کھوراج بنی۔ وس کو تھاری ٹوٹی پھوٹی بڈھی ہڈیوں سے کا پائدہ ملے جو تنے شتابی بلائے؟'' گلابو نے مائی جرینہ کی بات ہنسی میں اُڑائی اور تکیے کے نیچے سے ہتھیلی جیسا شیشہ نکال کر اس میں کبھی آنکھوں کو دیکھتی کبھی گالوں کو۔ پھر ہونٹوں کے مختلف زاویے بناتی اور کبھی ابرو چڑھاتی۔ مائی جرینہ نے ایک نظر اس کو دیکھ کر آہ بھری اور اپنی جوانی یاد کرنے لگی۔

''اے جوانی بوت بے بفا ہووے گلابو! اتنی کھموسی سے ساتھ چھوڑے کہ بندہ وس کو ڈھونڈتا ہی رہ جاے۔ اب تاں سارا راج پاٹھ کھتم ہوئے ہا نہ بان نہ بسترا، نہ لمبے باجو کی کیمج، نہ مارے باجو میں کھن کھن بجتے جوڑے، نہ کان ماں بالے..... اب تاں بس مائی جرینہ بھی کتے بھگان اور بچے ڈران کے لیے ہووے اور بس..... کنے کچھ نہ رہیو اب تاں.....'' مائی جرینہ پر افسردگی چھا گئی۔

''ماری مان تاں بیاہ کر لے۔ منے بھی سکون سے موت آوے اور تھاری جندگی بھی کھوسی مان گجر جائے۔'' مائی جرینہ کی بات پر گلابو نے پہلے مائی جرینہ کو اور پھر اِتراتے ہوئے آئینے میں خود کو دیکھا۔

''مائی ماری اتی اجاد جندگی تھارے کو بھلی ناں ہی لگے؟ ماں پھر کی مافق جدھر مرجی گھوموں، پر لوکاں کہیں اور اب تاں بھی سوچوں کہ تھارے جیسے بڑوں کو اجادی وِس وخت ہی اچھی لگے جب کھد جواں

ہوویں، دوسرے لوکاں کے لیے ناں ہی۔'' اس کی بات پر مائی جرینہ اُٹھ بیٹھی۔ پھر ہاتھوں سے کڑا کے نکالے اور بولی۔

''سیدھی بات کا منے گلط جباب نہ دے گلابو! انصاپھ کی بات کر، اب لڑکی جات کی کوئی جمے داری ناں ہی لیتا۔ جمانہ بدل گیا ہے ری۔ کیسے بتلاؤں تھارے کو؟'' اس کا جواب سن کر مائی جرینہ جھنجلا سی گئی تھی۔

''ری منے کیا، سارا دن کھاٹ پر ڈھیر ہوئی رہوں یا وس ٹوٹی پھوٹی دری مان تھن ٹھنڈا کیے بیٹھی رہوں، مارے کو کوئی کچھ نہ بولے۔ پر گلابو! منے بس تھارا کھیال رہوے، سارا دن تھارا مرد جات ماں گجرے، مارے دل ماں گلط کھیال آویں، سوچوں کا ہے کو تنے اب تک سادی بیاہ کر کے کسی کے حوالے نہ کیا؟ اری ماں کا جباب دوں تھارے باپ کو، اگر تنے سادی کے بگیر ہی چھوڑ موت کنے چلی گئی ناں؟'' اب کی بار گلابو بھی شیشہ ایک طرف رکھ کر اُٹھ بیٹھی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ مائی جرینہ آج سنجیدہ بھی ہے اور پریشان بھی۔

''مائی! تیں ماری وجہ سے پریسان نہ ہو۔ کر لے مرجی، بیاہ دے منے۔ پر ایک بات ماں جرور کروں۔'' مائی جرینہ اس کی طرف سے ہاں سن کر خوشی سے پھول نہ سمائی تھی اور تبھی یک بیک اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ آنسو خوشی سے آئے تھے یا جدا ہونے اور پھر اس کے نصیب کے اچھا برا ہونے کے دھڑکے نے انہیں جنم دیا تھا، یہ خود مائی جرینہ کو بھی معلوم نہ تھا۔

''بول ماری بچی! ای بات چھوڑ، ہجار بول۔ پالنہار تنے کھوس رکھے۔''

''ماں سادی تاں کروں مائی پر کروں وس کے ساتھ جو منے سادی کے روج سونے کی مندری پہناوے۔''

''سونے کی مندری؟'' مائی جرینہ نے حیرت سے اپنی انگلی دانتوں کے عین بیچ اس مسوڑھے پر جا رکھی جہاں دانت ٹوٹ جانے کے بعد اب جگہ خالی تھی۔

''پریم ماں سیس کٹان کا کچھ اور ہی مجا آوے اور منے بھی تاں پتہ چلے کس کے دل ماں مارا کنا کھیال ہے۔ بس ای ماری پہلی اور آکھری سرط ہے، آگے جو تیں بولے گی سو ماں کروں گی۔''

مائی جرینہ جانتی تھی کہ خانہ بدوش منگتوں کی ایسی بستی میں سونے کی انگوٹھی لانا ایک ناممکن سی بات تھی اور خود مائی جرینہ بھی کسی سے یہ مطالبہ کرتی تو سامنے والے ضرور اس کی دماغی حالت کے اِدھر اُدھر ہونے کا سوچتے کیونکہ اس وقت وہ خود بھی گلابو کی ذہنی حالت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔

❀---❀---❀

نیک، ایمان دار اور اصول پرست انسان کے لیے آج کل کے دور میں کسی بھی جگہ کسی اور کے انڈر رہ کر کام کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن ہرگز نہیں۔ کیونکہ اردگرد کام کرنے والے دوسرے لوگ ایسے شخص کو

اپنے لیے ہمیشہ ایک رکاوٹ اور راہ کا کانٹا ہی خیال کرتے ہیں۔ مگر جو لوگ اللہ کے بتائے گئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا ارادہ کر لیتے ہیں ان کے لیے آسانیاں بھی اللہ کی ذات ہی پیدا کرتی ہے۔

عائش کی کمپنی نے تمام ملازمین کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے ہونے والے منافع کے باعث سارے اسٹاف کو بونس دینے کا فیصلہ کیا تھا اور آج بونس کی رقم کیشیئر کے ہاتھوں نقد وصول کرنے کے بعد عائش نے سوچ لیا تھا کہ وہ تمام کاموں اور ضرورتوں کو پسِ پشت ڈال کر اس دفعہ زویا کو گولڈ کی ایک خوبصورت انگوٹھی بنوا کر دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ بچوں کی طرح اسے بہلانے کی خاطر ہی زویا نے گھر میں چنبیلی اور موتیا کے پودے لگا رکھے تھے جن سے حاصل ہونے والے چنبیلی اور موتیا کے پھولوں کو وہ نہ صرف کانوں میں ڈالتی بلکہ اکثر اوقات گجرے بنا کر کلائیاں بھی سجا لیتی۔ لیکن اب چونکہ قدرت کی طرف سے عائش کو یہ موقع دیا گیا تھا کہ وہ زویا کے لیے ایک خوب صورت سا تحفہ خرید سکے سو آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد بینک سے اپنی سیلری بھی نکلوائی اور موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کر کے آنکھوں میں خوب صورت خواب سجائے جیولر کے پاس جا پہنچا۔ مختلف ڈبے کھلوائے، کتنے ہی ڈیزائن مسترد کیے اور بالآخر تین سفید نگوں والی خوب صورت سی سونے کی انگوٹھی لے کر انہی راستوں پر اپنے موٹر سائیکل کو تقریباً اُڑاتا ہوا منٹوں کا فاصلہ سیکنڈ میں طے کرنے لگا۔

''آج اتنی دیر..... خیر تو ہے نا؟'' روٹین سے ہٹ کر آج وہ تاخیر سے گھر لوٹا تو اُڑی اُڑی رنگت کے ساتھ پریشان سی زویا پر عائش کو بے حد پیار آیا۔

''بھئی کبھی کبھار دیر بھی تو ہونی چاہئے نا۔ ایک سی روٹین سے تو دل اوبنے لگتا ہے۔'' اس نے زویا کی پریشانی کا مزہ اٹھاتے ہوئے جان بوجھ کر اسے مزید ہوا دی۔

''ہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کم از کم پڑوس میں فون کر کے بتا دیتے تو میں اتنا پریشان نہ ہوتی۔''

''بھئی اب ہر کام بیویوں کو بتانے والا بھی تو نہیں ہوتا نا۔'' ہاتھ منہ دھونے کے بعد دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے عائش کے یوں کہنے پر زویا کا چونکنا لازمی تھا۔

''چلیں کم نہ سہی لیکن پلیز آئندہ اگر آنے میں دیر ہو جائے تو مجھے بتا دیا کریں۔ مجھ پر تو ایک ایک منٹ بھاری گزرتا ہے ورنہ.....'' اس نے بظاہر نارمل روّیہ اور مناسب لہجہ رکھتے ہوئے سلاد کی پلیٹ اس کے آگے کی تھی لیکن چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے اس کے اندر کی بے چینی اور جھنجلاہٹ صاف عیاں تھی جس کا جائزہ عائش دل ہی دل میں بخوبی لے رہا تھا۔ دوسرے دنوں کے برعکس آج کھانا نہایت خاموشی سے کھایا گیا تھا جس کے بعد زویا برتن سمیٹ کر کچن میں لے گئی۔ چولہے پر چائے کے لیے پانی چڑھایا اور برتن دھونے کے لیے سنک میں منتقل کرنے لگی۔ ذہن ابھی تک عائش کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُدھر عائش جس نے آج تک زویا سے کبھی کچھ بھی نہیں چھپایا تھا، دبے پاؤں کچن میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا سو

اب کے چونکنے کی باری زویا کی تھی۔

''جو تھی کل بھی پسند، وہ ہے اب بھی پسند، میری مٹھی میں بند ہے کیا؟ بتا دو نا.....؟'' عائش کے اس انداز پر زویا حیران رہ گئی کیونکہ گانا گنگنانا تو کبھی بھی عائش کے مشاغل میں شامل نہیں رہا تھا سو کہاں یہ کہ ایک اشتہار پر چلنے والا گانا گنگنایا جا رہا ہے۔

''عائش! خیر تو ہے نا؟.....آج یہ سب.....؟'' وہ ابھی تک ان تمام انہونیوں کے محرکات سے لاعلم ہونے کی وجہ سے حیرت سے آنکھیں پھیلائے کھڑی تھی۔

''خیر ہی خیر ہے جانِ عائش!'' اس کی طرف سے رُخ پھیر کر عائش نے جیب میں سے انگوٹھی نکالی۔

''یہ دیکھو! آج میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' اس نے بڑے پیار سے زویا کا ہاتھ تھام کر باریک سی تین سفید نگوں والی انگوٹھی اس کی نازک سی اُنگلی میں پہنا دی۔

''آئی رئیلی لو یو زویا!'' مگر حیرت سے گنگ زویا اس وقت کچھ بھی بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ان کی بچت اس بات کی قدرے متحمل نہیں ہو سکتی کہ گولڈ کی خریداری کی جائے۔ تنخواہ کا ایک بڑا حصہ گیس بجلی کے بل، گھر کے اخراجات میں نکل جاتا تھا۔

''لیکن یہ گولڈ رِنگ آئی کہاں سے؟'' حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں لبریز وہ استفہامیہ لہجے میں بولی تو عائش نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''ارے یار! کیا تم بھی نا.....کر دیا نا اتنے رومینٹک موڈ کا ستیاناس۔'' اور جب زویا کو عائش کی زبانی ساری بات پتہ چلی تو خوشی کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''یہ لو، یہ بونس میں ملنے والے پیسے سنبھال کر رکھ لو۔ ان میں سے تو ایک آنہ بھی خرچ نہیں ہوا۔'' اس نے جیب سے نکال کر پیسوں کا لفافہ زویا کی طرف بڑھایا تو وہ مسکرا کر لفافہ لیے بیڈ رُوم کی جانب بڑھ گئی۔ عائش بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ اُدھر دیگچی میں چائے کے لیے رکھا گیا پانی بھاپ بن کر اُڑنا شروع ہو گیا تھا۔

❀---❀---❀

''کیوں بے فلم دیکھے گا؟'' شادے نے جامو کے جھونپڑے میں سر ڈال کر پوچھا تو تنہا بیٹھ کر اپنے چپٹے ناخن چباتے جامو نے رخ پھیرتے ہوئے شادے کو دیکھا اور بولا۔

''منے تاں ایو پتہ ہے اگر فلم ماں ماری گلابو ہووے تاں دیکھو، جرور دیکھوں۔ نئیں تاں ماں کائے کو اپنا وخت جائع کروں۔''

بات کرتے کرتے وہ شادے کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا، جہاں سڑک کنارے بسائی گئی چھوٹی سی

بستی میں تو گویا ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ بڑے میدان میں ذرا ذرا سے فاصلے پر کوبان نما جھونپڑیوں میں زندگی بڑی سست روی سے قدم گھسیٹتے ہوئے گزر رہی تھی۔ کہیں پر کچھ عورتیں کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں کاٹنے اور پھر جوڑنے کے بعد بچھونا بنا رہی تھیں اور کہیں پر مرد بیٹھے دن بھر کے دھندے کو ڈسکس کر رہے تھے۔ شام کے سائے اپنی تمام تر اُداسی سمیت دھیرے دھیرے پنجے گاڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ رسّی نما بالوں والی چند بچیاں الگ سے ٹولی بنا کر کھیلنے میں مصروف تھیں۔ سب کچھ حسبِ معمول ہی تو تھا لیکن جامو کی نظروں کو البتہ قرار نہیں آ رہا تھا جبھی شادے نے اسے دوبارہ ٹھوکا دیا۔

''فر بتا دے، منے پیسے دے گا؟''

یہ بستی والوں کی واحد عیاشی تھی کہ جب ان کے پاس کچھ پیسے جمع ہوتے تو ملا کر کسی واقف دکان والے سے ٹی وی اور وی سی آر کرائے پر لا کر ایک دو فلمیں دیکھ لیا کرتے۔ لیکن فی الحال جامو کسی بات کا جواب دینے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا کیونکہ وہ یک ٹک گلابو کو دیکھتے ہوئے من کی پیاس بجھانے لگ گیا تھا۔ گلابو جو ابھی چند لمحوں پہلے ہی اپنے جھونپڑے سے نکلی تھی، گہرے سانولے رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں والی گلابو کو جب سے بپاشا سمجھا گیا تھا، اس میں نخرہ بڑھ گیا تھا۔ گھٹنوں کو چھوتی کُرتی اور ٹخنوں سے اوپر کے گھاگرے میں سے جھانکتی سیاہ ہوتی پازیبیں چھن چھن کرتیں تو بستی کے سبھی لڑکے خود بخود سورج مکھی کے پھول کی طرح اپنا رخ اس کی جانب کر لیا کرتے۔ سر پر جمایا گیا دوپٹہ جو ہمیشہ صرف کمر ہی کو ڈھانپتا، آج بھی اپنا فرض پورا کیے ہوئے تھا۔ چلتے ہوئے ایک جھونپڑے سے دوسرے میں جاتے ہوئے کبھی پنڈلی کھجلاتی کبھی سر۔ چلنے کا انداز ایسا لچک دار تھا کہ قدم اُٹھتے تو چٹیا کے ساتھ گندھا ہوا لمبا پراندہ کبھی کمر پر پھیلے دوپٹے کی دائیں سمت سے باہر نکلتا اور کبھی بائیں۔ آنکھوں میں مقناطیسی کشش اور الہڑ پُنے کی لوتھی تو آواز میں نرم گرم جذبات کی ترنگ۔

بستی میں کون ایسا تھا جو اس کے ناز و انداز کو گردن کندھے پر ڈالے دیکھتا نہ رہتا اور سوچتا کہ کون ہو گا وہ خوش نصیب جسے گلابو کا ساتھ ملے گا اور خود گلابو بھی ان تمام باتوں سے اچھی طرح واقف تھی جبھی تو اس نے شرط بھی ایسی نرالی رکھ چھوڑی تھی کہ جو بھی پوری کرتا، وہ تمام عمر اس کی داسی بن کر گزار دیتی۔

''چل جامو! فلم تا ماں تھاری گلابو والی لے ہی آؤں پر اُس کو بھی اب کوئی روج بعد دیکھنا چھوڑ دے۔''

شادے کو جیرے کی بے چینی اور غائب دماغی کی وجہ سے اپنے سامنے چلتی پھرتی نظر تو آ رہی تھی مگر اس نے سر کھجاتے ہوئے اس کی توجہ اپنے اوپر لانے کی کوشش کی۔

''چھوڑ دوں؟'' جامو کی نظریں فی الحال جی بھر کے گلابو کو دیکھنے سے ٹھنڈک محسوس کر رہی تھیں مگر دل میں اُترتے ایک عجیب سے سرور نے اُسے بری طرح اپنے حصار میں لے رکھا تھا جبھی دنیا جہان کی وارفتگی اپنی آنکھوں میں سموئے بس اسے دیکھتا رہا۔

''چھوڑ دے گلابو کے سپنے دیکھنا جامو! تھارے لیے ناں ہی بنی۔'' شادا اُسے بت بنا دیکھ کر اب اُکتا گیا تھا سو جھنجلا کر اس کا کندھا اچھی طرح جھنجوڑ ڈالا۔

''مارے لیے ناں ہی بنی ناں تو مار ڈالوں کُھد کو۔'' لمحہ بھر میں جامو طیش میں آ گیا تھا۔

''ایو تاں ربّ جانے۔ پر ماں! تنے بتاؤں، گلابو کا بیاہ اُس سے ہووے گا جو گلابوں کی کھاطر سونے کی مندری لاوے۔''

''سونے کی مندری؟'' جامو کا منہ اس ہوش اُڑتی خبر پر کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''اب بتا منے، کا کھیال ہے تھارا؟''

وہ کیا کہتا۔ شادے کی اس بات پر تو وہ حیرت سے بغیر کچھ کہے بس اس کا منہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ اس کے صاف اور سچے جذبوں کی آنچ اب تک گلابو کے دل تک بھی پہنچ چکی ہو گی لیکن اب اس کی مشروط رفاقت کے اعلان نے تو اسے دم بخود کر چھوڑا تھا اور شرط بھی ایسی جو اس کے لیے ہرگز ممکن نہ تھی۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ قبیلے کے سردار کے بیٹے سانول کے کانوں تک جس لمحے یہ خبر پہنچی اسی لمحے گلابو اس کی پہنچ سے دُور بہت دُور چلی جائے گی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جب گلابو کو اس کی حقیقت کا معلوم ہے کہ ہم سونے کی انگوٹھی حاصل کرنا تو بہت دُور کی بات اسے چھو بھی نہیں سکتے تو ایسے میں اتنی احمقانہ شرط رکھنے کا بھلا کیا جواز؟

''بس شادے! ماری تاں گلابو بھی نرالی اور وس کی باتاں بھی۔'' وہ زیرلب یونہی مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''تاں فیر سکایت اور سکوہ کیوں؟ ماری مان تاں وس کا کھیال نکال دے دل سے۔ تھارے لیے اور بوت۔'' شادے اور جامو کی پرانی دوستی تھی اب اس نے جامو کو بنیان دھوتی پہنے پیڑھی پر بیٹھ کر گلابو کی خاطر منہ لٹکائے دیکھا تو اس کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔

''مارے کو لڑکی جات کا سوق ناں ہی سادے! اور ایو تنے اچھی طریو کھبر ہے۔ منے تا وس گلابو سے پیار بھی ناں ہی، عسق ہے منے وس کے ساتھ..... عسق۔'' جامو نے زمین پر انگلی پھیرتے ہوئے سامنے ہی گری ماچس کی تیلی اٹھا کر اپنی دھوتی کے ایک کونے سے صاف کیا اور دانتوں میں پھراتے ہوئے ڈکار لے کر بولا۔

''جرا کو سیس تاں جرور کروں، اب آسانی سے اپنا عسق ناں چھوڑوں سادے! بس تیں دعا کر، منے مارا عسق، ماری گلابو مل جاوے۔'' وس کی کھاطر منے جو کرنا پڑے وہ کروں۔''

اور تب شادے نے بھی اپنے جگری دوست کی خوشیوں کے لیے دعا کی تھی کہ اسے اس کا عشق اس کی گلابو مل جائے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کسی انتہائی قدم سے بھی گریز نہیں

کرے گا۔

❀---❀---❀

کمپنی کی طرف سے بونس تو دیا گیا تھا مگر اب عائش کو معلوم ہوا تھا کہ کمپنی چونکہ دو بھائیوں کی ملکیت تھی سو اب سانجھے کی ہنڈیا چوراہے میں بس پھوٹنے ہی کو تھی اور ایک بھائی کی جانب سے کیشیئر کے ذریعے ملنے والا بونس بھی اسی معاملے کی ایک کڑی تھی۔ اب یہ اطلاع سچ تھی کہ نہیں مگر بہرحال آج کل آفس میں یہ بات گردش ضرور کر رہی تھی کہ جس سے عائش نے زویا کو بھی آگاہ کر کے ان روپوں کو فی الحال استعمال نہ کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی اور اس کی طرف سے دی گئی اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے زویا ان روپوں کو سنبھال کر صحن میں آئی اور آریان کی کاپی اٹھا کر رہ گئی۔

''انگلش ہماری نہ صرف سرکاری بلکہ قومی زبان بھی ہے۔ معاشرے میں عزت و مقام حاصل کرنے کے لیے اگر روانی سے انگلش بولنا ضروری ہے تو معاشرے کے لیے اسٹیٹس سمبل بھی ہے اور اس زبان سے واقفیت نہ رکھنے والے کو ہر لحاظ سے قابلیت سے عاری سمجھا جاتا ہے۔''

''آریان! میں نے آپ کو قومی زبان پر مضمون لکھنے کو کہا تھا نا اور آپ نے یہ سب کیا لکھا ہوا ہے؟'' زویا نے کاپی میں تحریر محض دو تین سطریں پڑھ کر ہی اس کی نوٹ بک بند کر دی تھی۔

''آپی! صحیح تو لکھا ہے میں نے۔ غلط بھلا کیا ہے؟'' آٹھویں جماعت کے طالب علم آریان نے اُکتائے ہوئے لہجے میں سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''یوں بھی وہ تھا تو آٹھویں کلاس میں لیکن اس کی ذہنی عمر اس کی جسمانی عمر سے کہیں زیادہ تھی اور کچھ گھریلو حالات نے اسے ضرورت سے زیادہ حساس بنا دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ زویا نے اسے پڑھانے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ ویسے بھی وہ ان بچوں میں سے تھا جو قدرتی ذہین تو ہوتے ہیں مگر انہیں صرف کسی کی توجہ یا تھوڑی سی بنیادی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یوں اس طرح زویا کا بھی آسانی سے وقت گزر جایا کرتا۔

''جی نہیں۔ ہماری قومی زبان اُردو ہے اور یہ بات آپ اچھی طرح جانتے بھی ہو پھر.....'' زویا نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے ہوئے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''نہیں آپی! اُردو تو ہم غریبوں کی طرح دھتکاری ہوئی ہے، انگلش میڈیم کے بچے ہمیں حقارت سے دیکھتے ہیں۔ بیرونِ ملک جا کر ہمارے وزراء تک اُردو بولنے میں ہتک محسوس کرتے ہیں حالانکہ کوئی دوسرے ممالک انگلش کے بجائے اپنی زبان کو اہمیت دیتے ہوئے مترجم کا استعمال کرتے ہیں اور دوسرے ممالک کی بات چھوڑیں آپی! خود ہمارے دفتروں پر انگریزی زبان کا راج ہے، ہونہہ بلکہ انگریزی کا تو یہ

حساب ہے کہ آگ لینے آئی تھی، آگ والی بن بیٹھی۔''

''آریان!'' اس کے لہجے کی تلخی زویا کو حیران کر رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے چند منٹ خاموش رہ کر اس کے اندر جمے ہوئے لاوے کو باہر نکلنے کا بھرپور موقع دیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں آپی! ہم جیسے غریب لوگ جو سرکاری سکولوں میں اُردو کو اوڑھنا بچھونا بنا کر ماؤں کو بڑا افسر بننے کا خواب دکھاتے ہیں نا بس بعد میں ہم ہی لوگ ان خوابوں کی کرچیاں بھی سمیٹتے ہیں۔'' سر جھکا کر وہ سامنے رکھی کاپی پر آڑھی ٹیڑھی لائنیں بنانے لگا تھا۔ پہلے تو زویا نے خاموشی سے سوچا مگر پھر اپنے ہی ارادے کی نفی کر کے بولی۔

''محنت کرنے والے لوگ پرائیویٹ اسکولز یا انگلش کے محتاج نہیں ہوتے آریان! تم دیکھو ہمارے مالک کے کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو پوری دنیا میں ملک کا نام روشن کرنے کا باعث بنے، وہ میری اور آپ کی طرح سرکاری اسکولوں سے ہی پڑھے تھے نا۔''

''پتہ نہیں آپی! لیکن آپ یہ بھی تو دیکھئے نا صبور بھائی اب تک نوکری کے لیے صرف اس لیے خوار ہوتے پھر رہے ہیں کیونکہ وہ انگلش لینگویج کا کورس کرنے کے باوجود انٹرویو میں اعتماد سے انگلش نہیں بول پاتے۔ باوجود اس کے کہ وہ نہایت ذہین ہیں مگر انگلش میں روانی نہ ہونے کے باعث نروس ہو جاتے ہیں۔'' سابقہ تلخ لہجے میں اب شکستگی بھی نمایاں تھی اور زویا کے سامنے اب اس کے روّیے کی گتھی چونکہ سلجھ چکی تھی اس لیے چاہتی تھی کہ اسے پیار سے سمجھائے مگر آج وہ پہلے ہی جلدی چھٹی کرنے کا کہہ چکا تھا اس لیے زویا نے اپنا ارادہ کل پر ملتوی کرتے ہوئے چھٹی تو دی مگر اس کی کہی گئی باتیں ذہن کے کونے میں چپک کر رہ گئیں۔

''چلو مسٹر افلاطون! آج تو چھٹی کرو اور اس ننھے سے دماغ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو، باقی تفصیل سے باتیں اِن شاء اللہ کل کریں گے۔'' زویا نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تو وہ بھی ہنسنے لگا۔

اس کے بیگ سمیٹنے تک وہ بھی اُٹھی، چولہا صاف کرنے کے بعد دھونے والے برتن ٹوکری میں رکھے، بچا ہوا سالن پلیٹ میں ڈال کر فریج میں رکھا اور برتن صحن میں نل کے پاس رکھ کر دھونے لگی۔ آریان اس کے صحن میں آنے سے پہلے ہی اسے اللہ حافظ کہہ کر جا چکا تھا اور وہ ابھی تک اس کی حساسیت پر حیران تھی کہ اس عمر میں تو لڑکے عموماً کرکٹ اور دوسرے مشاغل کی باتیں کرتے ہیں اور وہ ابھی سے کن مسائل اور فکروں میں اُلجھا ہوا ہے یہی سوچتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح انگوٹھی اُتار کر ساتھ رکھے گملے میں ڈال دی۔ پہلے بھی اس کا یہی معمول تھا۔ آٹا گوندھتی، برتن دھوتی یا کپڑے، انگوٹھی ہمیشہ اُتار کر رکھ دیتی تھی تاکہ اس کی چمک ماند نہ پڑ جائے اور پھر جس محبت اور جن حالات میں عائش نے اب یہ انگوٹھی خریدی تھی تو اسی

جذبے کے پیشِ نظر زویا کے لیے یہ انگوٹھی اپنے اس تمام زیور سے عزیز تر تھی جو اس نے عائش کو دیئے تھے۔

❀---❀---❀

''وے اب نہ مانے کسی کی بات، منے تاں دماگ کھراب نہ ہو جائے، بوت باتاں کیے ہوں وس کے ساتھ، مائی جرینہ تاں کھاٹ پر لیٹن لاگی تھی، منے بولی کُھد بات کرلیو۔'' شادے نے جامو کے پاس آ کر اسے پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔

''تنے وس کو بتا کہ میں کو وس کے سوا جگ ماں کچھ نجر نہ آوے۔''

''سب بتائے ہوں وس کو اور تنے کھبر ہے کا بولی؟'' شادے نے لمحہ بھر رُک کر کان صاف کیا اور اس کے صبر کو نہ آزماتے ہوئے بولا۔

''بولی، منے بھی کھاب دیکھے ہیں۔ ماراں بھی تاں دل بولے کہ جندگی ماں آن والا جے لمبے قد کا ہو، سادی والے روج سر پر راجپوتی صافہ باندھے، لمبے اور کھلے باجو والی گھیرواں کمیج پہن کر اپنے کان ماں گول گول بالے پہن کر، باجو پر گٹھڑی باندھے وس روج راجہ کے ماپھق نجر آوے۔''

''سادے ایوتاں مسکل ناں ہی۔ وس کے ساتھ مندری کی بات کرن بھیجا ناں تھارے کو، وس کا، کا بولی؟'' جامو نے جب سے اس کی شرط سنی تھی گویا جان پر بنی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا حریف سانول یہ شرط پوری کر کے سرخرو ہو جائے۔ جبھی شادے کو پیامبر بنا کر اس کے پاس صرف اسی لیے بھیجا تھا تا کہ وہ اسے یہ شرط واپس لینے پر رضی کر سکے مگر ایسا نہ ہوا۔ بلکہ گلابو نے وہ تمام حلیہ بھی کہہ سنایا جیسا کہ وہ اپنے ہونے والے دُلہا کو شادی کے روز دیکھنا چاہتی تھی۔

''وے کوئی بات ناں سنے کسی کی، وس کی باتاں سن کر تاں مائی جرینہ بھی نجریں گلاں مان جوڑ لیں، کوئی وخت روئی بھی، پر ترنت اپنی چدر ماں آنسو چھپان کی کوسس مان آجو باجو دیکھن لاگی، پر تھاری گلابو اپنا کھیلا، اپنی سرط نہ بولی۔ وس کا گیروا رنگ تو بولوں دغ دغ کرن لاگا۔ شام سے کی سرکھی ماپھق۔ بولی سادی تو کروں اور جرور کروں پر کروں گی وس کے ساتھ جو ماری سرط پوری کرے۔'' شادے نے جامو کے چہرے پر اُترتی مایوسی بھی دیکھی اور آنکھوں میں جنم لیتا جنون بھی۔

''مائی جرینہ بولی، وس نے بابے بسیرے کو ایو بات ناں بتائی اب تک، پر کئی روج پتہ تاں لاگے ناں وس کو بھی اور کھدا جانے اب تک پتہ لگ بھی گئیو کہ نئیں۔''

''واہ ری ماری گلابو! ایوسن کر مارے تاں ہاتھ پاؤں نہ چلیں، جقین کر سادے! منے لاگے جیسے پاؤں جمین ماں پھنس گئے مارے۔ پر کا کروں مارے دل کی آواج منے کا ناں ماں سنائی دے، دل کرے شتابی بس سونے کی مندری ملے۔''

شادے نے ترس کھاتی نظروں سے جامو کو دیکھا جو اس سردی میں بھی بغیر چادر یا قمیض پہنے صرف بنیان اور دھوتی میں اس کے سامنے اپنے جھونپڑے میں بیٹھا تھا۔

''اور ماری آنکھوں نے تاں اب تک سونے کی مندری دیکھی بھی ناں ہی۔''

''تنے کیا اس پوری وستی ماں کسی کے کھاندان ماں اب تک سونے کی مندری ناں آئی اور ماری بات مان جامو! ستی ماں دوجی بھی تاں ٹانڈے ماپھق لڑکیاں ہی، کنی اور پسند کر رکھ وس کا دھیان چھوڑ دے، وے آپ ہی سادی کرے، آپ برلاوے۔ تُو وس کا ٹنٹا کھتم کر۔''

شادے نے اپنے تئیں بڑا مفید مشورہ دیا تھا اور اب کونے میں پڑا ٹھنڈی چلم والا حقہ اٹھا کر اس کے قریب لے آیا تھا اور اسے گڑگڑاتے ہوئے جامو کے جواب کا منتظر رہا جو اس کی بات سن کر بھی ٹھونکے کیل کی طرح ویسا کا ویسا بیٹھا رہا۔

''جرا جان تگڑی کر اور وے گلابو آپی کانچ کی گڑیا سمجھے ناں پر تیں دیکھیں وس کانچ کی گڑیا کنے پلید بلی بنا دیوے وس کے ساتھ سادی کرنے والا۔''

''ناں سادے! ناں۔ وس کو کچھ ناں بول.....'' جامو سے برداشت نہ ہوا تھا کہ شادے کے منہ سے گلابو کے لیے ایسی کوئی بات بھی سنتا، جبھی اس کی حمایت میں بول پڑا۔

''اولاد اگر بن ماں باپ کے پلے تاں وے کھوڑ ہو ہی جاوے، اس ماں گلابو کا دوس۔''

''فرتیں جانے اور تھاری گلابو۔ منے تاں کچھ سمجھ نہ آوے، تھاری عاشقی کا، کا بنے؟'' شادے نے تو ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اب حقہ تازہ کرنے کے لیے چلم ہاتھ میں پکڑی اور آٹے کے کنستر کے اوپر رکھے شاپر میں سے گڑ کی ننھی سی ڈلی اٹھائی اور اسی شاپر میں رکھے دوسرے لفافے میں سے تمباکو مٹھی میں لیا اور چلم میں موجود سابقہ راکھ گرانے کے لیے جھونپڑے سے نکل گیا۔ جب کہ جامو اس وقت بجلی کی سی رفتار سے گزرتے وقت کو اپنے حق میں کرنے کا گُر ذہن میں آنے پر مسکراتے ہوئے قدرے مطمئن لگ رہا تھا۔

❀---❀---❀

''اللہ کے نام پر منے کچھ دے دیو بابا!.....اللہ رسولؐ کے کے نام کی کھاطر ماری مدد کر دیو۔''

ابھی برتن دھوتے زویا کو چند ہی منٹ گزرے تھے کہ گلی سے آتی یہ صدا اس کے کانوں تک پہنچی اور ساتھ ہی دروازہ بجانے کی بھی آواز آئی تو اس نے فوراً ہی صابن لگے اپنے ہاتھ دھوئے اور ہمیشہ کی طرح کچھ دینے کی نیت سے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ.....مگر یہ کیا؟

آریان کے جانے کے بعد وہ اس کی باتوں کے خیال میں یوں اُلجھی ہوئی تھی کہ دروازہ اندر سے بند

کرنے کا تو دھیان بھی نہیں رہا تھا جبھی اس کے قدم جہاں تھے، وہیں رُک گئے تھے۔ ٹخنوں سے بالشت بھر اونچا سبز چوغہ، پاؤں میں تین چار کڑے۔ گلے میں موٹے موٹے پتھر نما موتیوں کی مالا اور سر پر مختلف قسم کے کپڑوں کی ٹکڑیاں جوڑ کر بنائی گئی ٹوپی جس میں سے بال نکل کر شانوں پر جھول رہے تھے۔ ایک پاؤں دروازے کے اندر اور دوسرا باہر کیے سرمہ لگی آنکھوں سے وہ لمبا چوڑا اور ہٹا کٹا فقیر بڑی گہری نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''جو دیوے اُس کا بھلا۔'' دروازے کے عین درمیان میں کھڑے ہو کر اس نے بازو دراز کوتے ہوئے کشکول اس کی طرف بڑھایا تو زویا کے انگ انگ میں سنسنی دوڑ گئی اور جسم جیسے چیونٹیوں کی گزرگاہ لگنے لگا۔ بھائیں بھائیں کرتے خاموش اور چپ چاپ در و دیوار اس بات کے گواہ تھے کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہے۔

''اگر مانگنا ہی ہے تو دروازے کے باہر کھڑے ہو کر مانگو۔ یہ کون سا طریقہ ہے؟'' تمام تر ہمت جمع کر کے وہ آخر بول ہی پڑی۔

''ارے ڈر مت بچے! مارا کام تنے نصقان پوچانا نہ ہووے۔ ماں تاں کھیر بانٹوں، سب کے واسطے بس کھیر.....''

زویا اُس کا حلیہ، اُس کی بات چیت اور خصوصاً اس کے دیکھنے کے انداز سے بے انتہا گھبرا گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے کہ ایک دم چونک ہی تو گئی۔

''حق اللہ.....حق.....'' آنکھیں بند کر کے جھوم کر کہتے ہوئے اُس ''اللہ لوک' نے بائیں ہاتھ میں پکڑا وہ ڈنڈا جس پر جابجا رنگ برنگے دھاگے بندھے ہوئے تھے، زور سے زمین پر دے مارا تھا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے گھر سے تو باہر نکلو، پھر میں کچھ دیتی ہوں۔'' گو کہ لرزش زدہ ٹانگوں کی کپکپاہٹ اُس کے رہے سہے اعتماد کو بھی ختم کیے دے رہی تھی لیکن ظاہر ہے جیسے تیسے آخر ہمت تو کرنا ہی تھی سو دو قدم آگے بڑھا کر اس نے ہاتھ کے اشارے کا سہارا لیتے ہوئے اسے باہر نکلنے کو کہا تو اس اللہ لوک نے براہِ راست اپنی عقابی آنکھیں زویا کی آنکھوں کی سیاہ پُتلیوں پر مرکوز کرتے ہوئے ایک دم ہی بڑے جلالی انداز میں اسے وہیں اسی جگہ پر روک دیا۔

''منے جیسے اللہ لوک گھر آویں تاں دھکے ناں ہی دیتے بچے! وس راسدہ بھی مارے ساتھ ایہو کس کیو، ہونہہ اب کھد قزرت وس کو مٹی ماں رول رہی ہے۔'' خلا میں کچھ کھوجتے ہوئے اپنی بولتی آنکھیں اس پر مرکوز کر کے اس نے جانے کس راشدہ کی بات کی تھی لیکن زویا کو ایک دم اپنا سر زور سے چکراتا اور درد کرتا محسوس ہونے لگا تھا۔

''لل.....لیکن میں تو ابھی پیسے دے رہی تھی ناں آپ کو۔'' بری طرح گھبراہٹ کا شکار زویا نے

دروازے کے ساتھ ہی رکھے چند سکّوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ای او.....'' وہ بڑے استہزائیہ انداز میں مسکرایا اور خود ہی وہاں سے سکّہ اٹھا کر ہاتھ کے اشارے سے اسے پاس بلایا اور خود گیٹ بند کر کے وہیں اندرونی طرف فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بلا چوں چرا چھوٹے چھوٹے چار پانچ قدم اُٹھاتی اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی ہوگئی۔

''سائیں ماچس والی سرکار (فرضی نام ہے) کا گلام ہوں ماں۔ بچے سرکار کے نام کی نیاج لوں، اپنے کنے کچھ ناں رکھوں۔ تیں بھی میکوں جرا دل بڑا کر کے نیاج دے۔'' اس کے وہیں سامنے بیٹھ جانے پر اس نے زویا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یوں بات کی گویا ہونٹ تو ہلے ہی نہیں تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم کلام ہوگئی تھیں پھر سکہ منہ میں ڈال کر داڑھ کے نیچے رکھ کر دبایا اور تھوک سمیت زویا کی طرف بڑھا دیا۔ زویا نے بھی میکانکی انداز میں اپنی ہتھیلی پھیلائی اور سکّہ تھامتے ہی یوں مٹھی کو بھینچا گویا تبرک کی بے ادبی کا ڈر ہو۔

''وس سکے کو گھر کے پیسوں کے ساتھ رکھ چھوڑ۔ فر دیکھیو پیسہ چھمق کی ماچھق تھارے گھر میں کھنچا آوے گا۔'' چند منٹ پہلے مزاحمتی روّیہ رکھنے والی زویا اب اس کی ہر بات پر دل سے یقین بھی کر رہی تھی اور چہرے پر اللہ لوک کے لیے نہایت عقیدت بھی تھی۔

''بابا مہینے کے آخری دن ہیں نا۔ اس لیے تنخواہ تو تقریباً ختم ہوگئی ہے مگر کچھ بونس کی رقم ہی ہے جو میں استعمال نہیں کر سکتی۔''

''ہوں.....'' آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے اس اللہ لوک نے چند لمحے کا مراقبہ کیا اور پھر ایک دم جیسے ''منزل'' پا لینے پر حق اللہ.....حق اللہ کہتے ہوئے ڈنڈا زمین پر دے مارا۔

''او بچے! مارے کو مرشدوں سی طرفاں اتنی اجاجت تاں نئیں پر تھارے لیے منے کھاس عرجی ڈال کر سرکار سے اجاجت لی ہے۔ تھارے سوہر سے بھی پوچھ لیو منے اب کی اب..... جا لے آ جلدی شتابی۔''

اللہ لوک نے زویا پر خاص عنایت کرتے ہوئے اپنے علم کے ذریعے عائش سے بھی اجازت لے لی تھی۔ سو زویا نے خوابیدہ انداز میں چلتے ہوئے بونس میں ملنے والی رقم اسی طرح خاکی لفافے میں لا کر اس کے حضور پیش کر دی۔ دونوں ہاتھوں سے لفافہ تھام کر فرش پر رکھنے کے بعد چند لمحے آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا رہا اور پھر اس سے پانی لانے کا کہا لیکن جب تک وہ پانی لائی وہاں نہ تو اللہ لوک کا کوئی وجود تھا نہ ہی خاکی لفافے میں بند ان روپوں کا۔ اور تب اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے وہ کسی بہت لمبی نیند سے جاگی ہو۔ پانی لانے اور یہاں یوں فرش کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کا مقصد بھی ذہن سے محو تھا۔ غائب دماغی سے اس نے گلاس وہیں ایک طرف رکھا، کھلے ہوئے دروازے کو کنڈی لگائی اور وہیں بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحوں میں اس کی یادداشت واپس آنے لگی اور تبھی اس پر منکشف ہوا کہ وہ اپنی تمام تر پونجی گنوا بیٹھی

ہے۔ بے اختیار آنسو اُس کے چہرے سے ہو کر گود میں رکھی ہتھیلیوں پر گرنے لگے تو یکا یک اسے اپنی انگوٹھی کا خیال آیا۔ بجلی کی سرعت سے قریب ہی موجود گملے کو دیکھا تو وہ بھی خالی تھا۔ روتے روتے اب کی بار وہ گملے کے پاس بیٹھی تو بس بیٹھتی ہی چلی گئی۔ یعنی وہ اللہ لوک اسے اللہ کے نام پر خالی ہاتھ اور تہی داماں کر گیا تھا۔

❀---❀---❀

آج کا دن ہی شاید اپنے دامن میں زویا اور عائش کے لیے عجیب وغریب اتفاقات لیے ہوئے طلوع ہوا تھا۔ پہلے وہ اللہ لوک ساری جمع پونجی لے اُڑا تھا اور اب عائش کے کمپنی ہیڈ اور پولیس..... وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر پولیس اس کے گھر کی تلاشی کیوں لے رہی ہے؟ یوں بھی ہمارے ملک میں پولیس اتنی بااختیار ہے کہ جب چاہے بغیر اجازت نامے اور اطلاع کے کسی بھی عام آدمی کے گھر کی تلاشی لے سکتی ہے۔ اسی دوران عائش گھر میں داخل ہوا اور زویا ہی کی طرح وہ بھی پولیس کو دیکھ کر حیران تو ہوا ہی مگر چہرے کا رنگ بھی اُڑ گیا۔

''کیوں بی بی! کہاں ہے وہ رقم جو بونس کے نام پر ورکرز کو خریدنے کے لیے دی گئی تھی اور سبھی ورکرز نے باقاعدہ دستخط کر کے وہ تمام روپے وصول بھی کیے اور سر کے خلاف پولیس کو دینے والی درخواست کا حصہ بھی بنے؟'' پولیس آفیسر کمپنی ہیڈ کے سامنے مکمل طور ایکٹیو نظر آ رہا تھا اور درست جواب کے حصول کی خاطر اس نے عائش کا منہ بھی زویا کے مخالف سمت کر دیا تھا تاکہ کوئی واضح اشارہ نہ دیا جا سکے۔

''رقم؟..... سر! آپ جہاں چاہیں پورے گھر میں چیک کر لیں۔ ایسی کوئی رقم ہمارے گھر میں نہیں۔''

''نہیں..... کیسے نہیں؟ جب سر کا بھائی خود کہتا ہے کہ اس نے عائش سمیت سب لوگوں کو انہیں خریدنے کے لیے رقم دی ہے اور میرے پاس ان نوٹوں کے نمبر ہیں پھر آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ رقم گھر پر ہے ہی نہیں؟''

''ٹھیک سر! اگر وہ اتنے ہی سچے ہیں اور آپ ان کی باتوں کو اتنا ہی سچ جانتے ہیں تو پھر ان کی طرف سے دائر کی گئی وہ شکایت بھی کیا سچی ہے؟'' زویا کی بات پر وہ پولیس مین لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔

''اور سر! آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو کہا تھا کہ انہوں نے سب ورکرز کو وہ روپے ایک ہفتے تک استعمال نہ کرنے کا کہا تھا۔ سو اگر میرے پاس رقم ہوتی تو کیا میں اسے کہیں خرچ کرتا؟'' پولیس آفیسر اور کمپنی کے ہیڈ نے ایک دُوجے کو بغور دیکھا۔

''سر! آپ لوگ یہ یقین کریں۔ نہ تو میرے پاس وہ روپے ہیں اور نہ ہی میں نے کہیں خرچ کیے ہیں۔ اور اگر ہوتے تو بھلا اس چھوٹے سے گھر میں بھلا میں کہاں چھپاتا؟'' عائش کے التجائیہ انداز پر اس

کے کمپنی ہیڈ کا ہی دل پسیجا سو پولیس آفیسر سے مخاطب ہوا۔

''چھوڑیں، رہنے دیں اسے۔ یہ میری کمپنی کا ذہین اور ایمان دار انسان ہے۔ یقیناً اس کے پاس وہ روپے نہیں ہیں ورنہ جھوٹ نہ بولتا۔''

''آپ لوگ پلیز اس بات کا یقین کر لیں کہ ہمارے گھر میں اس رقم کا ایک روپیہ بھی موجود نہیں ہے۔ تلاشی پہلے بھی آپ ہر جگہ کی لے ہی چکے ہیں۔ تسلی کرنا چاہیں تو بے شک ایک بار پھر اچھی طرح جانچ پڑتال کر لیں۔''

زویا چونکہ سچ بول رہی تھی اور گھر میں رقم کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جبھی نہ تو لہجہ کانپا نہ الفاظ ڈگمگائے۔ البتہ عائش جو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ محض اسے بچانے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لے رہی ہے، اپنے چہرے کے تاثرات کا توازن درست نہیں رکھ پا رہا تھا۔

''مجھے تم پر فخر ہے عائش!'' کمپنی ہیڈ نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپکا۔ ''تمہاری ایمان داری اور محنت کا تو پہلے بھی پورے اسٹاف میں چرچا تھا اور میں خود تمہاری اس خوبی کا معترف بھی تھا مگر آج تو تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔''

ان کی اس قدر تعریف پر جہاں عائش نے سر جھکایا تھا، وہاں انگلیاں چٹخاتی اور انہونی کے ڈر سے مضطرب زویا نے بھی بے اختیار گہری سانس لے کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

''اور اب پرموشن یقیناً تمہارا حق بنتی ہے۔'' انہیں خوشخبری سنانے کے بعد یوں پولیس کے گھر پر آنے اور تلاشی لینے کی معذرت کرتے ہوئے وہ جب گھر سے رخصت ہوئے تو عائش اور زویا دونوں ہی حیران تھے۔

یہ سچ تھا کہ اس نے وہ پیسے بونس کی مد میں وصول کیے تھے مگر اس بات سے وہ قطعی طور پر لاعلم تھا کہ یہ روپے کمپنی ہیڈ کے خلاف شکایت درج کروانے کے لیے دستخط کرنے کی مد میں اسے ادا کیے گئے ہیں اور یہ بات محض اس کی ایمانداری کی وجہ سے اس سے مخفی بھی رکھی گئی تھی اور زویا جو ابھی کچھ دیر پہلے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس نے تو آج تک کسی دوسرے کیا، گلی سے گزرنے والے فقراء کے بارے میں بھی برا سوچا نہ عمل کیا تو پھر آخر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا کہ وہ جو اللہ کی محبت میں اللہ کے بندوں سے محبت کا رویہ رکھے ہوئے تھی، اسے آخر اس مصیبت اور پریشانی کا سامنا کیوں کرنا پڑا جو اس اللہ لوک کے ذریعے گھر میں داخل ہوئی۔ مگر پولیس اور کمپنی ہیڈ کے جانے کے بعد اب اس کا یقین اس بات پر مزید پختہ ہو گیا تھا کہ بعض اوقات ربّ ذوالجلال اپنے پیارے بندوں کو معمولی پریشانی دے کر کسی بڑی مصیبت سے بچا لیتا ہے۔

''کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو زویا! جو میں سوچ رہا ہوں؟'' عائش نے اسے چپ چاپ کسی سوچ

میں مگن دیکھ کر پوچھا تھا۔ وہ چونکی، مسکرائی اور گہری سانس لے کر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔
''بے شک وہ سب سے اعلیٰ کارساز اور بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔'' عائش نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور شکرانے کے نفل پڑھنے کے ارادے سے اُٹھ گیا۔

❀---❀---❀

بس اسٹاپ سے میل بھر دُور خانہ بدوش فقیروں کی یہ بستی آج تو کچھ الگ ہی ڈھب میں نظر آتی تھی۔ رنگین پیڑھی پر بیٹھی گلابو، آتشی گلابی جوڑا پہنے، سر کے بالوں کو پراندے میں گوندھ کر چٹیا بنانے کے بجائے پتلی پتلی مینڈھیاں بنائے، بازوؤں اور گلے میں مصنوعی مگر سنہری زیورات سجائے اپنی کاجل لگی بڑی بڑی آنکھوں کو جھکائے جام کے ساتھ شرمائی لجائی بیٹھی تھی اور جامو فخر سے یوں گردن اکڑائے ہوئے تھا جیسے سومنات کا مندر اسی نے فتح کیا ہو۔ بستی کے باقی لوگ بھی نیم دائرے کی شکل میں ان دونوں کے گرد موجود تھے اور سب ہی گلابو کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔
گلابو کی سہیلیاں گھی کے خالی ڈبے کو بجا کر مختلف گیت گا رہی تھیں کہ آج گلابو اور جامو کے ایک ہونے کا دن تھا اور پھر جیسے ہی ان سب نے اپنی بپاشا کا پسندیدہ گانا ''ماہی ماہی مینوں چھلا'' گانا شروع کیا تو ساتھ ہی خود کو رقص کرنے سے بھی نہ روک سکیں۔
بابے بسیرے اور سانول سمیت سبھی ہتھیلی پر جم جانے والی اس سرسوں پر حیران تھے اور جب جامو نے اپنے وعدے کی تکمیل کی صورت میں جیب سے انگوٹھی نکال کر مائی جرینہ کی طرف بڑھائی تو مائی جرینہ نے بڑی سہولت سے اس کا ہاتھ سامنے بیٹھی زیرلب مسکراتی گلابو کی طرف موڑ دیا اور یوں جب جامو نے گلابو کو وہ تین سفید نگوں والی خوب صورت سی انگوٹھی پہنائی تو وہاں موجود تمام بستی والوں کی آنکھوں میں رشک و حسرت تھی اور گلابو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ کر وہ ان روپوں کا دکھ فراموش کر گیا تھا جو بستی تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں اِدھر اُدھر جا گرے تھے۔
وہاں موجود تمام لوگوں اور خود جامو نے آج سے پہلے تک تو کبھی سونے کی انگوٹھی کو چھوا تک نہیں تھا مگر آج سونا خود گلابو کی انگلی کو چوم رہا تھا اس لیے گلابو کا اِترانا بھی حق پر تھا۔ سو نظروں ہی نظروں میں گلابو کا طواف کرتا جامو آج خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کر رہا تھا کہ آج اس کی گلابو حقیقت میں بپاشا بنی ادائیں دکھا رہی تھی اور ایک سونے کی انگوٹھی کے بدلے اب تمام عمر کے لیے اس کی ملکیت تھی۔

❀---❀---❀

صبح کا بھُولا

''بیگم! آپ نے کوئی آخری رائے نہیں دی۔'' فاروق صاحب نے سیب چھیلتی ہوئی اپنی نصف بہتر کو مخاطب کیا جو آج کل معمول سے زیادہ چپ لگ رہی تھیں۔

''میں کیا بتاؤں؟ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ ایک دو دن کا نہیں، بیٹی کی ساری زندگی کا معاملہ ہے۔'' انہوں نے سیب کاٹ کر پلیٹ ان کی طرف کھسکائی اور مضطرب سی چھلکوں کو انگلیوں پر لپیٹنے لگیں۔

''دیکھو بیگم! رافع کوئی غیر نہیں۔ میری سگی بہن اور تمہارے بھائی کا بیٹا ہے۔ گو کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں لیکن رافع کا مزاج ان ہی کی طرح دھیما اور سلجھا ہوا ہے۔ پھر خوب صورت ہے، برسرِ روزگار ہے اور سب سے بڑھ کر اپنا ہے۔ کسی قسم کی جانچ پڑتال نہیں کرنا پڑے گی اور پھر عورتوں کی خواہش کے عین مطابق فیملی بھی چھوٹی ہے۔'' فاروق صاحب اس رشتے پر سو فیصد آمادہ تھے لیکن چاہتے تھے کہ باہمی رضامندی سے ہاں کی جائے۔

''آپ کی ہر بات درست ہے لیکن..... اصل خدشہ مجھے اس کی جیٹھانی سے ہے۔ وہ اور اس کی بیٹی دونوں ہی بہت تیز ہیں اور اپنی عروبہ تو بہت بھولی ہے۔ جانے ایسے ماحول میں ایڈجسٹ کر پائے گی یا نہیں۔'' انہوں نے دبے دبے الفاظ میں ذہن میں کلبلانے والے خدشات کا اظہار کیا۔ ''اور پھر انس اور حسنین بھی تو موجود ہیں۔ خاندان کے بھی ہیں اور ان کے گھر کا ماحول بھی بے حد اپنائیت بھرا ہے۔ آگے جیسی آپ کی مرضی۔'' اپنی رائے کا اظہار کرنے کے بعد ہمیشہ کی طرح فیصلہ ان پر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن اپنے مزاج کے برعکس فاروق صاحب کے چہرے پر خفگی کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ پیشانی پر

نمودار ہونے والی شکنیں آئندہ کے خراب موسم کی پیش گوئی کر رہی تھیں۔

''اگر ہم یہ چاہیں کہ عروبہ کی وجہ سے ثریا اور دوسرے کہیں اور منتقل ہو جائیں تو یہ سراسر غلط ہے۔ پھر شادی کے بعد لڑکی کو ہر قسم کے ماحول میں ڈھلنا ہی پڑتا ہے۔'' ہاتھ میں پکڑی سیب کی قاش انہوں نے واپس پلیٹ میں رکھ دی تھی۔

''ثریا کتنی دفعہ فون کر چکی ہیں۔ کب تک انہیں ٹالیں گے ہم؟.....اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری بہن نے مرنے سے چند دن پہلے ہی اس خواہش کا اظہار کیا تھا، میں اسے ہرگز رد نہیں کر سکتا۔'' بات ختم کر کے وہ رُکے نہیں اور چیئر کھسکا کر لان میں چلے گئے۔

شاید کھلی فضا میں سانس لے کر اندر کی گھٹن کم کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی جبھی دل ہی دل میں پشیمان ہوئے تھے اور خود کو ملامت بھی کر رہے تھے۔ لیکن کیا کرتے، اپنی بیماری کے ہاتھوں پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی زندگی ہی میں اسے شاد و آباد دیکھ سکیں۔

سب سے بڑے شاہ زیب نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جوائننگ دی تو ساتھ ہی اپنی خوبرو کولیگ کو دل بھی دے بیٹھا۔ ماں باپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہنسی خوشی دونوں کو نکاح کے شرعی بندھن میں باندھ دیا۔ چند ماہ ساتھ رہے اور پھر کمپنی ہی کی جانب سے ملنے والے لگژری اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئے۔ البتہ ہفتے میں ایک دو بار ضرور چکر لگا لیا کرتے۔ اس سے چھوٹی روحینہ نے جس دن ایم اے اکنامکس کا آخری پرچہ دیا، شام ہی کو اس کی پھپھو اور ہونے والی ساس شادی کی تاریخ رکھ گئیں۔ اب اس کے ایک پیاری سی بیٹی اور ایک ننھا سا بیٹا تھا اور وہ اپنی شادی شدہ زندگی بے حد مطمئن انداز میں گزار رہی تھی۔ سسرال نزدیک ہی تھا لہٰذا اکثر آتی جاتی رہتی۔ عروبہ چونکہ سب سے چھوٹی اور بھولی بھالی طبیعت کی سادہ سی لڑکی تھی لہٰذا اس فرض کی ادائیگی میں سبھی متذبذب نظر آ رہے تھے اور اب تو اس کا MCS کا رزلٹ بھی آ چکا تھا لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر ثریا کو ہاں کہہ دیا گیا۔ بیٹیوں کی جدائی کا تصور ہی کس قدر سوہانِ روح ہوتا ہے، کوئی ماں باپ کے دل سے پوچھے۔ لیکن فرض آخر فرض ہے اور پھر اس فرضِ پیغمبر سے کوئی انکار کر سکا ہے بھلا؟

❀---❀---❀

ساس سسر تو تھے نہیں لہٰذا ثریا ہی گھر کی بڑی تھیں۔ ساس کی زندگی ہی میں گھر کا تمام نظام سنبھال لیا تھا۔ دو نندیں تھیں اور ایک دیور۔ جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئیں تو رافع کی عمر محض دس سال تھی البتہ نندیں بڑی تھیں۔ آسیہ کی منگنی ہو چکی تھی اور جلد ہی شادی کے بعد اسے کینیڈا کے لیے رختِ سفر باندھنا تھا

کہ اس کی ہونے والی سسرال وہیں رہائش پذیر تھی۔ اس سے چھوٹی رقیہ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔

ثریا کیونکہ خود جوائنٹ فیملی ہی سے آئی تھیں اور کچھ بڑی شادی شدہ بہنوں کے تجربات سے مستفید ہوتی رہتی تھیں اس لیے انہیں ایڈجسٹ ہونا کوئی مشکل نہ لگا۔ ویسے بھی صاف ذہنیت اور کھلے دل کے لوگ تھے۔ نہ تو بے جا روک ٹوک اور پابندیوں کی دیوار کھڑی کی گئی اور نہ ہی بیٹے کے کان بھرنے اور بہو پر سختیاں کرنے کی تاریخ دُہرائی گئی۔ عظمت اللہ ٹیلی فون کے محکمے میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی جو ظاہراً چخ چخ کا باعث بنتی۔ اور ویسے بھی زرینہ خاتون کے رکھ رکھاؤ اور نرم مزاجی کی ایک دنیا گواہ تھی۔

شادی کے بعد دو سال تک اللہ نے ثریا کو گھر والو میں گھلنے ملنے کا خوب موقع دیا کہ بچوں کی ذمہ داری شروع نہیں ہوئی تھی لہٰذا آسیہ کے ساتھ مل کر گھر کی تزئین و آرائش کرتی تو کبھی زرینہ خاتون کے ساتھ مل کر اس کی شادی کی تیاریاں کرتی۔ کبھی رقیہ کو پڑھائی میں ہیلپ کرواتی تو کبھی رافع کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہی ہوتی۔ ہلکے گھنگھریالے بالوں اور براؤن چمکتی آنکھوں والا رافع اس سے بہت اٹیچ ہو گیا تھا۔ غرضیکہ جو بھی دیکھتا ان کے گھرانے کو مثالی قرار دیتا اور ان ریمارکس پر جہاں زرینہ خاتون کا سر فخر سے بلند ہوتا، وہیں کاظم کا سینہ بھی تن جاتا اور عظمت اللہ، خدا کا شکر ادا کرتے کہ ان کے گھر میں ساس بہو اور نند بھاوج کی روایتی لڑائی نے جنم نہیں لیا۔

وقت گزرتا گیا۔ عظمت اللہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آسیہ اور رقیہ دونوں ہی شادی کے بعد بیرونِ ملک جا بسیں۔ حنا اور سعد کی آمد کے بعد ثریا اور کاظم کی فیملی بھی مکمل ہوئی اور اب پانچ سال کے کنٹریکٹ پر کاظم سویڈن میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا جس کے بعد ایک نہایت روشن مستقبل اس کا منتظر تھا۔ جبکہ رافع زبردست شخصیت اور وجاہت کے بھرپور شاہکار کے طور پر یونیورسٹی جا پہنچا۔

❀---❀---❀

''رافع!'' بلیو ٹریک سوٹ اور جاگرز پہنے ہاتھ میں گاڑی کی چابی بے خیالی سے جھلاتا وہ کار پورچ کی طرف بڑھنے ہی والا تھا جب زرینہ خاتون نے اسے آواز دی۔

''اوہ ممی! میں نے آپ کو بیٹھے بالکل نہیں دیکھا۔'' وہ بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور اب شرمندگی سے وضاحت دے رہا تھا۔

''ارے بیٹا! میں یہاں بیٹھی ہی نہیں تھی تو دیکھتے کیسے؟ میں تو لاؤنج سے کاظم کا فون سن کر نکلی تھی۔'' انہیں اس کی فرماں برداری پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ گو کہ کاظم بھی نافرمان تو نہ تھا لیکن بیوی کو خوش رکھنے کے لیے اکثر ڈنڈی مار جاتا۔ کچھ عورتوں نے زرینہ خاتون کو بھی یہ بتایا کہ ثریا کہا کرتی ہیں کہ پہلے گھر میں

میری حیثیت اتنی مستحکم نہیں تھی تو ہر لحاظ سے گھر والوں کی چاپلوسی کرنی پڑتی تھی۔ اب جبکہ میرے بچے ہیں اور میرے اپنے پاؤں مضبوط ہو چکے تو میں کیوں کسی کو خاطر میں لاؤں۔ (وہی ہمارے معاشرے کی اکثریت کی سوچ) ماں صوفے پر بیٹھی تو اس نے بھی کارپٹ پر بیٹھ کر سر ان کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ یہی اس کا مخصوص انداز تھا۔

''جم جا رہے تھے نا؟'' وہ اس کے گھنگھریالے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگیں۔

''جی! لیکن آپ کو کوئی کام ہے تو نہیں جاتا۔'' وہ ایسا ہی تھا۔ لمحہ بھر میں ماں کے سامنے سرنڈر کر جاتا۔

''ارے بیٹا! جیو ہزار برس۔ کام وام کیا..... بس ایک خواہش تھی۔'' دل میں خوشیوں کی نئی جوت جلائے وہ اس کے بالوں کو سیدھا کر رہی تھیں جو پھر اپنی اصلی حالت میں آ جاتے۔

''خواہش!'' بھوری آنکھوں میں حیرت لیے اس نے سر اُٹھایا۔ ماں کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ سے بھی وہ شاید کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''ارے پگلے! شادی کرنا چاہتی ہوں تیری۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی تو وہ بے ساختہ کھسیا کر ہنس دیا۔

''اگر آپ کی خواہش ہے تو غلام حاضر ہے۔'' سینے پر ہاتھ باندھ کر بیٹھے بیٹھے اس نے ماں کے قدموں تک سر جھکا دیا۔ ادھر ثریا، سعد کی ٹیوشن ٹیچر کے وقتِ مقررہ پر نہ پہنچنے پر جھلائی ہوئی نیچے اُترنے ہی والی تھی کہ ساس اور دیور کے اس ڈرامائی انداز پر پہلی سیڑھی پر ہی رُک گئی۔

''جیتے رہو۔ اچھا تو پھر غلام یہ بتائے کہ کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے اس نظر سے۔'' بیٹے کے خوبصورت جواب پر وہ کِھل سی گئی تھیں جبھی ایک دم خوشگوار موڈ میں بولیں۔ ثریا کا رُواں رُواں کان بنا ہوا تھا۔ رافع کے کھڑے ہوتے ہی وہ احتیاط سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ مبادا اُنہیں دیکھ کر موضوع نہ بدل جائے۔

''جو بھی کہوں گا سچ سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔'' کھڑے ہوتے ہی اس نے اجازت طلب نظروں سے ماں کو دیکھا جنہوں نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ کے اشارے سے ملکۂ عالیہ کا سا انداز اپناتے ہوئے اجازت دے ڈالی۔

''لڑکی تو دیکھ رکھی ہے ملکۂ عالیہ!'' شرارت ہنوز آنکھوں میں رقصاں تھی۔ اوپر کھڑی ثریا کا تجسس دیدنی تھا جبکہ زرینہ خاتون نے بھی مسکراتے ہوئے استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

''مگر میں نے نہیں.... آپ نے۔ ایم آئی رائٹ؟'' بے اختیار ان کی مسکراہٹ قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔

''اللہ تجھے خوش رکھے۔ جیتا رہ میرے بچے! جیتا رہ۔'' حسبِ توقع جواب پر وہ نہال سی ہوئی جا رہی تھیں۔ لمحہ بھر میں انہوں نے تصور میں عروبہ اور رافع کی جوڑی کی بلائیں تک لے ڈالیں۔ ادھر ثریا کے

ذہن میں عرصے سے پلنے والے ایک خیال نے بجلی کی سرعت سے کروٹ لی جسے عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے فوراً فون کی جانب قدم بڑھائے۔

❀---❀---❀

''بھابی! آج کھانے پر اتنا اہتمام؟ کوئی آ رہا ہے کیا؟'' آج وہ یونیورسٹی سے جلدی لوٹا تھا۔ گو کہ ابھی لنچ ٹائم نہ تھا لیکن پھر بھی کچن سے اُٹھتی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اس کے قدم خود بخود کچن کی جانب موڑ دیئے جہاں حسبِ توقع ثریا مصروف تھیں۔ زرینہ خاتون اب محض رافع کی کوئی اسپیشل فرمائش پوری کرنے ہی کچن کا رخ کرتیں ورنہ ثریا کو یہ گلہ رہتا کہ وہ شاید اس کی نگرانی کرنے آتی ہیں۔

شامی کباب کی ٹکیاں بنا کر وہ ٹرے میں رکھ رہی تھیں جہاں پہلے سے چکن رولز بھی رکھے ہوئے تھے تاکہ سرو کرتے وقت اسی وقت فرائی کر لیں۔ آج کریماں کو بھی دیر تک روک لیا گیا تھا جو بڑی پھرتی سے کبھی کھیر میں چمچ چلاتی اور کبھی بریانی کے لیے لچھے دار پیاز کاٹتی۔ ثریا نے رافع کو کچن میں داخل ہوتے دیکھا تو پہلے سے گرم تیل میں کباب اور چکن رول ڈال دیئے۔

''آج شبانہ اور اسلم بھائی آ رہے ہیں۔ بچے کب سے ضد کر رہے تھے کہ ہم تو اسٹڈیز کی وجہ سے نہیں جا سکتے لہٰذا آنی کو ہی بلا لیں۔ پھر میرے اصرار پر آج وہ اسلم بھائی کے ساتھ آ رہی ہیں۔ گو کہ اس کا گھر سے نکلنا مشکل تھا لیکن بچوں کی خاطر۔'' انہوں نے گرم گرم شامی کباب اور چکن رول پلیٹ میں نکال کر اس کے آگے رکھے اور مسکراتے ہوئے تفصیل بتائی۔ تب تک کریماں اس کے لیے بھاپ اُڑاتی چائے تیار کر چکی تھی سو وہ بھی حاضر تھی۔

''چلیں اچھا ہے، بچوں کو بھی چینج ملے گا لیکن حنا کی اسٹڈیز روٹین چیلنج نہیں ہونی چاہئے۔'' چونکہ کاظم بھائی سویڈن جاتے ہوئے حنا کی تعلیمی ذمہ داری اس کے سپرد کر گئے تھے لہٰذا وہ ایک دم فکر مند ہوا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ کیچپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''ویسے وہ مزاج کی بہت اچھی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی گھل مل جائے گی۔'' ہمیشہ کی طرح وہ اپنی مصروفیات ترک کر کے اس کے پاس آ بیٹھی تھیں۔ وہ اسے یوں ہی اہمیت دیا کرتی تھیں جبھی رافع کے دل میں بھی اپنی اکلوتی بھابی کے لیے نرم گوشہ موجود تھا جس کی بنا پر وہ اکثر گھریلو معاملات میں اُنہیں بچا جاتا۔

شبانہ اور رافع کے متعلق انہوں نے سوچ تو بہت پہلے سے رکھا تھا لیکن عملی جامہ پہنانے کا وقت اب آیا تھا لہٰذا پوری تیاری سے میدان میں اُتر رہی تھیں۔

❀---❀---❀

فائنل ایگزام سر پر آ گئے تھے۔ اس روز وہ اپنے کمرے میں بیٹھا اکاؤنٹنگ کے نوٹس فائنل کر رہا تھا لیکن مسلسل کام کر کے سر بھاری بھاری محسوس ہونے لگا لہٰذا کچن میں چائے کا کہنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتا، ٹیرس سے آنے والی ہوا کے ساتھ ہلکی پھوار جونہی اس سے ٹکرائی وہ ایک دم جھوم سا گیا اور لمحہ بھر میں خود کو ایک بار پھر فریش محسوس کرنے لگا۔ اوائل مارچ کے دن تھے۔ اس کا دل چاہا کہ دیر تک ٹیرس پر بیٹھا رہے۔ ابھی وہ اپنی بکس وغیرہ لانے کے لیے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''یہ لیں جناب! آپ کی فیورٹ کافی۔'' شبانہ ہاتھ میں کافی اور نگٹس کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

''تھینک گاڈ! اگر میں خدا سے کچھ اور مانگتا تو یقیناً اس وقت مل جاتا۔'' اس نے دن مانگے پوری ہو جانے والی دعا پر خدا کا شکر ادا کیا۔ جب سے شبانہ آئی تھی اکثر اوقات اس کے لیے خاص طور پر کچھ نہ کچھ بناتی رہتی جس پر زرینہ خاتون نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور ڈھکے چھپے انداز میں مناسب لفظوں کا سہارا لے کر رافع کو یہ باور کروا دیا تھا کہ اس کے پسِ پردہ کیا عوامل ہیں جبکہ رافع یہ سن کر محض ہنس کر رہ گیا تھا۔

''ایسا کیا ہے جو آپ خدا سے لینے کو بے چین ہیں؟'' ایک ادا سے اِٹھلا کر پوچھا گیا تھا۔

''ارے! میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔'' وہ کافی کے ساتھ ساتھ نگٹس کا بھی لطف اُٹھا رہا تھا۔

''اور یہ تم کیوں اتنی تکلیف کرتی ہو میرے لیے؟''

''بس مجھے اچھا لگتا ہے آپ کے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرنا۔'' ٹیرس کی ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر گو کہ وہ باہر دیکھ رہی تھی لیکن اس کا شرمانا رافع کے دل میں گھنٹیاں بجا گیا۔ گویا ممی کا خدشہ درست ہے۔ اس نے سوچا۔

''کیا آپ کو اچھا نہیں لگتا یہ سب؟'' اس نے رخ موڑا اور پلکیں جھکاتے ہوئے براہِ راست سوال کر ڈالا بغیر کسی لگی لپٹی کے۔

''دیکھو! کبھی کبھار چائے کافی تو ٹھیک ہے لیکن میرے کپڑے استری کرنا، بکس سیٹ کرنا، کمرہ ٹھیک کرنا..... پہلے بھی سب ممی کرتی تھیں اور پھر.....اور پھر جس کی جو ذمہ داری ہو اسی کو نبھانا اچھا لگتا ہے۔ ویسے بھی تم یہاں مہمان ہو۔''

ماں کے بار بار ٹوکنے اور خود محسوس کر لینے کے بعد اسے فوراً احساس ہوا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے لہٰذا کئی دنوں سے جو اسے سمجھانے کا سوچ رہا تھا کہ آج خود شبانہ نے اسے موقع فراہم کر دیا تو اسے نرم لفظوں کا سہارا لے کر دوٹوک بات کرتے ہی بنی۔

''رافع! میں آپ کا ہر کام اپنی ذمہ داری تصور کرتی ہوں اور میں مہمان نہیں، مکین بننا چاہتی ہوں.....

آپ کے دل کی۔''

کہہ کر وہ رُکی نہیں تھی اور حنا کی پکار کے جواب میں ''ابھی آئی'' کہتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ اور وہ اپنی جگہ کافی کا خالی کپ پکڑے حیران رہ گیا۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے اُس کے کھلے ڈلے تبصرے تو وہ آتے جاتے سنتا ہی تھا لیکن وہ اس طرح خود سب کچھ کہہ دے گی، اسے اندازہ نہیں تھا۔ کچھ دیر وہیں کھڑے رہ کر اس نے کچھ سوچا اور پھر فوراً ماں کے کمرے کی طرف چل دیا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی شروع کرنے کے لیے ماں کو گرین سگنل دینا چاہتا تھا۔

❀---❀---❀

ثریا کی مخالفت کے باوجود جب زرینہ خاتون رشتہ مانگنے سے دستبردار نہ ہوئیں اور اس معاملے میں رافع بھی صاف پہلو بچا گیا تو آخر طوعاً و کرہاً انہیں ہتھیار ڈالتے ہی بنی اور ظاہراً خوشی خوشی معاملہ آگے بڑھانے لگیں۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھائی سے رشتہ مانگنے کے چند روز بعد ہی جانے کیسے وہ سیڑھیوں سے ایسی پھسلیں کہ باوجود کوشش کے ریلنگ نہ تھام سکیں اور آخر تک لڑھکتی چلی گئیں جس سے ڈاکٹرز کے مطابق ان کے دماغ پر کوئی اندرونی چوٹ آئی تھی اور خون نہ بہنے کی وجہ سے وہ چند ہی سیکنڈز میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ جہاں آرا تو چالیسویں تک وہیں رُکیں جبکہ فاروق صاحب سوئم تک رہنے کے بعد ہر جمعرات کے ختم میں ضرور شریک ہوتے۔ البتہ عروبہ اپنے MCS کے ایگزیم کی وجہ سے نہیں آ پائی تھی۔ انہی دنوں جہاں آرا کو اندازہ ہوا کہ ثریا کس قدر تیز عورت ہے۔ حنا گو کہ ابھی بچی تھی لیکن عادات میں بالکل ماں کا پرتو تھی اور اس کی اٹھان دیکھ کر تو کوئی بھی اسے اٹھارہ سال سے کم کی سمجھنے پر تیار نہ ہوتا۔

رقیہ اور آسیہ کے علاوہ کاظم بھی ماں کی وفات پر چھٹی لے کر آن پہنچا تھا لیکن سوائے رونے اور ایک دوسرے کو تسلی دینے کے ہم انسان اس معاملے میں کر بھی کیا سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کاروبارِ زندگی پھر اپنے معمول کے مطابق شروع ہوا تو رقیہ اور آسیہ نے بھی جانے سے پہلے فاروق صاحب سے ماں کی، کی گئی درخواست کو دُہرایا اور گو کہ جہاں آرا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن زرینہ خاتون کے بعد گھر پر چونکہ تمام ہولڈ ثریا کا تھا اس لیے وہ کچھ ہچکچا رہی تھیں۔ لیکن فاروق صاحب کی ضد اور دلائل کے آگے اُنہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔

❀---❀---❀

''عروبہ! اچھی بیٹیوں کی مثال پانی کی سی ہوتی ہے کہ جس برتن میں ڈالیں اسی کی شکل اختیار کر لیں نہ کہ برف سی کہ استعمال میں لانے کے لیے اسے توڑنا پڑے۔ اللہ تیرے نصیب اچھے کرے۔ میری

دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی۔'' ماں تھیں، مسلسل اسے اپنی دعاؤں کے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

آج اس کی رخصتی تھی۔ بارات ٹرین سے آئی تھی۔ باقی تمام لوگ تو ٹرین ہی سے واپس روانہ ہو گئے تھے لیکن ان دونوں کو چونکہ بائی ایئر جانا تھا سو فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈارک گرین شلوار دوپٹے اور سی گرین ہاف سلیوز کی قمیض پر سفید دبکے کے کام والا سوٹ اس نے سب سے سادہ سمجھ کر سفر کے لیے منتخب کیا تھا کہ وہ ایئرپورٹ اور پھر جہاز میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھیں۔ لیکن پاؤں اور کہنیوں تک لگی مہندی، ایک ہاتھ میں سونے اور دوسرے میں سوٹ کے ہم رنگ چوڑیوں کا سیٹ اور اس کا خوبصورت نکھرا نکھرا، تروتازہ سا روپ خود چیخ چیخ کر اُس کے دلہناپے کی گواہی دے رہا تھا۔ روحینہ بار بار اسے چھیڑ رہی تھی تاکہ آنکھوں میں ہلکورے لیتے آنسو باہر نہ نکل آئیں۔

جہاں آرا کے ساتھ ساتھ فاروق صاحب کا دل بھی بیٹی کی جدائی کے خیال سے بیٹھا جا رہا تھا۔ بار بار اسے دیکھتے اور نم آنکھوں کو چھپانے کی کوشش بھی کرتے۔ گو کہ خود رافع گرے تھری پیس سوٹ میں اپنی مکمل وجاہت کے ساتھ کئی دلوں کی دھڑکنیں منتشر کر رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی نظریں عروبہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''بیٹا! عروبہ ابھی بچی ہے۔ اگر کبھی کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو سمجھ داری کا ثبوت دینا۔'' فاروق صاحب وقفے وقفے سے رافع کو بھی سمجھا رہے تھے۔

''ماموں! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ عروبہ کو میں آپ کی توقعات سے بڑھ کر خوش رکھوں گا۔'' رافع ان کو ہر ممکن تسلی دے کر مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اناؤنسمنٹ کے ذریعے مسافروں کو بورڈنگ کروانے کی ہدایت کی گئی اور یوں سب نے گلے لگا کر نم آنکھوں سے دعاؤں کے بے شمار خزینوں سمیت انہیں نئی زندگی کے اس پہلے سفر پر الوداع کہا۔

❀---❀---❀

ولیمہ دو دن بعد شہر کے ایک معروف ہوٹل میں منعقد کیا گیا تھا جس میں دل کھول کر مہمانوں کو مدعو کرنے کے علاوہ انتظامات بھی بہت منظم اور احسن طریقے سے کیے گئے تھے۔ ولیمہ کا وقت رات دس بجے کا مقرر کیا گیا تھا تاکہ کراچی والے مہمان بھی آرام اور سہولت سے آسکیں۔ نئی نویلی دُلہنوں کے حسبِ روایت وہ دوپہر ساڑھے بارہ بجے نہا دھو کر ابھی فریش ہوئی ہی تھی کہ ثریا بھابی ہاتھوں میں کپڑے لیے اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''عروبہ! یہ ہے تمہارے ولیمے کا ڈریس۔'' انہوں نے ہینگر میں لٹکی انتہائی گھیر والی راجستھانی فراک بیڈ پر پھیلائی جس سے اس کے گھیر اور دامن پر کیا گیا نفیس سا کام مزید نمایاں ہو گیا۔ رافع ابھی کچھ دیر

پہلے ہی حنا کے بلانے پر باہر گیا تھا۔

''بھابی! ہے تو اچھا لیکن.....'' کچھ سوچتے ہوئے اس نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

''ارے لیکن کیا؟''

''یہی ڈریس شادی میں حنا نے بھی تو پہن رکھا تھا نا؟'' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کر اس نے فراک اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ بڑے سے خوب صورت دوپٹے کو نزدیک سے دیکھا۔ شادی کے فنکشن میں حنا اس کے اتنا نزدیک رہی تھی کہ اسے یہ ڈریس ازبر ہو گیا تھا۔

''ارے تو حنا سے تمہارا کیا مقابلہ؟ وہ اس کے کپڑے تھے، یہ تمہارے.....اور ویسے بھی اس گھر میں پہلے حنا کی چیز آتی ہے، پھر کسی اور کی۔'' استہزائیہ انداز میں بات مکمل کر کے وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''لو دیکھو اتنا پھیلاوا پڑا ہے اور میں یہاں بیٹھ گئی۔ دراصل حنا کی میچنگ چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ رافع بازار سے وہی لینے گیا ہے۔ آتا ہے تو تم دونوں کا ناشتہ بھجوائے دیتی ہوں۔'' جاتے جاتے انہوں نے تفصیل بتانا ضروری سمجھا تھا۔ ادھر عروبہ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ تو عید کا جوڑا کسی سے ملتا جلتا نہیں بنواتی تھی کُجا کہ آج کے دن۔ وہ رافع سے کچھ نہ کہنے کا ارادہ کر کے اُٹھی اور بے دلی سے کپڑے اُٹھا کر الماری میں ہینگ کر دیئے۔

''عروبہ ڈیئر! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟'' رافع نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دھیمی آواز میں استفسار کیا اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ ابھی تک امی پاپا کیوں نہیں آئے، چونک گئی۔

''تم نے ولیمے کا ڈریس پہننے سے انکار کر دیا ہے۔'' اس کے بولنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بول پڑا۔ ''تمہیں معلوم ہے یہ ڈریس خود میں نے اپنی پسند سے خریدا تھا اور تصور میں کتنی ہی مرتبہ تم کو یہ ڈریس پہنے دیکھ چکا ہوں اور.....اور تم نے محض اس لیے اسے حقارت سے ریجیکٹ کر دیا کہ حنا بھی ایسا ڈریس پہن چکی ہے۔'' وہ شاید بہت ہرٹ ہوا تھا اور جانے اس تک یہ بات کس انداز میں پہنچائی گئی تھی۔ عروبہ کے تو گمان میں بھی یہ سب نہ تھا۔ وہ ایک دم بوکھلا گئی اور کہتی کیا؟ بھل بھل آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تم.....تم رو کیوں رہی ہو؟'' وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ''دیکھو میرے ہوتے ہوئے تمہیں رونا جچتا نہیں ہے۔ میں ہوں نا تمہاری ہر پریشانی سمیٹنے کے لیے۔'' رخساروں پر ڈھلک آنے والے موتی چنتے ہوئے وہ اسے تحفظ کا یقین دلا رہا تھا۔

''چلو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چل کر اپنی پسند کا ڈریس خرید لو.....اب خوش؟'' دو دن کی دُلہن کے آنسو دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

''نہیں بس ٹھیک ہے۔ میں یہی ڈریس پہنوں گی۔'' روتے روتے مسکراتے ہوئے اس نے محض رافع کا دل رکھنے کو کہا۔ دودھیا رنگت رونے سے سرخ ہو چکی تھی روئی روئی آنکھوں سے وہ مسکرائی تو رافع کو

ایک دم ہی اس پر بے پناہ پیار آیا جس کا اظہار کرنے میں اس نے قطعی دیر نہیں لگائی۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو بری دیکھنے پر اسے اندازہ ہوا کہ بری کی کسی چیز میں بھی انفرادیت نہیں ہے۔ شاید ہر چیز ہی مشترکہ خریدی گئی تھی۔ ہر وہ چیز جو اس کی ابھی نئی رکھی تھی، حنا یا ثریا بھابی استعمال کر چکی تھیں لہٰذا اس کا دل بھی نہیں چاہتا تھا کسی چیز کی طرف دیکھنے کو کہ یونیفارم کی طرح ایک جیسے کپڑے، جوتے استعمال کرنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ اور پھر اس کے لباس کو تو سب بڑے شوق سے دیکھا کرتے کہ اس میں ہمیشہ ہی انفرادیت ہوا کرتی تھی۔ اسے یوں لگتا جیسے ہر چیز اسے سیکنڈ ہینڈ ملی ہو۔ البتہ کبھی رافع کی فرمائش ہوتی تو وہ صرف اس کا دل رکھنے کو وہ ڈریس پہنتی کہ اس کی مرضی اسے ہر حال میں مقدم تھی ورنہ وہ محض اس کی وارڈ روب ہی کی زینت بن کر رہ گئے تھے۔

ثریا بھابی ہر موقع پر اس کا اور حنا کا مقابلہ کرنے لگتیں تو اسے رہ رہ کے اپنا میکا یاد آتا جہاں ہمیشہ پہلی پسند اس کی ہوا کرتی تھی۔ رافع سے کہتی تو وہ اسے معمولی سی بات گردان کر ٹال جاتا اور پھر اتنا اندازہ تو اسے ہو چلا تھا کہ بے شک نیچر کا وہ بہت اچھا تھا لیکن لاشعوری طور پر وہ ثریا بھابی کی کمانڈ میں تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ کانوں کا بھی کچا تھا۔ جو بات ثریا بھابی جس انداز میں اس تک پہنچاتیں وہ من وعن یقین کر لیتا اور دل میں رکھ کر صفائی بھی طلب نہ کرتا اور یہی بات عروبہ کے لیے سخت تکلیف کا باعث بنتی۔

''رافع! اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو کل ڈاکٹر کے پاس چلیں۔'' کچھ دن سے اس کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ نہ کوئی کام کرنے کو دل مانتا اور نہ ہی کھانے پینے کو۔ لہٰذا اس نے چیک اپ کروانے کا سوچا۔

''کیوں بھئی، خیر تو ہے؟'' سمجھ تو وہ کچھ گیا تھا لیکن شرارت کے موڈ میں تھا۔ نزدیک ہوتے ہوئے اس نے دائیں آنکھ دبائی اور مسکراتے ہوئے بولا جس سے وہ ایک دم جھینپ سی گئی۔ اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا لیکن اس کی مسکراہٹ میں جو کچھ پوشیدہ تھا وہ بن کہے سارا راز آشکار کر گیا تو رافع نے بے اختیار اسے دونوں بازوؤں میں پکڑ کر گھما ڈالا۔

''اوہ رئیلی عروبہ!.....اللہ تیرا شکر ہے۔'' وہ واقعی بے حد خوش ہوا تھا۔ ''اچھا سنو! کل شام ٹھیک پانچ بجے تیار رہنا۔ آفس سے واپسی پر یہاں کی مشہور لیڈی ڈاکٹر نیلم کے پاس چلیں گے۔ اور ہاں ذرا اچھی طرح تیار ہونا۔'' وہ دیوانہ وار اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر لجاتی رہی۔

❀---❀---❀

''ارے رافع! کتنی لمبی عمر ہے تمہاری۔ اچھا ہوا جو آج جلدی آ گئے۔'' اپنی دُھن میں مست وہ حسبِ عادت کی رِنگ جھلاتا ہوا بڑی بے تابی سے سیڑھیاں پھلانگ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ ڈرائنگ روم میں ثریا بھابی، حنا کے ساتھ کھڑی ملیں۔

''کیوں خیریت؟'' وہ ایک دم چونکا تھا۔

''چندا! کل حنا کا بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے۔ اسے تیاری کے لیے ذرا میڈم رعنا کے گھر تو چھوڑ آ۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح خوشامدی لہجہ اپناتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''لیکن بھابی! مجھے تو عروبہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔'' اس نے ایک اُکتائی ہوئی نظر ان دونوں پر ڈالی۔

حنا براؤن ٹراؤزر پر واٹ شرٹ پہنے باب کٹ بالوں کی پونی بنائے تیار کھڑی تھی۔ ایک دو بار اس نے کاظم بھائی کے سامنے حنا کے اس طرح ڈریس پہننے پر ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن انہوں نے ثریا بھابی کی دی ہوئی زبان سے آج کل کا فیشن قرار دیتے ہوئے کہا تھا۔

''یار رافع! یہ خالص عورتوں کا شعبہ ہے کہ کیا فیشن میں ہے؟ کیا پہننا چاہئے اور کیا نہیں۔ تم مرد ہو، مردوں والی باتیں سوچو۔ یہ فکر چھوڑ دو۔''

اس کے بعد سے اس نے کبھی ٹوکا تو نہ تھا لیکن اپنی رائے بہرحال نہیں بدلی تھی اور وہ اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ عروبہ کو بھی جسم کو نمایاں کر دینے والے لباس ناپسند تھے۔

''دراصل رافع! سعد کا تو آج میچ ہے اور میں تو ڈرائیونگ میں کوری ہوں ورنہ خود ہی چلی جاتی۔ اور پھر پڑھائی کا مسئلہ ہے نا۔'' جانتی تھیں کہ حنا کی اسٹڈیز رافع کا ویک پوائنٹ ہے لہٰذا یہی تیر استعمال کرنے کا سوچا جو ٹھیک نشانے پر بھی لگا۔

''لیکن عروبہ.....!'' اس نے ایک نظر اپنے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔

''لو تو میں جو ہوں رافع! میں اور عروبہ رکشے سے چلے جائیں گے۔'' اپنی اندرونی کیفیات دباتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ چونکہ دونوں بیڈ رومز اوپر ہی تھے سو رات کو جب سے انہوں نے رافع کو خوشی سے بے قابو ہو کر 'ہا ہو' کرتے سنا تھا، بے چین تھیں۔ اس پر اب عروبہ کو مسکراتے دیکھا تو فوراً سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ شبانہ ابھی تک ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی تھی سو عروبہ کی خوشگوار و مطمئن زندگی دیکھ کر ان کا جلاپا روز بروز پروان چڑھتا رہا۔

''چلو!'' رافع نے کندھے اُچکائے اور بے دلی سے انہی قدموں لوٹ گیا جبھی ثریا بھابی کے ہونٹوں پر کھیلتی معنی خیز مسکراہٹ نہیں دیکھ پایا تھا۔

''عروبہ!'' دروازہ ناک کر کے وہ اندر ہی چلی آئی تھیں۔ بریزے کا پنک چکن کا سوٹ پہنے وہ پاؤں میں پہنی پلین حیدرآبادی چپل کے اسٹرپس بند کر رہی تھیں۔ بالوں کو صرف ایک پن لگا کر کھلا چھوڑ دیا تھا جو جوتے پر جھکی عروبہ کے چہرے پر چلمن کا کام دے رہے تھے۔

''آپ؟'' اس کا حیران ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ ابھی ابھی وہ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے رافع کی

گاڑی کو اندر آتا دیکھ چکی تھی۔

''ہاں بھئی۔ وہ دراصل رافع نے تو کل سے حنا سے پرامس کر رکھا تھا کسی دوست کے گھر پہنچانے کا۔ آج اسی لیے جلدی بھی آ گیا تھا۔ لیکن بے چارہ گاڑی تک جا کر پھر پلٹا کہ مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ آپ عروبہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جایئے گا۔'' انہوں نے اپنی مرضی کے الفاظ منتخب کرتے ہوئے رافع کو پیغام پہنچایا تھا اور اب حیران و پریشان کھڑی عروبہ کو دیکھ کر ان کے اندر ڈھیروں اطمینان اُتر آیا تھا۔

کیا اس اتنی بڑی خوشی کی رافع کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں؟ اس نے دکھ سے سوچا لیکن کچھ کہا نہیں اور پرس اٹھا کر مرے مرے قدموں سے ان کے پیچھے ہو لی۔

❀---❀---❀

''میری جان! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ لیکن بیٹا! میں تمہاری طرف سے بہت فکرمند ہوں۔'' عروبہ نے فون کر کے ماں کو اطلاع دی تو وہ اتنی خوش ہوئیں کہ کل کا ملال اس کے سامنے ہیچ تھا۔

''امی! پھر وہی بات۔ بھلا میری طرف سے کیا فکر؟ بھلی چنگی موٹی تگڑی تو ہوں۔'' وہ اُنہیں بہلا رہی تھی جبکہ جانتی تھی کہ اب وہ ہر پل ان کی سوچ میں رہے گی۔

''تم ویسے ہی کھانے کی چور ہو اور اس حالت میں تو.....'' آخر ماں تھیں اور وہ ان کی بے حد نازوں میں پلی لاڈلی بیٹی۔ کیسے چین آتا؟

''اوہو بھئی، میرا تو الگ ہی حساب ہے امی! آج کل تو ہر وقت کھانے پینے کو جی چاہنے لگا ہے۔ یوں سمجھیں منہ چلتا ہی رہتا ہے۔ فکر نہ فاقہ، بس عیش کر رہا ہے آپ کا، کاکا۔''

یہ الگ بات تھی کہ واقعی اس کا کچھ کھانے کو من نہیں مانتا تھا اور نہ ہی کوئی زبردستی کہہ کہہ کر یا اس کی فرمائش پر بنا کر کھلاتے والا تھا۔ اور اگر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کھا لیتی تو اُلٹیاں کر کر کے نڈھال ہو جاتی۔ گو کہ رافع اس کا بے حد خیال رکھتا تھا لیکن وہ آفس چلا جاتا تھا اور پھر بھابی کا یہ کہنا کہ ''بچے تو میں نے بھی پیدا کیے ہیں لیکن نہ کبھی نخرے کیے اور نہ ہی کاموں سے آنکھ چرائی۔'' لیکن وہ کیا کرتی؟ اس سے تو اپنا آپ سنبھالنا محال تھا۔ آج کل وہ رافع کی طرف سے بے حد توجہ کی طالب تھی لیکن گھر پر ہوتا تو بھی وہ اس کے گرد منڈلاتی رہتیں اور اگر کبھی عروبہ کو باہر جانے کو کہتا تو حنا تیار ہو کر پہلے آ موجود ہوتی جس سے وہ بے حد چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن بول اُٹھی۔

''رافع! یہ..... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' ابھی ابھی وہ حنا اور سعدیہ کو آئس کریم کھلا کر لایا تھا۔

''کیوں، اب کیا ہوا ہے؟'' جوتے اتارتے ہوئے اس نے بے زاری سے سوال کے جواب میں سوال

کیا کیونکہ وہ ابھی ابھی ثریا بھابی کی یہ شکایت کہ عروبہ نے بچوں کے ساتھ محاذ بنایا ہوا ہے، سن کر آ رہا تھا۔

''میں آپ کی توجہ چاہتی ہوں اور آپ ہر وقت بچوں کے ساتھ چپکے رہتے ہیں۔ کیا ان چند گھنٹوں کے علاوہ میرے لیے کوئی ٹائم نہیں ہے آپ کے پاس؟ اور.....اور رشتوں میں توازن رکھیے ورنہ میں تو بالکل بکھر جاؤں گی اکیلی۔'' وہ پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

''تو کیوں ان سب کو اپنا حریف تصور کرتی ہو؟ گھل مل کر رہو ان کے ساتھ۔ اگر میں کچھ کہتا نہیں تو کیا جانتا بھی نہیں کہ تم نے کبھی انہیں اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ارے تم تو ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا پسند نہیں کرتیں۔''

طیش میں آ کر ہاتھ میں پکڑا جوتا اس نے دیوار پر دے مارا۔ عروبہ کو یاد آیا کہ پچھلے دنوں چونکہ اس کا کھانے کو جی نہیں مانتا تھا لہٰذا وہ اکثر کھانا نکال کر اپنے کمرے ہی میں لے آتی تھی کہ جب جی چاہا، کھا لیا.....نخرے اٹھانے کے لیے ماں یا بہن تو پاس تھیں نہیں کہ ایک پکار پر گرما گرم کھانا حاضر کر دیا جاتا اور پھر بار بار سیڑھیاں اُترنا چڑھنا تو خود بھابی کے سامنے اسے ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔

''یہ تم جیسی عورتیں ہی آتے ہی بھائی بھائی کو الگ کروا دیتی ہیں۔ لیکن تمہارے چاہنے کے باوجود یہ نہیں ہوگا، سمجھیں تم۔ البتہ تم پر کوئی پابندی نہیں۔'' اس کے سامنے کتنے غلط انداز سے سب کچھ پیش کیا جا رہا تھا کاش وہ جان سکتا۔ کیا یہ وہی رافع ہے جس کے دھیمے پن کو اس کی سب سے بڑی خوبی گردانا جاتا تھا۔ جو گھر والوں کے سامنے قہقہے بکھیرتے نہ تھکتا اور کسی کو روتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آج اس کی اپنی زندگی کی ساتھی آنسوؤں سے بھیگا چہرہ لے کر کھڑی تھی اور وہ کتنا لاتعلق بن رہا تھا۔

''عروبہ جان! میرے ہوتے ہوئے تمہیں رونے کی کیا ضرورت ہے؟ میں ہوں نا۔ بس میرے سامنے ان قیمتی موتیوں کو یوں ضائع نہ کرو۔'' شروع دنوں کی ایک خوب صورت یاد نے ذہن و دل پر دستک دی تو اس کے آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی۔ اب تو وہ رُلا بھی خود رہا تھا، خاموش کروانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

''رافع! کھانے کو تو میرا.....'' اس نے بولنا چاہا تھا لیکن آنسوؤ کا ایک گولا سا اس کے حلق میں پھنس گیا اور عین وقت پر آواز نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ کیا کرتی؟ اسے تو کسی نے کبھی اونچی آواز میں سرزنش نہیں کی تھی کُجا کہ یہ گرجتا لہجہ.....

''یہ جو تم ہر وقت چہرے پر بے زاری سجائے رکھتی ہو نا صرف کام نہ کرنے اور بھابی کی وجہ سے ہے۔ حنا اور سعد کی دفعہ بھابی نے تو ہمیں کبھی احساس ہونے ہی نہیں دیا تھا اور تم.....تمہیں اتنا احساس نہیں کہ پہلے کھانے کا پوچھ لوں۔ آتے ہی جاہل عورتوں کی طرح شکایت نامہ کھول کر بیٹھ گئیں۔''

وہ کہنا چاہتی تھی کہ ثریا بھابی کی دفعہ آپ کی امی زندہ تھیں جو خوشی خوشی انہیں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے

دیتی تھیں اور ایک جز وقتی ملازمہ رکھ لی جاتی۔ لیکن اب تو ثریا بھابی نے ملازمہ رکھنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ہر کام ان کے ساتھ کرواتی بلکہ سارا خود ہی کرتی کہ ان پر تو ''Look busy, do nothing'' والی مثال صادق آتی تھی۔ نتیجتاً رافع کے آنے تک وہ ادھ موئی ہو کر بیڈ پر جا گرتی جس سے یقیناً یہ تاثر ملتا کہ وہ جانے کب سے لیٹی ہوئی ہے اور باقی کسر ثریا بھابی کی رپورٹ سے پوری ہو جاتی اور رافع کا دل مزید خراب ہو جاتا۔

وہ کہنا تو مزید بہت کچھ چاہتی تھی لیکن آنسو تھے کہ آج ہی بہہ جانا چاہتے تھے سو وہیں صوفے کے کونے پر ٹکی سر جھکائے ناکردہ غلطیوں کے الزامات سنتی رہی۔ وہ بدستور رو رہی تھی کہ دروازہ ناک کر کے ثریا بھابی اندر داخل ہوئیں۔ کمرے کی سچویشن ان کی توقع کے عین مطابق تھی۔

''اُٹھو رافع میں نے ابھی ابھی تمہارے لیے گرم روٹی بنائی ہے۔ ساتھ تمہارے فیورٹ کریلے گوشت اور لوکی کا حلوا۔'' وہ سیدھی رافع کی طرف بڑھیں جو پاؤں فرش پر لٹکائے بیڈ پر نیم دراز تھا۔

''تھینک یو بھابی! لیکن مجھے بھوک نہیں ہے۔'' آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''زیادہ نخرے نہیں۔ جانتی ہوں تمہیں بھوک لگ رہی ہے اور توے سے اُترتی گرم روٹی تمہاری کمزوری بھی ہے۔ جلدی چلو۔ میں چولہا ہلکا کر کے آئی ہوں۔'' وہ بدستور وہیں کھڑی تھیں یعنی لے کر ہی ٹلیں گی۔

''اور چلو تم بھی آنسو پونچھو۔'' عروبہ کو مخاطب کر کے وہ دوبارہ رافع کی طرف پلٹیں۔ ''رافع! تم بچوں کی وجہ سے اپنا سکون تباہ نہ کرو۔ اگر تم کہو تو ہم لوگ.....'' وہ شاید آج آخری حد دیکھنا چاہتی تھیں کہ اتنے عرصے کی برین واشنگ اور لیکچرز میں کتنی کسر باقی ہے۔

''بس بھابی! اگر یہ نہیں رہنا چاہتی سب کے ساتھ تو اس کی یہاں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ آپ سب لوگ کہیں نہیں جا رہے۔ سمجھیں آپ!'' کہہ کر وہ رُکا نہیں اور باہر نکل گیا۔ ثریا بھابی نے ایک نظر عروبہ پر ڈالتے ہوئے اس کی تقلید کی۔

میں یہاں کیسے گزارہ کروں؟ جبکہ میری دو کوڑی کی عزت نہیں ہے۔ ثریا بھابی کے سامنے کی گئی تضحیک نے اس کی روح تک کو چھلنی کر دیا تھا اور وہ واقعی واپس جانا چاہتی تھی لیکن کیا کرتی؟ میرا خیال ہے مجھے امی کو سب کچھ بتا دینا چاہئے۔ بوجھل دل کا غبار نکالنے کے لیے ماں سے بڑھ کر غمگسار کوئی نظر نہ آیا لیکن میں نے تو انہیں آج تک سب اچھا ہے کی رپورٹ دی ہے۔ اب اگر ایک دم وہ یہ سب سنیں گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔ اسے یاد آیا ایک دفعہ جب روحینہ کسی بات پر ناراض ہو کر میکے آ گئی تھی تو امی نے کتنے دنوں تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ پاپا کا الگ بلڈ پریشر بڑھا رہتا اور خود اس نے کتنے وظائف کیے تھے۔ اور جب وہ اسے لینے آئے تو گویا ان سب کے بے جان بتوں میں جان سی پڑ گئی تھی۔

''بیٹا! تمہارے ہر دکھ درد کا مداوا کرنے کو ہم موجود ہیں لیکن اچھی بیٹیوں کی طرح کوشش کرنا، گزارہ ہوتا رہے۔'' ایئرپورٹ پر کی گئی پاپا کی سرگوشی کانوں میں اُبھری تو اپنا ارادہ ملتوی کر کے وہ دوبارہ بے اختیار رو پڑی۔

❀---❀---❀

صبح اس کی آنکھ شدید بھوک کے احساس سے کھلی۔ احتجاجاً رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا اور اس نے تو اب بھی کچھ نہ کھانے کی ٹھانی تھی کہ اسے ڈاکٹر نیلم کی دی گئی ہدایت یاد آئی۔

''مسز رافع! اچھی غذا کھانا نہ صرف آپ کے بچے بلکہ خود آپ کے لیے بھی بے حد اہم ہے۔ کیونکہ نومولود تو آپ کی ہڈیوں کے گودے سے بھی پیٹ بھر لے گا۔ مسئلہ ہوگا تو آپ کے لیے۔'' ڈاکٹر نیلم نے ہنستے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔ اسی لمحے ننھے سے وجود نے بھی حرکت کی اور شاید اس بات کی تائید کر کے اسے کھانے کے لیے آمادہ کیا تھا لہٰذا وہ اُٹھی تو ضرور لیکن ٹکراتے سر کے ساتھ فوراً بیٹھتی چلی گئی۔

''عروبہ! کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' آج اتوار تھا اور رافع گھر پر ہی تھا۔ پتہ نہیں کب سے وہ بھی جاگ رہا تھا کہ اس کے لڑکھڑاتے ہی فوراً اُٹھ بیٹھا۔ وہ ایک دم بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ عروبہ کے لیے اس کے دل میں بے پناہ محبت تھی لیکن کیا کرتا، ثریا بھابی کے جذباتی مکالموں کے آگے اسے ہمیشہ ہی وہ قصوروار لگا کرتی لیکن بعد میں وہ ہمیشہ خود کو کوستا رہتا۔ جلدی سے تکیہ سیٹ کر کے دونوں کندھوں سے تھام کر آہستگی سے اسے بیڈ پر بٹھانے ہی والا تھا کہ اس نے ایک جھٹکے سے کندھے چھڑوا لیے۔

''اتنا زہر..... اتنی نفرت ہوگی آپ کے دل میں میرے لیے۔ یہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی دو آنسو پھر سے اس کے رخسار تر کرتے چلے گئے۔

''عروبہ! تم کیوں ہر بات میں ان سے موازنہ اور مقابلہ کرتی ہو؟ یہی تمہاری غلطی ہے۔ گو کہ میں گھر پر نہیں ہوتا لیکن سب جانتا ہوں۔ دیکھو تم ان سے گھلنے ملنے کی کوشش کیا کرو۔ کیوں موقع دیتی ہو ثریا بھابی کو شکایت کا۔ زندگی جبھی اچھی گزرے گی نا جب مل کر رہیں اور پھر ڈاکٹر نے بھی تم کو ہر وقت لیٹے رہنے سے منع کیا ہے تو پھر بھابی کے ساتھ کچھ ہیلپ کروا دیا کرو۔ وہ بے چاری تھک جاتی ہیں۔'' آج اس کا دھیما لہجہ اسے مزید زچ کر گیا۔

''ہر وقت تو کام میں لگی رہتی ہوں رافع! اور پھر بچے تو مجھ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے، کُجا گھلنا ملنا۔'' آخر وہ بول اُٹھی۔ ''ابھی پرسوں ہی حنا کی کچھ فرینڈز کے آنے پر میں لاؤنج سے گزری تو وہ ان کے سامنے ہی کہنے لگی۔ ''آنٹی! کم از کم اس طرح کی فزیک میں تو اپنے کمرے میں رہا کریں۔ ہمیں شرم آتی ہے۔ اور پھر وہ سب ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

''پھر وہی مقابلے بازی۔ کہا نا، بچی ہے وہ۔ اسے ابھی کہاں سمجھ ہے ان باتوں کی؟'' اس کی بات کاٹ کر اس نے پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ پکڑ لی تھی۔ ''اچھا چلو چھوڑو، آج باہر سے ناشتہ کرتے ہیں۔'' وہ اسی طرح ہمیشہ ہر بات کر کے دو پل میں نارمل ہو جاتا۔

''میرا موڈ نہیں ہے۔'' کہہ کر عروبہ نے تکیے میں منہ دے لیا۔

''ہونہہ! یوں کہو سب کے ساتھ جانے کا موڈ نہیں ہے۔'' وہ اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

❁---❁---❁

رافع کا روّیہ ہنوز وہی تھا۔ بھابی کی شکایتوں پر چراغ پا ہوتا اور پھر بعد میں یوں ہوتا جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہیں۔ اور پھر اب تو عروبہ نے بھی سمجھوتہ کر لیا کہ کبھی تو اس کا دل صاف ہوگا۔ اور اسے یقین تھا کہ سدا وقت ایک سا نہیں رہا کرتا۔ ثریا بھابی کی ہر بات کو ایک فرمان سمجھ کر تہہ دل سے سچ مان لیا جاتا اور پھر اس کی کوئی دلیل، کوئی وضاحت کام نہ آتی۔

حنا نہ صرف اس کے معاملے میں ماں کے شانہ بشانہ موجود رہتی بلکہ اکثر اوقات اپنی دوستوں اور گھر آئے دوسرے مہمانوں کے سامنے ماں کو بھی بے نقط سنا ڈالتی اور وہ محض مسکرا کر ٹال دیتیں کہ ابھی تو بچی ہے، ناسمجھ ہے۔

ہر وقت کان سے چپکے رہنے والے موبائل پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں تھا۔ اسی طرح سعد گو کہ اپنی عمر کے مطابق ابھی برگر بوائے تھا لیکن رافع کے کہنے کے مطابق کھیل، پڑھائی، فرینڈز، نیٹ سب کو اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق وقت دیتا کہ اسے ماں کی اتنی شہ حاصل نہ تھی۔ رافع ہی نے اس کا شیڈول سیٹ کر رکھا تھا اور پھر انہی بے رونق دنوں میں عروبہ نے ایک خوب صورت سے گل گوتھنے بیٹے کو جنم دیا تو اسے یوں لگا جانے کب سے ٹنڈ منڈ درختوں پر بہار نے ایک دم ہی ڈھیروں پھول کھلا دیئے ہوں۔

سب بے انتہا خوش تھے۔ امی کو بھی فون کر دیا گیا تھا اور وہ اس کے پاس ہی موجود تھیں۔ پاپا البتہ اپنی طبیعت کی وجہ سے نہیں آ پائے تھے۔ رحینہ اور اس کے شوہر نے فون پر مبارک باد دی تھی کہ ننھی صبوحی کے امتحانات کی وجہ سے وہ بھی نہیں آ سکی تھی۔ نندیں الگ نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ کاظم بھائی کے فون پر فون آ رہے تھے۔ اس لمحے اسے اپنا آپ ایک دم ہی کچھ معتبر اور بڑا بڑا سا لگنے لگا تھا۔ زندگی اور زندہ رہنے کا جو خوب صورت مصرف اللہ تعالیٰ نے اسے بخشا تھا، اس پر وہ خدا کے حضور شکر کرتے نہ تھکتی۔ دو دن کے عالیان کی اتنی تصویریں کھینچی گئی تھیں گویا وہ کوئی سیاسی رہنما یا فلمسٹار ہو۔ ہر طرف سے جلد از جلد تصویریں بھجوانے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

جہاں آرا نے چھوچھک میں جہاں اور بہت سی خوب صورت چیزیں بنوائی تھیں، وہیں ایک پیارا سا

تاج بھی تھا۔ ننھے عالیان کی انگوٹھی اور چین اس کے علاوہ تھیں۔ جب اسے ہر طرح سے تیار کر کے سب نے باری باری گود میں لے کر تصویریں بنوائیں تو وہ بلاشبہ کوئی چھوٹا سا شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ رافع کی تو خوشی دیدنی تھی۔ ہینڈی کیم سے اس کی مووی بناتے نہیں تھک رہا تھا کہ کاظم بھائی اور اس کی پھوپھیوں کی فرمائش تھی۔

فاروق صاحب چونکے اکیلے تھے لہٰذا جہاں آرا کو اب واپس جانا تھا۔ وہ چلی گئیں تو زندگی کی گویا رُکی ہوئی گاڑی پھر سے چل پڑی۔

سارا دن بے شک عالیان روتا رہے لیکن عین رافع کے آنے کے وقت بھابی اسے اٹھا کر لے جاتیں۔ البتہ ویسے انہیں اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ اور ہوتا بھی کیوں؟ اچھے رشتے کے انتظار میں شبانہ اب تک گھر بیٹھی تھی۔ اب تو بچوں والے یا دوسری شادی کے خواہش مند حضرات پر غور کرنے کے بارے میں سوچا جا رہا تھا اور وہی عذاب عروبہ پر اُترتا کہ اکثر اوقات وہ اسے براہِ راست بھی باتیں سنانے لگی تھیں لیکن وہ جواباً خاموش ہی رہتی کہ رافع تک وہی بات چونکہ پہلے کسی اور انداز سے پہنچ چکی ہوتی تو وہ ہمیشہ اسی کو قصوروار ٹھہراتا۔ جانے کب رافع کی آنکھوں سے یہ پٹی اُترے گی اور وہ سچ جان پائیں گے۔ وہ اکثر سوچا کرتی۔

وہ تو بہت ہنسنے ہنسانے والی زندہ دل لڑکی تھی۔ خاموش اور منہ بنا کر رہنا تو اس کی فطرت کے قطعی خلاف تھا لیکن یہاں آ کر اسے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، انہوں نے اس کے مزاج کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا تھا۔ باقی سب تو ایک طرف، وہ رافع ہی سے اپنی فیلنگز شیئر نہیں کر سکتی تھی کہ اگلی ہی لڑائی میں وہ اس کی ہی کہی ہوئی بات اتنے غلط انداز سے اس کے منہ پر مارتا کہ وہ حیران پریشان جملے کے سیاق وسباق پر غور کرتی رہ جاتی۔ اور پھر ہر بات یا تو وہ خود ثریا بھابی سے ڈسکس کرتا ورنہ وہ اپنے مخصوص انداز سے اُگلوا لیتیں۔ کتنی ہی مرتبہ ایسے مواقع آئے کہ اس نے واپس چلے جانا بہتر سمجھا لیکن پھر امی پاپا کی پریشانی کے خیال سے رہ جاتی اور پھر قربانی صرف والدین ہی تو اولاد کے لیے نہیں دیتے۔ اولاد اور خصوصاً بیٹیاں بھی تو والدین کے لیے دیا کرتی ہیں۔ اور اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر پریشانی کو بھول جانے کے لیے ایک پیارا سا چاند اس کے آنگن میں اُتارا تھا تو اس نے حقیقتاً سب کچھ بھول بھال کر خود کو اس میں مگن کر لیا۔ رافع سے اپنا تعلق اوپری اوپری سا لگتا کہ وہ اس سے کچھ شیئر نہیں کر سکتی تھی اور وہ اس لیے کہ وہ ہر بات کو بھابی کی عینک سے دیکھتا۔ وہ اسے بے حد چاہتا تھا۔ اس بات کا اعتراف اسے یقیناً تھا لیکن بھابی اور بچوں کے متعلق اس کا رویہ عروبہ کے لیے بے حد دُکھ کا باعث تھا۔

عالیان اپنی معصوم حرکتوں، مسکراہٹوں سے رافع کی بھرپور محبت اور مکمل توجہ سمیٹ رہا تھا۔ آفس سے آتے ہی رافع جو اسے گود میں لیتا تو صرف نیپی چینج کرنے کے لیے ہی دیتا۔ اسے یوں بھی بچوں سے بے حد پیار تھا اسی لیے حنا چونکہ ان سب بڑوں میں پہلا بچہ تھی لہٰذا اس نے بھی خود لاڈ اُٹھوائے تھے بلکہ کبھی کبھار تو اُسے اٹھانے پر بھی باریاں مقرر کی جاتیں۔ کافی دنوں سے عروبہ اور رافع میں کوئی جھڑپ بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ اکثر اسے عورتوں کی طرح باتیں سناتا رہتا یعنی جو بھابی سے سنتا، ہلکے پھلکے انداز میں سرزنش کرنا نہی بھولتا کہ عالیان کا بہانہ کر کے تم کام نہیں کرتی ہو۔ اسے لے کر بیٹھی رہتی ہو وغیرہ۔

حالانکہ وہ علی الصبح اُٹھ جاتی۔ نماز اور قرآن پڑھتی اور پھر جلدی جلدی ناشتے کی تیاری میں لگ جاتی جو کہ اُسے سونپا گیا تھا۔ لیکن سُوئے اتفاق کہ رافع کے جاگنے تک عالیان کی بیداری کا ٹائم بھی ہو جاتا۔ اور جب رافع جاگتا تو وہ بیٹھی عالیان کو فیڈ کروا رہی ہوتی اور بھابی کچن میں بنے بنائے ناشتے پر اپنے نام کی مُہر لگا رہی ہوتیں۔ دوپہر کا کھانا وہ خود بناتی تھیں کہ اگر کھانے میں ذرا سی اونچ نیچ ہو جاتی تو حنا اور سعد دونوں ماں پر پل پڑتے۔ جبکہ وہ عالیان کے روتے ہنستے باقی کے سارے کام نمٹاتی رہتی۔ جبکہ کھانے کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر برتن جوں کے توں چھوڑ کر اپنے کمرے کی راہ لیتیں اور وہ کبھی فوراً اور کبھی عالیان کو سُلا کر برتن وغیرہ دھو کر سمیٹ دیتی۔ شوہر کی ذمہ داری سے چونکہ آزاد تھیں لہٰذا رافع کے سامنے اس کی خوشامد کے علاوہ اپنی نادیدہ بیماریوں کا رونا روتی رہتیں ورنہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر یا تو پروگرامز سے لطف اندوز ہوا جاتا یا پھر اِدھر اُدھر آنا جانا لگا رہتا۔ حنا کی اپنی الگ مصروفیات تھیں۔ اکثر اسے ٹیسٹ کی تیاری کے لیے دوستوں کی طرف جانا پڑتا اور وہ بخوشی اجازت دے دیتیں۔ ایک دو مرتبہ اس نے رافع کو اس تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا بھی لیکن بے سود!

شومیِ قسمت کہ ایک دن حسبِ معمول کھانے کے بعد حنا اور سعد تو اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اس دن برتن بھی معمول سے زیادہ تھے۔ عالیان چونکہ دانت نکال رہا تھا لہٰذا مسلسل رو رو کر اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اسے لے کر اُٹھی تاکہ سلا کر بعد میں کچن سمیٹ سکے۔ اس کے اُٹھتے ہی ڈور بیل ہوئی اور ثریا بھابی گیٹ کھولنے چلی گئیں۔ ابھی وہ اسے لے کر لیٹی ہی تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلتے ہی رافع اندر داخل ہوا۔

''ارے رافع! آپ..... خیریت؟'' وہ اس کے بے وقت آنے پر حیران ہوئی تھی سو فوراً اُٹھ بیٹھی۔

''ہاں میں..... عروبہ! میں تو تمہیں بہت معصوم سمجھتا تھا لیکن تم تو بڑی بی جمالو نکلیں۔'' آج وہ پھر غصے میں تھا۔

''لیکن.....'' وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ ننھا عالیان باپ کو دیکھتے ہی فیڈر چھوڑ کر اس کے پاس جانے کو

ہمک رہا تھا۔

''سارا کچن برتنوں سے بھرا پڑا ہے جو بھابی بے چاری کراہتی ہوئی صاف کر رہی ہیں۔ یہ گھر ہے کوئی ہوٹل نہیں کہ ڈائننگ ٹیبل سے برتن نہ اٹھائے جائیں۔ وہ اس گھر میں ویٹر نہیں ہیں کسی کی۔ ماں کا درجہ دیتا ہوں اُنہیں۔''

طیش کے عالم میں بولتا ہوا وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا جبکہ وہ خاموش ہی رہی کہ صفائی تو تب پیش کرتی اگر وہ اس کا یقین کرتا۔ لہٰذا چپ چاپ اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔ شروع شروع میں وہ اپنی صفائی پیش کرتی، وجہ بیان کرتی لیکن اب اس نے سب چھوڑ دیا تھا۔

''عروبہ! یار شکر کرو نہ ساس قریب، نہ نند پاس، عیش ہی عیش۔'' مایوں بیٹھی عروبہ سے نازش نے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا تھا کہ اس کی ساس اچھی خاصی تیز تھیں تو نند اُن سے بھی تیز تر۔ لہٰذا آئے دن ان کے گھر معرکے ہوا کرتے۔

''ارے ہاں یار! تمہاری تو مانو پانچوں اُنگلیاں گھی میں ہیں۔ اور ویسے بھی یہ ساس نندیں چاہیں تو میاں بیوی کو قریب لے آئیں اور چاہیں تو اتنا دُور کر دیں کہ ایک دُوجے کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ ہوں اور باقی کسی رشتے سے کوئی فکر نہیں۔''

یہ لبنیٰ تھی جو ساس نندوں کے دھوپ چھاؤں جیسے مزاج سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ آج اسے وہ تمام باتیں یاد آ رہی تھیں جو لڑکیاں اسے ساس نندوں کے جھنجٹ سے آزاد ہونے پر خوش قسمت گردانتے ہوئے سنا رہی تھیں۔

اگر گھر میں ساس یا نند ہوتیں تو شاید آج یہ حالات نہ ہوتے۔ کوئی تو رافع کو سمجھاتا۔ انصاف کرتا یا کم از کم سچ جھوٹ میں تمیز ہی کرتا۔ آج اسے کسی غیر جانبدار فریق کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس کے سامنے وہ اپنا مقدمہ پیش کر سکتی۔ ننھا عالیان فیڈر ہاتھ میں پکڑے یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ شاید وہ سہم گیا تھا۔ اُس کے دل میں ہوک سی اُٹھی تھی۔ فوراً لپک کر اسے گود میں لیا۔ زور سے بھینچ کر پیار کیا اور اپنے آنسو صاف کر کے دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی تاکہ وہ سو جائے۔ بچوں کے پاس چونکہ سوچنے کو کچھ نہیں ہوتا لہٰذا وہ سونے کا ارادہ کر کے بھی اس وقت تک آنکھیں کھلی رکھتے ہیں جب تک نیند کی مہربان دیوی انہیں مکمل طور پر اپنی آغوش میں نہ سمیٹ لے۔ لیکن جیسے جیسے ان میں سوچ کا شعور بیدار ہوتا ہے وہ سوئیں نہ سوئیں، لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیتے ہیں تاکہ سوچ کے پنچھی کو آزاد چھوڑا جا سکے۔

رافع کو شاید آفس کے کام کی وجہ سے کہیں جانا پڑا تھا جبھی بکتا جھکتا اپنی ضروری چیزیں لے کر چلا گیا تھا۔ اس نے سوئے ہوئے عالیان کو بیڈ پر لٹایا اور ساتھ ہی لیٹ کر خود بھی آنکھیں موند لیں تاکہ سوچ کے

پنچھی کو آزاد چھوڑ جا سکے۔

❁---❁---❁

''ہاں بھئی خوب صورت تو میں ہوں۔''

''جی میاں مٹھو نہیں، سب یہی کہتے ہیں۔''

''تو کیا ثابت کرنے کے لیے ملنا بہت ضروری ہے؟''

''ارے صبر بھئی صبر۔''

شک تو اُسے کئی روز سے تھا لیکن اس دن کچن میں جانے کے لیے لاؤنج سے گزرتے ہوئے اندر سے آنے والی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔ اپنی فطرت کے خلاف ذرا سا جھانک کر اندر دیکھا تو حنا اوندھے منہ لیٹی موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ کارپٹ پر کھلی کتاب میں موجود تصویر کو وہ یقیناً اپنے سامنے تصور کر رہی تھی۔ ٹی وی پر عجیب واہیات سا گانا چل رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر دوسری طرف کی گفتگو نہ سن کر بھی یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہ تھا کہ بات چیت کس قسم کی ہو رہی ہے۔ چہرے کے بدلتے رنگوں کے ساتھ اس نے تصویر کو خود سے قریب کر لیا تھا۔ پہلے تو اس نے اندر جانا چاہا لیکن پھر کچھ سوچتے ہوئے کچن کی طرف چل دی۔

❁---❁---❁

''ارے واہ بھئی انس! تم..... واٹ آ گریٹ سرپرائز۔'' کتنے عرصے بعد وہ اس طرح خوش ہوئی تھی کہ کچن میں حنا کی فرمائش پر پزا بناتے ہوئے ثریا بھابی نے فوراً باہر لاؤنج میں جھانکا جہاں ایک بانکا سجیلا جوان ہاتھوں میں گفٹس اٹھائے کھڑا تھا جبکہ عروبہ خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

''ہاں بھئی، تم نے تو شادی کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے تو میں نے آنٹی سے ایڈریس لیا اور اب فیوچر کے جاوید میانداد کے ساتھ حاضر۔'' اس نے سعد کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے خوش دلی سے کہا جو میچ ادھورا چھوڑ کر اسے اپنی رہنمائی میں لایا تھا۔

انس اُس کا خالہ زاد تھا اور دونوں نے کالج اور یونیورسٹی میں اکٹھے ہی پڑھا تھا۔ بعد میں جاب کے سلسلے میں وہ سکھر چلا گیا تھا۔ گو کہ خالہ نے اس کے لیے عروبہ کا رشتہ مانگا تھا لیکن چونکہ فاروق صاحب بڑی بہن کو ان کی زندگی میں زبان دے چکے تھے لہٰذا شائستگی سے منع کر دیا گیا۔ شادی میں بھی وہ اپنی جاب کی وجہ سے شریک نہیں ہو پایا تھا اور بعد میں بھی ایسا اتفاق نہ ہوا۔ یعنی کبھی وہ سکھر ہوتا اور کبھی عروبہ لاہور۔ لہٰذا آج کافی عرصے بعد مل رہے تھے۔

وہ چونکہ کچھ روز پہلے ہی کراچی سے آیا تھا لہٰذا وہ بڑی بے تابی سے امی، پاپا اور باقی سب کے بارے میں پوچھ رہی تھی، جبھی بھابی کے کڑے تیوروں کو سمجھ نہیں پائی جو رسمی سلام دعا کے بعد وہاں سے اُٹھ گئی تھیں۔ انس نے عالیان کو چونکہ پہلی مرتبہ دیکھا تھا لہٰذا اپنے سامنے ڈھیر سارے کھلونے بھی لے آیا تھا۔ خالہ کی طرف سے بھیجے گئے کپڑے وغیرہ الگ تھے۔

کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں عالیان بالکل اجنبیت محسوس نہ کرتے ہوئے مسلسل انس کے ساتھ چپکا رہا۔

وہ رافع سے ملنا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی عروبہ نے اس کے اسلام آباد جانے کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور بے حد اصرار کے باوجود کھانے کو منع کر دیا۔

''دیکھو عروبہ! رافع بھائی گھر پر ہوتے تو اور بات تھی۔ اب آیا تو فون کر کے آؤں گا اور نہ صرف کھانا کھاؤں گا بلکہ تمہارے سرتاج کے ساتھ دیر تک گپیں بھی لگاؤں گا۔'' چونکہ وہ ابھی مزید کچھ دن لاہور ہی میں تھا، لہٰذا اپنی ازلی خوش دلی سے اسے ٹال دیا۔

❀---❀---❀

وہ رافع سے ناراض تو ضرور تھی لیکن حنا کے متعلق اپنے خدشات اس تک ضرور پہنچا دینا چاہتی تھی تاکہ اس سے پہلے کہ وہ ناسمجھی میں کوئی غلط قدم اٹھا لے، اسے روکا جا سکے۔ ثریا بھابی کو وہ پہلے اشارتاً اور پھر واضح طور پر فون اور تصویر والی بات بتا چکی تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنے طور پر کوئی چھان بین کر کے سچ جاننے کی کوشش کرتیں، اُلٹا اُس پر برس پڑیں کہ وہ ان کی معصوم بیٹی پر الزام لگا رہی ہے۔ سو آج اس نے رافع سے کہنے کا سوچا جو حسبِ معمول ثریا بھابی کو سلام کر کے اب کمرے میں آیا تھا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

دو دن کے اسلام آباد کے وزٹ کی وجہ سے آج اس کا آفس سے آف تھا لہٰذا صبح جاگنگ کرنے کے بعد اس نے ناشتہ کیا اور پھر ثریا بھابی کے پاس دیر تک بیٹھنے کے بعد اب آیا تھا۔

عالیان بے ساختہ اس کی جانب لپکا تھا لیکن کوئی گرم جوشی دیکھنے میں نہ آئی۔ محض اسے گود میں لے کر خاموش سا صوفے پر ٹِک گیا۔

''رافع!'' وہ سمجھی تھی کہ وہی دو دن پرانا قصہ ہے لہٰذا حسبِ عادت درگزر کرتے ہوئے اس کے نزدیک چلی آئی لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بنا عالیان کے بالوں کو بگاڑتا اور بناتا رہا۔

''رافع! آپ سے بہت ضروری بات کرنی تھی اگر آپ کا موڈ ہو تو.....'' وہ بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

لیکن اس نے ایک بار پھر بولنے کے بجائے محض گردن موڑ کر دیکھ لینے پر اکتفا کیا۔ اس کے چہرے

کی معصومیت اور بھولپن یقیناً اس کی مثبت سوچوں کی عکاس تھی۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟'' وہ اس کا جواب ملنے تک خاموش رہی تھی جبھی رافع کو کہنا پڑا۔

''وہ.....وہ حنا آج کل کسی.....''

''بکومت.....!'' ابھی اس نے ٹھیک طرح بات شروع بھی نہیں کی تھی کہ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''شرم آنی چاہئے تمہیں، بچی پر اتنا گھٹیا الزام لگاتے ہوئے۔ دونوں نے رو رو کر آنکھیں سُجا لی ہیں..... تف ہے تم پر اور تمہاری نیچ سوچ پر۔'' اس نے غصے میں عالیان کو بیڈ پر پٹخا۔

''لیکن رافع! آپ یقین کریں میں نے خود کئی دفعہ فون پر گفتگو سنی ہے، تصویریں دیکھی ہیں دونوں کی۔ کم از کم اس معاملے کو تو سنبھالیں۔'' وہ کہتی ہوئی فوراً عالیان کی جانب بڑھی تھی جو پہلے تو سہم گیا تھا لیکن اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر فوراً رونے لگا۔

تڑاخ.....اس کے مڑتے ہی ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے خوب صورت رخسار پر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔

''شٹ اپ! اپنے کرتوت چھپانے کے لیے اس معصوم پر الزام لگا رہی ہو۔'' عروبہ نے روتے روتے ایک دم سر اٹھایا تھا۔

''کون ہوتا ہے وہ انس..... میری غیر موجودگی میں اس گھر میں آنے والا؟.....سب جانتا ہوں شادی سے پہلے کے حالات.....اپنی بے تابیوں کا اظہار کرتے وقت تمہیں خیال نہیں آیا کہ قریب موجود حنا کے دماغ پر کیا اثر پڑے گا۔''

سرخ آنکھوں کے ساتھ ہنوز غصے میں وہ اس کی جانب بڑھا تھا لیکن ذرا فاصلے پر ہی رُک گیا۔

اور عروبہ.....عروبہ کو تو اس لمحے زمین اپنے لیے تنگ پڑتی محسوس ہونے لگی اور وہ ایک اہم فیصلہ جسے اس نے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا، آج ایک لمحے میں ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی، عالیان کو بیڈ پر بٹھایا اور خود اپنی وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔

''مجھے ابھی اور اسی وقت کراچی جانا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ہر وقت بات بے بات اُمڈ آنے والے آنسو کہیں دُور جا چھپے تھے۔ بنجر آنکھوں میں ان گنت شکوے موجود تھے لیکن اس نے ہمیشہ کی طرح کسی بھی قسم کی صفائی دینے سے گریز کیا تھا۔

ننھا عالیان ہاتھ میں کھلونے پکڑے دہشت زدہ سا گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

''تو دفع ہو جاؤ، کس نے روکا ہے تمہیں؟..... میں ابھی عزیز سے تمہاری ٹکٹ کنفرم کرواتا ہوں۔'' فوراً اُٹھ کر اس نے بکنگ آفس میں موجود اپنے دوست سے محض تین گھنٹے بعد جانے والی فلائٹ کی ٹکٹ کنفرم کروا دی۔

''کوستا ہوں اس وقت کو، جب شبانہ کو چھوڑ کر تم سے شادی کی تھی۔ وہ ہوتی تو کم از کم بھابی اور بچوں کو تو اپنا سمجھتی۔ ہر وقت اس گھر کے بچے تو نہ اُدھیڑتی۔'' بھابی اور بچے بری طرح اس کے اعصاب پر سوار تھے۔ رافع کی بڑبڑاہٹ مسلسل جاری تھی لیکن اس کی ایک ہی چپ تھی۔ گھر میں کوئی اور تھا بھی نہیں جو دونوں کو سمجھا بجھا کر معاملہ سنبھالتا، اسے آئینہ دکھاتا۔ اور عروبہ جو تند و تیز ہوا میں اپنے لان میں موجود چڑیوں کے گھونسلوں کے لیے فکرمند رہا کرتی تھی، آج اس کا اپنا آشیانہ تنکے تنکے ہو رہا تھا، ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا اور وہ بے بس تھی۔ نہ صرف یہ کہ بے بس تھی بلکہ اس کے بکھرنے کا الزام مکمل طور پر اس کے سر دھرا جا رہا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا اب اسے مزید نہ کچھ کہنا تھا نہ سننا۔ اور یوں محض ایک گھنٹے بعد وہ ایئرپورٹ پر موجود تھی۔

''عروبہ! میں آج بہت خوش ہوں۔ تم جیسی خوب صورت اور دھیمے مزاج کی سلجھی ہوئی لڑکی میرا نصیب بنے گی میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دل تو چاہتا ہے چیخ چیخ کر ساری دینا کو بتاؤں کہ.....'' نگاہوں میں بے پناہ وارفتگی لیے وہ اس سے مخاطب تھا۔

''آپ نہ بھی بتائیں، سب ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔ پلیز ذرا ہٹ کر کھڑے ہوں نا۔'' اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی چھوئی موئی ہوئی عروبہ نے کسمساتے ہوئے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور لوگوں کی طرف توجہ دلائی جو بڑی دلچسپی سے آتے جاتے ہوئے اس نوبیاہتا جوڑے کو دیکھ رہے تھے اور وہ ایک دم کھسیا سا گیا تھا لہٰذا خجل ہو کر سر کھجانے لگا۔ لیکن وہ چونکہ لوگوں کے دیکھنے سے مسلسل نروس ہو رہی تھی، سو اُس کی کیفیت انجوائے کرتے ہوئے ریلیکس ہو کر ہنس دی۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ آج وہ عالیان کو لیے اسی کارنر پر کھڑی تھی جہاں شادی کے بعد کراچی جاتے ہوئے رافع کے ساتھ کھڑی تھی۔ لہٰذا پرانی یادیں اور حسین لمحات اُمڈ اُمڈ کر سامنے آ رہے تھے۔

❀---❀---❀

یوں اچانک بغیر اطلاع کے چلے آنے پر فاروق صاحب اور بیگم ٹھٹکے تو ضرور لیکن اس پر کچھ ظاہر نہ کرتے ہوئے بڑی خوشی اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ گھر میں داخل ہوتے ہی ممکنہ سوالات سے کس طرح نمٹے گی، ذرا ریلیکس ہو گئی اور ان کے پوچھنے پر سب خیریت ہے کہہ کر اپنے تئیں انہیں بھی مطمئن کر دیا۔ فاروق صاحب تو عالیان کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے لیکن وہ چونکہ سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا تھا، اس لیے مسلسل رو رہا تھا۔

''زینت! جلدی سے عالیان کا فیڈر بنا لاؤ۔'' جہاں آرا نے کام کرنے والی کو آواز دی جو انہوں نے عروبہ کی شادی کے بعد مستقل طور پر رکھ لی تھی اور گیراج نما کمرے کو سرونٹ کوارٹر کی شکل دے کر وہیں

رہائش کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ جس سے ایک تو ان کی تنہائی دُور ہوتی دوسرا وہ ان کے ساتھ سارا دن چھوٹے موٹے کام نمٹاتی اور رات کو اپنے گھر چلی جاتی۔

''عروبہ! تم اسے سلا کر فریش ہو جاؤ پھر محفل جمے گی۔ میں تب تک کھانے وغیرہ کا دیکھ لوں۔''

حسبِ عادت انہوں نے اسے بھی ہدایت دے ڈالی۔ اس کا کمرہ ویسا کا ویسا تھا اور ظاہر ہے گھر میں دونوں میاں بیوی کے علاوہ اور تھا ہی کون کہ کمرہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ ابھی وہ کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ ایک ہاتھ میں فیڈر اور دوسرے میں بیگ پکڑے زینت بھی آ گئی۔ ہینڈ بیگ وہ خود کندھے پر اٹھا لائی تھی۔

''لائیں بی بی! یہ ننھا شہزادہ مجھے دیں اور آپ اس کے کپڑے اور دوسری چیزیں نکالیں۔'' اس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی زینت نے جھٹ سے عالیان کو گود میں لیا اور فوراً کمرے سے ملحقہ باتھ رُوم میں گھس گئی۔

عروبہ کے شولڈر بیگ سے چیزیں نکالنے اور رکھنے تک وہ اسے تولیے میں لپیٹ کر باہر بھی لے آئی تھی۔ ہلکے ہاتھوں سے مساج کر کے تھوڑی دیر ورزش کے انداز میں اس کے ہاتھ پاؤں آگے پیچھے کیے۔ لوشن لگا کر نیپی باندھی، کپڑے پہنائے اور آخر میں تھوڑا سا پاؤڈر لگا کر اسے دلچسپی سے دیکھتی عروبہ کی گود میں ڈال دیا۔ اس نے یہ سب کام اتنی پھرتی سے کیا تھا کہ شاید عالیان کو رونے کا موقع بھی نہ مل پایا۔

''یہ لیں جی۔ اب سفر کی تھکن اُتری ہے نا تو دیر تک سوئے گا۔ بس فیڈر منہ میں ڈالنے کی دیر ہے۔''

بیڈ سے لوشن، پاؤڈر اور نیپی کریم وغیرہ اٹھا کر اس نے ڈریسنگ پر رکھی اور ٹاول اسٹینڈ پر ڈال کر باتھ روم خشک کرنے لگی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ بہر حال شکریہ!'' عروبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسے یہ پھرتیلی سی صاف ستھری لڑکی اچھی لگی تھی۔

❁---❁---❁

اگر یہ کہا جائے کہ کراچی میں تو محض موسم کا حال سن کر گرم کپڑے نکالے جاتے ہیں تو شاید کچھ غلط نہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی آج موسم بڑا خوشگوار تھا۔ اس نے عالیان کو پرام میں ڈالا، کچھ کھلونے اس کے ہینڈل کے ساتھ اٹیچ کیے اور لان میں آ کر مختلف پھول پودوں کا جائزہ لینے لگی جو کہ اس کی شادی کے بعد فاروق صاحب نے لگائے تھے۔ ہر پھول، اس کا رنگ، خوشبو، ساخت ایک سے بڑھ کر ایک تھی اور یہ ان کا واحد شوق تھا جس میں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد مصروف نظر آتے تھے۔

ہوا کے نرم و لطیف جھونکوں کے ساتھ جب مختلف اقسام کی خوشبوئیں مل کر فضا میں بکھرتیں تو بلاشبہ ذہن و دل کی تمام کثافت لمحہ بھر میں دھو ڈالتیں اور یہی تو وہ بھی چاہتی تھی کیونکہ آج اسے یہاں آئے پانچواں

روز تھا لیکن رافع نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور کرتا بھی کیسے کہ اب تو ثریا بھابی کے لیے مکمل طور پر میدان صاف تھا اور پھر کانوں کا کچا مرد بے شک خلوص و وفا میں کھوٹا نہ ہو لیکن اس کی محبت اس غبارے کی طرح ہوتی ہے جس کا وجود بے شک کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو صرف ایک سوئی سے ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور رافع کی یہی خامی اس کی تمام خوبیوں پر حاوی ہو کر اس کے گھر کا سکون تباہ کر رہی تھی۔

''عروبہ!''

''جی امی۔'' وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی اور جانے کب تک رہتی کہ ماں کی آواز سے چونک گئی۔ ننھا عالیان بھی اُنہیں دیکھ کر خوشی سے غوں غاں کرتے ہوئے اپنی جانب متوجہ کرنے لگا۔

''اتنے دنوں سے اگر میں نے یا تمہارے پاپا نے تم سے کچھ پوچھا نہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم تمہارے چہرے پر رقم پریشانی کی تحریر پڑھ نہیں پائے بلکہ ہم یہ چاہتے تھے کہ تم خود بات کا آغاز کرو۔'' اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے وہ اندر کی جانب بڑھنے لگیں تو پرام لیے عروبہ نے بھی ان کی تقلید کی۔

''جب سے تم آئی ہو نہ تو رافع نے کوئی رابطہ کیا اور نہ ہی تم نے کسی قسم کی کوئی بات کی۔ گو کہ وہ ایک اچھا اور انتہائی سلجھا ہوا لڑکا ہے لیکن پھر بھی ایسا کیا ہوا ہے جو تم یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئیں؟'' وہ واقعی پریشان تھیں اور رافع کے لیے تو ہر ایک کے پاس پسندیدگی کی سند تھی کہ وہ تھا ہی ایسا ہر ایک کو خوش رکھ کر خوش ہونے والا۔ جبھی عروبہ کا اس طرح چلے آنا دونوں میاں بیوی کے لیے اچنبھے کا باعث تھا اور آخر کب تک وہ ان سے چھپاتی۔ لہٰذا آہستہ آہستہ ثریا بھابی کے عمل سے لے کر رافع کے ردِعمل تک ساری باتیں مختصراً ان کے گوش گزار کر دیں۔ البتہ انس کے بارے میں ہونے والی گفتگو کے سخت الفاظ وہ مکمل طور پر حذف کر گئی تھی کہ جانتی تھی اس سے ماں کو شدید دھچکا لگے گا۔

''ہوں.....'' پوری بات سننے کے بعد گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے انہوں نے ہنکارا بھرا۔ عالیان کو زینت اندر لے گئی تھی تاکہ کچھ کھلا دے۔ ''شادی سے پہلے مجھے بھی اگر کوئی خدشہ تھا تو محض ثریا کی طرف سے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ بے شک بہترین منصف ہے اور مجھے اُمید ہے کہ سب بہتر ہو جائے گا اِن شاء اللہ.....!''

مغرب کا وقت تنگ ہو رہا تھا لہٰذا اسے تسلی دے کر وہ نماز کے لیے اُٹھ گئیں کہ انہیں اپنی سادہ دل اور بھولی سی بیٹی کے لیے معمول سے زیادہ دعائیں مانگنی تھیں جو ناسمجھی میں گھریلو سیاست کا شکار ہو گئی تھی۔

❀---❀---❀

''رافع! آج میں نے آپ کے لیے خاص طور پر پائے بنائے ہیں۔'' ابھی وہ آفس سے آ کر لاؤنج میں بیٹھا، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر ہی رہا تھا کہ ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے جدید تراش خراش کا لباس پہنے

شبانہ آن موجود ہوئی۔ عروبہ کے کراچی جانے کے اگلے روز ہی ثریا بھابی نے اسے بلا بھیجا تھا۔

''تھینک یو، لیکن میرا موڈ نہیں ہے۔ آج آفس میں ہی کچھ کھا لیا تھا۔'' بے دلی سے اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھنسائے آج وہ کافی ڈپریس لگ رہا تھا۔ جس دن سے عروبہ گئی تھی، اس کی بے چینی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ تو انجانے میں بھی کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور اب خود اس کی بیوی اس سے ناراض تھی اور بجا تھی تو اسے کیونکر سکون ملتا۔ یہاں ہوتی تو وہ دوسرے روز ہی نارمل انداز میں اس سے بات چیت کرنے لگتا اور وہ ہمیشہ سب کچھ بھلا کر اس کے ساتھ پہلے کی طرح ہو جاتی اور یوں بھی دونوں میں کوئی ذاتی اختلاف تو تھا نہیں۔ عروبہ نے اسے ہر لحاظ سے خوش اور مطمئن رکھا تھا۔ واحد مسئلہ بھابی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا تھا اور رافع اسی حقیقت سے نظریں چرائے ہوئے تھا کہ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

کمرے میں آتا تو عالیان کی یاد اسے بے تاب کر دیتی۔ آج بھی عزیز کے چھوٹے سے بچے کو قلقاریاں مار کر ہنستا دیکھ کر اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ عالیان کو اپنے بازوؤں میں دیر تک بھینچے اسے ہوا میں اُچھالے، ایک دم سے ''ہاؤ'' کر کے اس کی معصوم ہنسی سے محظوظ ہو۔

''رافع! کیا بات ہے؟ پریشان ہو.....؟'' بھابی بھاپ اُڑاتا چائے کا کپ لیے اس کے سامنے تھیں جبکہ شبانہ سامنے ٹیبل سے اس کا موبائل اٹھا کر چارجنگ کے لیے لگا رہی تھی۔ عروبہ کی غیر موجودگی میں وہ دونوں مکمل طور پر اس کے کھانے پینے، کپڑوں اور آرام وغیرہ کا بے حد خیال رکھ رہی تھیں کہ اس کی کمی محسوس نہ ہو اور وہ کسی طور عروبہ کو یاد نہ کرے۔

''عروبہ نے بھی خود غرضی اور چلتر پن کی حد کر دی ہے۔ جانتی بھی ہے کہ بندہ باہر سے آئے تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش ہوتی ہے لیکن وہ.....'' اس کے چہرے کے تاثرات جانچتے ہوئے انہوں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

''ارے باجی! ایسی عورتیں بچوں کو سامنے رکھ کر ہی تو جذباتی طور پر بلیک میل کرتی ہیں وہ رشید چاچا کی سکینہ کی طرح۔'' شبانہ نے کسی جاننے والی کا حوالہ دیا تھا۔

''خیر عروبہ تو ایسی نہیں۔'' آج پہلی مرتبہ وہ عروبہ کی حمایت میں بولا تھا لیکن اسے خود اپنے ہی الفاظ اجنبی سے لگے۔ جانے کیسے اس کے منہ سے یہ جملہ نکلا اور وہ بھی بھابی کے سامنے جنہیں کاظم بھائی کے علاوہ ہر شوہر کی بیوی کے لیے تعریف بری لگا کرتی تھی جبھی وہ فوراً سے پہلے مختلف قسم کے مضحکہ خیز قسم کے القابات سے نواز ڈالتیں کہ بندہ پچھتا کر رہ جاتا۔

''انکل! مجھے میڈم رعنا کی طرف جانا ہے۔'' ڈارک میرون شارٹ شرٹ اور پرپل چست پاجامے کے ساتھ کندھوں پر برائے نام اسکارف ڈالے ہاتھوں میں موبائل اور بیگ پکڑے اپنی چھوٹی سی پونی

جھلاتے ہوئے حنا بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ ہونٹوں پر لگی لائٹ پنک لپ اسٹک اور بالکل نیچرل بلش آن اس کے بچپنے کی عمر ختم ہو جانے کی گواہی دے رہے تھے۔

''حنا! یہ تمہاری عمر ہے اس طرح تیار ہو کر اِدھر اُدھر جانے کی.....؟'' رافع نے اسے دیکھا تو اس کے کپڑوں کی فٹنگ ہمیشہ کی طرح زچ کر گئی لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سرزنش کرنا پڑی۔

''انکل! جب ممی پاپا کو اعتراض نہیں تو پھر پلیز آپ میرا موڈ آف نہ کیا کریں۔'' پاؤں پٹختی ہوئی وہ وہیں دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

''رافع! فیشن ہے بھئی۔ آج کل سب پہنے ہوئے ہیں اور پھر زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے نا۔'' حنا کو پچکارتے ہوئے وہ اس سے مخاطب تھیں۔

''گاڑی اسٹارٹ کر رہا ہوں، آ جاؤ۔'' وہ جانتا تھا کہ اس بحث کا کوئی حاصل نہیں لہٰذا چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے ٹائی اُتار کر صوفے پر پھینکی، موبائل اُٹھایا اور چابی لیتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''دو دن بیوی کے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہونہہ، زن مرید!'' جاتے جاتے بھابی کا استہزائیہ انداز اور الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے تھے جو یقیناً اسے سنانے کے لیے با آواز بلند ادا کیے تھے کہ وہ اس طرح کے خطابات سے سخت چڑتا تھا۔

❀---❀---❀

آج طبیعت بے حد اُداس ہو رہی تھی۔ نہ تو کسی سے بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا اور نہ ہی سننے کو۔ لہٰذا حنا کو ڈراپ کرنے کے بعد وہ سیدھا گھر چلا آیا۔ سوچ رہا تھا کہ بھابی سے ایک کپ اسٹرونگ سی کافی کا کہے کہ کچن سے آتی آوازوں نے اسے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔

''ارے پگلی! تُو کیوں پریشان ہوتی ہے؟ رافع کو تو میں نے اس عجوبہ (عروبہ) کے اتنا خلاف کر دیا ہے کہ تُو دیکھنا واپس اس گھر میں آ نہیں پائے گی۔'' یہ اِٹھلاتی ہوئی آواز یقیناً ثریا بھابی کی تھی۔

''کہاں باجی! ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ اس عجوبے کی حمایت کر رہا تھا۔'' شبانہ کی آواز میں مایوسی نمایاں تھی۔

''دیکھ شبانہ! مرد سب کچھ بھول سکتا ہے لیکن اپنی بیوی کے ساتھ کسی اور کا چکر برداشت نہیں کر سکتا۔ جبھی تو میں نے اس بے چارے انس کا استعمال کیا۔ بس دو تین پتے اور پھینکنے کی دیر ہے۔ تُو اِن اور وہ آؤٹ.....''

اس سے پہلے کہ دونوں کا مشترکہ قہقہہ اُس کا دماغ مزید سلگاتا، وہ دبے قدموں باہر نکل گیا اور منتشر خیالات کے ساتھ کافی دیر یونہی بلا مقصد ڈرائیو کرتا رہا۔ وہ بہرحال ایک محبت کرنے والا انسان تھا۔

شروع سے اس کی بھابی کے ساتھ اٹیچ منٹ رہی تھی لہٰذا ان کی ہر بات پر مکمل طور پر یقین کرتا رہا یہ سوچے بغیر کہ ہمیشہ ایک ہی فریق کا مؤقف سننے سے کبھی فیصلے درست نہیں ہوا کرتے۔ عروبہ کے خاموش آنسو یاد آئے تو اس کے دل کی بے کلی عروج کو جا پہنچی۔ وہ ان مردوں میں سے نہیں تھا جو ہر حال میں اپنی انا اونچی رکھتے ہیں لیکن اس کی مثال تو ایسی تھی جیسے کوئی بچہ بڑی خوب صورتی اور صفائی اور محنت سے اپنا ہوم ورک تو کرے لیکن انجانے میں اس کے کام پر سیاہی گر جائے تو ظاہر ہے صاف ستھرا کام تو چھپ گیا اور نظر میں رہی تو بس سیاہی۔ اور وہ تو شاید عروبہ کے جانے کے دوسرے روز ہی اسے فون کر لیتا اگر معاملہ حنا پر الزام اور انس کا نہ ہوتا۔ لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ عروبہ بے قصور ہے اور باتوں میں آ کر اس نے زیادتی کر دی ہے اور پھر اب تو خود اس نے اپنے کانوں سے سب کچھ سنا تھا تو کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اسے نہ بلانے کی۔

'اور بھابی..... بھابی کیا کہیں گی کہ میں نے بھتیجی کی عزت پر بیوی کو فوقیت دی۔ اور کاظم بھائی، وہ سوچیں گے کہ خوب نگہبانی کی میں نے ان کے گھر والوں کی کہ خود میری بیوی ان کی عزت کے پرخچے اُڑاتی رہی۔' مختلف قسم کی سوچیں اس کے دماغ میں بدروحوں کی طرح بھٹک رہی تھیں۔

'اوہ میرے خدا! میری مدد کر۔' انہی سوچوں میں گم اس نے گاڑی شہر سے ذرا ہٹ کر تعمیر شدہ کافی شاپ کے سامنے روک کر اسٹیئرنگ پر سر ٹکا دیا۔

یہ کافی شاپ اپنے خواب ناک رومینٹک ماحول اور شہر سے ہٹ کر نسبتاً پُرسکون جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے کم مدت میں اپنی انفرادی حیثیت منوانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور گاڑی لا کر کے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ اپنے لیے نسبتاً کونے والی میز کا انتخاب کر کے بیٹھا اور اس سے پہلے کہ کچھ آرڈر دیتا، بری طرح چونک گیا۔ بائیں جانب کی چوتھی ٹیبل پر کسی نوجوان سے لڑکے کے ساتھ بیٹھی بلاشبہ وہ اس کی ''معصوم'' سی بھتیجی حنا ہی تھی۔ گھر میں بے پروائی سے کندھوں پر ڈالا گیا اسکارف ساتھ والی کرسی پر رکھا اپنی ناقدری کا شکوہ کر رہا تھا۔ لڑکے کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھے سرخ ہوتی حنا کو دیکھ کر اس کی رگیں تن گئی تھیں۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اس لڑکے کا دماغ درست کر دے لیکن وہ کوئی زبردستی اسے نہیں لایا تھا۔ وہ خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اور پھر اس طرح بات بڑھتی اور خود اس کی عزت شام کے اخباروں میں نیلام ہوتی۔ لہٰذا کھولتے خون مگر منجمد اعصاب کے ساتھ ٹیبل کے پاس جا پہنچا۔

''حنا!..... گھر چلو۔'' ایک کھا جانے والی نظر اُس رئیس زادے پر ڈال کر اس نے پیلی پڑتی حنا کو مخاطب کیا اور باہر نکل گیا۔

''یہ..... یہ حفاظت کر پائی ہیں آپ جوان بیٹی کی؟'' ساری بات بتا کر رافع نے وہ تینوں تصویریں ثریا بھابی کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا جو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گھبراہٹ میں حنا کی کتاب سے گر گئی تھیں۔

''کاظم بھائی ان کے اچھے مستقبل کے لیے گھر اور گھر والوں سے دُور، پردیس میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور آپ ان کے حال تک کو نہ سنبھال سکیں۔''

جواب میں وہ مسلسل روتی اور سوری کرتی حنا کو ساتھ لپٹائے خاموش کھڑی تھیں اور کہتیں بھی کیا؟ اتنے واضح ثبوت کے بعد اب ان کے پاس بچا ہی کیا تھا کہنے کو، سوائے ندامت، پچھتاوے اور تاسف کے۔ حنا کو لیے شکستہ قدموں سے وہ اندر کی جانب بڑھیں کہ دوسروں کے گھر کو لگائی جانے والی آگ خود ان کے آشیانے کے پھول جھلسانے لگی تھی۔ جنہیں اب ہر صورت میں بچانا تھا۔

''جتنی توجہ اور وقت آپ نے عروبہ کو یہاں سے نکالنے میں صرف کیا، اگر اس پر کرتیں تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ افسوس ہے مجھے آپ اور آپ جیسی تمام عورتوں پر جو اپنا گھر سنوارنے کے بجائے دوسرے کا گھر اُجاڑنے میں کوشاں رہتی ہیں۔''

ٹیبل کو ٹھوکر مارتے ہوئے اس نے نہایت دکھ سے سوچا اور ایک بار پھر ٹکٹ کے لیے عزیز کو فون ملانے لگا کہ عروبہ کو فون کر کے اسے اپنے سابقہ روّیے کی تلافی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا تھا کہ اس کا ''صبح کا بھولا'' شام سے پہلے گھر آ گیا ہے۔

کاش ایسا ہو

''ہادی!.....اب بس بھی کرو۔ کتنی دیر سے بیٹھے ویڈیو گیم کھیل رہے ہو۔''

نوشی دوپہر کے کھانے کے بعد کچن صاف کر کے بارہ سالہ ہادی کے کمرے میں آئی تو اسے ویڈیو گیم کھیلتے دیکھ کر بھڑک اُٹھی۔ اُس کی زوردار آواز سے ہادی کی بھی محویت ٹوٹی اور وہ ہڑبڑاتے ہوئے چونک سا گیا۔

''ایک تو تمہاری نظر کمزور ہے، اوپر سے اتنی دیر گیم کھیلتے رہتے ہو۔ پھر اس کے فوراً بعد تمہیں کارٹون دیکھنے یاد آ جائیں گے.....آخر کوئی اور ایکٹیویٹی ہے کیا تمہارے پاس؟''

''مما! صرف ایک گھنٹہ ہی تو ہوا ہے ابھی۔'' ہادی نے منہ بسورتے ہوئے اسکرین پر موجود کرداروں کو دیکھا جو اس کی طرف سے کمانڈ کے منتظر تھے۔

''ایک گھنٹہ.....؟'' حیرت سے نوشی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جبھی تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے گیم کا ریموٹ اٹھا کر آف کا بٹن دبایا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ اتنی دیر ویڈیو گیم کھیلتے ہیں کیا؟''

''تو اور کیا کروں؟.....آج ہوم ورک بھی نہیں ہے، کھیل لینے دیں نا۔'' منہ بسورتے ہوئے اس نے التجائیہ انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔ اُکتاہٹ اور بیزاری اُس کے انداز سے بخوبی ظاہر تھی۔

''جاؤ، جا کر باہر کھیل آؤ۔'' اپنے تئیں نوشی نے اسے بہترین تجویز دی تھی۔

''اتنی دھوپ میں؟.....کیا واقعی چلا جاؤں؟'' ہادی کی حیرت اور بروقت مصدقہ اطلاع پر نوشی کو محسوس ہوا کہ شاید وہ جھلاہٹ کا شکار ہو رہی ہے اور اس سے ہادی کا یوں فارغ بیٹھنا برداشت نہیں ہو پا رہا۔

دراصل یہ وقت ہادی کے قرآن پاک پڑھنے کا تھا۔ قاری صاحب روز اسی وقت قرآن پاک پڑھایا

کرتے تھے، جبھی اس کی روٹین اس طرح کی ہوتی کہ اسکول سے واپسی پر لنچ کے بعد قرآن پاک پڑھنے اور پھر ٹیوٹر کے آنے کے بعد ہوم ورک کرنے سے کھیلنے کا وقت مختصر ہی بچ پاتا، جس میں وہ خود اپنی مرضی سے آؤٹ ڈور یا اِن ڈور گیمز کا انتخاب کیا کرتا۔ ہادی کی اس روٹین سے خود نوشی کے دل میں بھی یہ احساس پیدا ہوتا کہ ہادی بغیر وقت ضائع کیے ایک بہترین شیڈول کے تحت پروان چڑھ رہا ہے۔ مسئلہ تب پیدا ہوا جب قاری صاحب انتقال کر گئے اور بچوں کو فراغت کے لمحات زیادہ سے زیادہ میسر آنے لگے۔ اور یہی بات خود نوشی کے لیے بھی انتہائی پریشان کن تھی۔

❀---❀---❀

''ہما!.....کوئی بندوبست ہوا بچوں کو قرآن پاک پڑھوانے کا؟'' ہادی کو اسکول اور منیب کو آفس روانہ کرنے کے بعد نوشی نے اپنے لیے گرم گرم چائے بنائی، فون ہاتھ میں لیا اور ٹی وی پر نیوز چینل لگانے کے بعد آواز بند کر کے صوفے پر دونوں پاؤں رکھ کر آرام سے بیٹھنے کے بعد ہما کا نمبر ملایا۔

''ارے نہیں یار!..... یاد ہی نہیں رہتا رازی سے کہنا۔ اور پھر میں نے سوچا، چلو خیر ہے کچھ دن بچے بھی ریلیکس ہو جائیں۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر ہادی بہت دیر ٹی وی کے آگے بیٹھا رہتا ہے۔ پہلے اچھا تھا کہ کچھ دیر قرآن پاک پڑھنے کے بہانے ٹی وی تو نہیں لگا پاتا تھا نا۔'' نوشی نے ٹی وی پر چلنے والی نیوز پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنی پریشانی بیان کی تو ہما ہنس دی۔

''اچھا، اچھا.....تم ہادی کو ٹی وی سے دُور رکھنا چاہتی ہو۔ میں بھی سوچ رہی تھی تم کب سے اسلامی بہن بن گئیں جو قرآن پاک نہ پڑھنے پر اتنی پریشان ہو رہی ہو۔'' اس کی بات پر خود نوشی بھی قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

''دراصل اس کی نظر بھی تو کمزور ہے نا۔''

''ہاں وہ تو مجھے پتہ ہے۔ چلو ٹھیک ہے، ایسا کرتے ہیں آج رازی آفس سے آتے ہیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔''

''ویسے ابھی کچھ دیر پہلے میری اقرا اور نبیلہ سے بھی اسی ٹاپک پر بات ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی بچوں پر ویسے ہی اسٹڈیز کا اتنا بوجھ ہے، اسی لیے بہتر ہوگا اگر ہم میٹرک تک انتظار کر لیں۔''

''کس بات کا انتظار؟'' چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ ہما کی کہی گئی بات کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

''قرآن پاک پڑھوانے کا، یعنی ابھی جس طرح ہے، ویسے ہی چلنے دیا جائے۔ اور میٹرک کے ایگزام کے بعد ہونے والی چھٹیوں میں بچے قرآن پاک پڑھ لیں۔ اس طرح ان پر زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا نا۔ کیا

خیال ہے؟''

''ہوں.....'' نوشی نے چند لمحے سوچتے ہوئے آگے بڑھ کر کپ واپس ٹیبل پر رکھا اور غیر مطمئن انداز میں بولی۔ ''میٹرک کے ایگزامز تو وہ تب دیں نا، جب گیمز کی جان چھوڑیں گے۔ میرا خیال ہے میں منیب سے کہتی ہوں کوئی قاری ڈھونڈیں۔ تم بھی رازی بھائی سے کہنا۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں آج ہی بات کروں گی، اوکے۔'' فون بند کر کے نوشی نے ٹی وی کی آواز اونچی کی اور کام والی ماسی کا انتظار کرنے لگی۔

❁---❁---❁

''کہنا تو نہیں چاہئے مگر قاری صاحب خود تو مر گئے اور ہمیں مصیبت میں ڈال گئے۔'' منیب نے بیزاری سے ہاتھ میں پکڑا موبائل چارجنگ کی غرض سے نوشی کی طرف بڑھایا اور خود اپنی آفس فائل لے کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔

''زندگی موت میں تو اپنی مرضی نہیں چلتی نا منیب! مسئلہ یہ ہے کہ اب ہم کسی نئے قاری کا انتظام کریں۔''

منیب نے ایک نظر موبائل چارجنگ پر لگاتی نوشی کی طرف دیکھا اور اسٹڈی ٹیبل پر موجود ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر نوشی بھی ٹیبل کے سامنے رکھی دوسری کرسی پر ٹِک گئی۔

کچن میں ماسی کے ساتھ کام کا جائزہ لیتی نوشی بڑی تن دہی سے کام کرتی ماسی کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے اچانک کچھ یاد آ جانے پر ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھی اور کارڈلیس پر ہما کا نمبر ملا کر دوبارہ کچن میں آ گئی۔

''مبارک ہو بھئی۔ قاری صاحب کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔'' رسمی سلام دعا اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد نوشی نے جیسے اپنے تئیں ہما کو خوشخبری سنائی تھی۔ مگر دوسری طرف سے آنے والی ہنسی کی آواز نے اس کے جوش کو مدھم کر دیا۔

''کوئی لطیفہ سنایا ہے میں نے تمہیں؟''

''یار! مبارک تو تم ایسے دے رہی ہو جیسے ورلڈ ٹور پر جا رہی ہو۔'' ہما کا لہجہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔'' نوشی کو اس کا یہ ردِعمل ناگوار گزرا تھا۔

''ارے رُکو..... سوری بابا! سوری۔ چلو اب تفصیل سے بتاؤ کہ کیسے حل ہوا یہ مسئلۂ عظیم؟''

''منیب نے رات کو محمود صاحب سے فون پر بات کی تھی نا تو وہ کہہ رہے تھے کہ مؤذن بھی آج کل

کوئی مقرر نہیں ہے مسجد میں، کوئی بھی وقت دیکھ کر اذان دے دیتا ہے۔ اس لیے یہ پرابلم صرف بچوں کی نہیں، اس زحمت سے بڑے بھی دوچار ہیں۔'' ہما کے سوری کہنے پر نوشی بچوں کی طرح فوراً مان بھی گئی، جبھی مکمل تفصیل اس کے گوش گزار کرنے لگی۔

''تو پھر بات کی انہوں نے کسی سے؟''

''ہاں کہہ رہے تھے جمعہ کے دن سے اِن شاء اللہ نیا قاری آ جائے گا، جو اذان، جماعت وغیرہ کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی پڑھایا کرے گا۔''

''چلو یہ تو اچھی بات ہے، یعنی بچے ایک بار پھر اپنی آزادی چھینے جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

❁---❁---❁

یوسف کا درسِ نظامیہ میں آخری ہفتہ چل رہا تھا، جب محمود صاحب نے اسے اپنے محلے میں آ کر مسجد کے تمام امور سنبھالنے کی درخواست کی۔ خود وہ بھی اپنی ذات کو اس اہم ذمہ داری کے قابل جان کر بہت خوش ہوا جبھی اس نے جمعہ کے روز سے باقاعدہ طور پر اپنے فرائض سنبھالنے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے انہیں بہت پُر اُمید اور مطمئن حالت میں بھیجا تھا کہ ماسٹرز کر لینے کے بعد اب یہ آخری ہفتہ اس کے لیے نہایت اہم تھا۔

پرنسپل کے والد کی ڈیتھ کی وجہ سے آج ہادی کے اسکول کی چھٹی تھی اور ہوم ورک نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھلے میدان میں کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھا جب سامنے سے آتے رکشے نے اُنہیں رُکنے پر مجبور کر دیا۔ چند لمحوں بعد پینٹ شرٹ میں ملبوس یوسف کاندھے پر بیگ اور ہاتھ میں اخبار لیے رکشے سے باہر نکلا تو سبھی بچے تجسس سے اس اجنبی کو دیکھنے لگے، جس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک موجود تھی۔ رکشے والے کو کرایہ ادا کرنے کے بعد اس نے ایک نظر اپنے چاروں طرف ڈالی اور سامنے کھیلتے بچوں کے پاس آ گیا۔

''السلام علیکم!'' ایک ایک کر کے وہ سب بچوں سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ بچے حیرت اور پریشانی سے کبھی اسے دیکھتے اور کبھی اس کی مسکراہٹ میں اُلجھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے اس کے بارے میں دریافت کرنے لگتے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ سلام کے بعد کوئی اور بات کرتا یا اپنا تعارف کرواتا، آفس سے واپسی پر گھر آتا منیب بچوں کے پاس کھڑے ایک انجان آدمی کو دیکھ کر گاڑی پارک کرنے کے فوراً بعد اُس کے پاس آن پہنچا۔

منیب کو دیکھتے ہی گویا بچوں کی اٹکی سانس بحال ہوئی تھی۔ بچوں کے تاثرات کے تعاقب میں یوسف نے بھی منیب کو دیکھا تو اسی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بھی سلام کرنے میں پہل کر ڈالی۔

''میرا نام یوسف ہے۔'' منیب کے خشک اور رُوکھے پھیکے تاثرات کو قطعی طور پر نظرانداز کرتے ہوئے یوسف نے اپنا تعارف کروایا۔

''سوری.....مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ دراصل محمود صاحب تشریف لائے تھے میرے پاس اور میں نے جمعہ کے بابرکت دن سے مسجد کے امور سنبھالنے کا وعدہ کیا تھا، اسی لیے آج شام ہی چلا آیا تاکہ اپنے وعدے کے عین مطابق کل سے ذمہ داریوں کا آغاز کیا جائے۔''

یوسف نے مکمل تفصیل سے اپنی آمد کے بارے میں بتایا تو منیب ایک بار پھر اسے سر سے پیر تک دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ پاؤں میں جاگرز، پینٹ شرٹ اور سر پر دھوپ سے بچنے کے لیے رکھی گئی کیپ۔ وہ کہیں سے بھی ایک کالج بوائے سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ پُرکشش نقوش کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی داڑھی منیب کو کسی بھی طرح قائل نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ بندہ اذان دینے، جماعت کروانے جیسے کام کر سکتا ہے۔

''اوہ اچھا.....خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اب میں چلتا ہوں۔'' اوپری دل سے کہا گیا جملہ اس کے چہرے کے بالکل برعکس تھا مگر پھر بھی جواباً یوسف کی گرم جوشی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

''اِن شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔'' یوسف کے لہجے کے یقین نے منیب کو چونک کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''میرا مطلب تھا مسجد میں تو ملاقات ہوتی ہی رہے گی نا۔''

''اوہ ہاں.....ضرور۔'' یوسف کی وضاحت پر منیب کھسیا گیا تھا اور پھر رُکا نہیں۔ بچے بھی اسے انتہائی دلچسپی سے دیکھتے ہوئے وقفے وقفے سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

''اوکے بچو! اِن شاء اللہ see you soon۔ اللہ حافظ۔'' سب بچوں کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے یوسف نے کہا اور مسجد کو جانے والے راستے کی طرف جس طرف محمود صاحب نے سمجھایا تھا، انہی کی گائیڈینس ذہن میں رکھتے ہوئے چل دیا۔

❀---❀---❀

''محمود صاحب بھی نا بے چارے پرانے وقتوں کے بھلے اور سیدھے سادے آدمی ہیں۔ عمر میں بھی بڑے ہیں۔ بھلا بندہ اب انہیں کیا کہے؟'' گھر میں داخل ہونے کے بعد ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے منیب نے بریف کیس صوفے پر رکھا اور بڑبڑاتے ہوئے کچن میں داخل ہوا جہاں حسب معمول نوشی اس کے آنے کا ٹائم ہو جانے پر گرما گرم چائے کو دم پر لگائے کھڑی تھی۔ مگر اس کا موڈ دیکھ کر چونک سی گئی۔

''کیا ہوا؟.....خیر تو ہے؟'' چولہا بند کر کے اس نے منیب کے ہاتھ منہ دھونے کا بھی انتظار کیے بغیر جلدی سے دو کپوں میں چائے اُنڈیلی مبادا کسی اور پر آئے غصے کی زد میں وہ نہ دھر لی جائے۔

''ہاں خیر ہی ہے۔'' آج وہ کچن میں ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور اب کپ ہاتھ میں لیے کچن کی طرف سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ادھر نوشی کی بے چینی عروج پر تھی، جبھی بہت دیر اس کی طرف سے تفصیلی بات کا انتظار کرنے کے بعد آخر ایک بار پھر پوچھ ہی بیٹھی۔

''پھر بھی.....ہوا کیا ہے؟''

''محمود صاحب کو قاری کا کہا تھا، مگر وہ پتہ نہیں کسے لے آئے ہیں۔ قاری کم اور کسی فلم کا ہیرو زیادہ لگ رہا تھا۔ بھلا وہ بچوں کو کیا تعلیم دے گا، یا مسجد میں کیا انتظام سنبھالے گا؟''

''فلم کا ہیرو؟'' اس بات پر تو نوشی بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

''اور کیا؟.....تم بھی اس کا حلیہ اور شکل دیکھتیں تو میں پوچھتا تمہاری رائے۔''

''لیکن اگر محمود صاحب نے اسے خاص طور پر یہاں آنے کو کہا ہے تو پھر کوئی بات تو ہوگی نا۔''

''یار! بات کیا ہونی ہے؟ آج کل دنیا میں بہت چالاکیاں اور بہت فراڈ ہوتے ہیں۔ لگا لیا ہوگا اس نے محمود صاحب کو بھی اپنی باتوں میں اور کیا؟''

''اچھا لیکن آپ کو تو خوامخواہ کسی کے سامنے اپنی رائے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے.....سمجھے نا؟''

''ہاں ہاں پتہ ہے سب۔ ڈونٹ وری۔'' منیب نے بات ختم کی اور کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے بیڈروم کا رخ کیا۔ سنک میں کپ رکھ کر نوشی نے بھی اس کی تقلید کی۔

❁---❁---❁

''یار! یہ کیا ہو رہا ہے؟.....کس چیز کی آوازیں آ رہی ہیں؟'' مُندی مُندی آنکھوں سے منیب نے نوشی کو ہلاتے ہوئے پوچھا تو وہ بھی جاگ گئی۔ لمحہ بھر بعد اوسان بحال ہوئے تو احساس ہوا کہ یہ آوازیں آخر آ کہاں سے رہی ہیں۔

''مسجد سے تلاوت کی آواز آ رہی ہے منیب!'' جواب دے کر نوشی نے ایک بار پھر ٹوٹی ہوئی نیند کا سلسلہ جوڑنا چاہا۔

''تلاوت.....اس وقت؟.....یہ کون سا وقت ہے آخر مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت کرنے کا؟'' نوشی کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر وہ پھر سے بولا۔ ''او بھائی اللہ کے بندے! تُو نے خود نہیں سونا، نہ سو۔ ہمیں تو سونے دے یار۔'' نہایت جذب اور رقت کے ساتھ کی جانے والی تلاوت مسلسل اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

''صبح ہو جائے ذرا تو میں محمود صاحب سے بات کرتا ہوں کہ جناب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دن میں کام کرتے رہو اور رات کو بیٹھ کر تلاوت سنو۔''

''سو جائیں منیب پلیز۔ اور مجھے بھی سونے دیں۔ یا آپ نے بھی ساتھ اپنا حصہ ڈالنا ہے؟''

''تمہیں پتہ تو ہے، مجھے شور میں نیند نہیں آتی۔''

''اوہو، تو صوفے سے کشن اُٹھائیں اور کانوں پر رکھ لیں۔ مگر پلیز مجھے تو سونے دیں۔''

منیب نے اس کی طرف سے دیئے گئے مشورے پر بیزاری سے دیکھا اور پھر اس کے دیئے گئے مشورے پر عمل بھی کر ڈالا۔

❀---❀---❀

''بیٹا! اندر آ سکتا ہوں؟''

محمود صاحب نے دروازے پر دستک دینے کے بعد یوسف سے اندر آنے کی اجازت چاہی تو وہ لمحہ بھر میں ان کے استقبال کو خود دروازے تک آن پہنچا۔

''آیئے آیئے محمود صاحب! بھلا پوچھنے کی زحمت کیوں کی؟''

''جیتے رہو بیٹا!.....خوش رہو۔'' محمود صاحب نے مسجد سے متصل اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے چاروں طرف نظر دوڑائی تو احساس ہوا کہ جمعرات کی شام یہاں پہنچنے کے بعد اس نے کمرے کو اچھی طرح صاف کیا ہے۔ ایک طرف ترتیب سے لگی کتابیں، صاف ستھرا بستر، کمرے کے ہی ایک کونے میں کچن میں ضروری استعمال ہونے والی اشیائے خورونوش اور ساتھ ہی رکھا چولہا۔

یہ کمرہ اُسے مسجد کے فرائض منصبی سنبھالنے میں آسانی اور سہولت کے لیے محلے والوں کی طرف سے ہی دیا گیا تھا۔ ہاں البتہ چولہے کے لیے درخواست اس نے خود کی تھی وگرنہ اس سے پہلے قاری صاحب کا کھانا محلے کے تمام گھر والے باری باری پہنچایا کرتے تھے۔ مگر یوسف کا خیال تھا کہ اگر اسے ایک چولہا فراہم کر دیا جائے تو وہ خود اپنے لیے کھانا پکا سکتا ہے، جبھی محمود صاحب نے اپنے ہی گھر کے اسٹور سے ایک چولہا اسے لا دیا تھا، جسے یقیناً اب سے کچھ دیر پہلے وہ صاف کر رہا تھا۔ یوسف کے ہاتھ میں موجود اسٹیل وول دیکھ کر محمود صاحب کو شرمندگی سی ہونے لگی۔

''معاف کرنا بیٹا! دراصل کافی عرصے سے یہ چولہا اسٹور میں ہی پڑا رہا، اس لیے دھول مٹی بہت زیادہ جم گئی ہے۔ تم مجھے کہتے، میں گھر سے صاف کروا لاتا۔'' انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے پہلے دیکھا کیوں نہیں کہ چولہا صفائی کے قابل ہے۔ بس نوکر سے کہا اور وہ اُٹھا کر یہاں رکھ گیا جبھی معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں محمود صاحب! اگر میں نے خود صاف کر لیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بلکہ مجھے تو خوشی اور فخر ہے کہ میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کر رہا ہوں۔'' یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے، گویا بات کرنے کے لیے الفاظ کا چناؤ کر رہے ہوں۔ پھر آہستگی سے گویا ہوئے۔

''یوسف بیٹا! تم سے ایک بات کرنا تھی اگر برا محسوس نہ کرو۔''

''ایسی کیا بات ہے جو کرنے کے لیے آپ کو تمہید باندھنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟''

''وہ دراصل..... آج صبح اذانِ فجر کے بعد تم نے خوب صورت آواز میں تلاوت کی تو دل کو بہت سکون ملا۔ لیکن بیٹا.....!'' اُن کے لیکن پر یوسف چونکا تھا۔

''ہر جگہ، محلے اور شہر کا ماحول کچھ مختلف ہوتا ہے، یقیناً بعد از اذان تمہارا تلاوت کرنا باعثِ اجر وثواب ہے مگر.....'' بات مکمل کرنے کے دوران محمود صاحب شدید کشمکش کا شکار دکھائی دیئے۔ مگر یوسف نے انہیں اپنی بات مکمل کرنے کے لیے پورا وقت دیتے ہوئے خاموشی اختیار کی اور ان کے بات کرنے کے دوران رُک جانے پر اپنی نگاہیں فرش کی جانب مرکوز کر دیں تا کہ وہ سہولت سے اپنی بات ختم کر سکیں۔

''یہاں کا ماحول کچھ اس طرح کا ہے کہ لوگوں نے اس فعلِ عظیم کو اپنی نیند میں خلل قرار دیتے ہوئے آئندہ نہ دہرانے کی درخواست کی ہے۔''

''جی.....!'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں بیٹا! ہو سکے تو آئندہ فجر کی اذان دینے کے بعد تلاوت کرنے سے گریز کرنا۔ اور اگر کرنی ہی ہو تو لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہ کرنا تا کہ تمہاری آواز سے کسی کی نیند میں خلل واقع نہ ہو۔''

''جی بہتر۔ ویسے ان کا یہ مطالبہ مجھے کسی بھی طور ماننے میں کوئی قباحت اس لیے بھی نہیں ہے کہ خود اسلام ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ دوسروں کے حقوق کا خاص خیال رکھا جائے۔'' وہ بات جو محمود صاحب سمجھ رہے تھے کہ بہت بڑی ہے، اور ایسا نہ ہو کہ یوسف اسے اپنی انا کا مسئلہ بناتے ہوئے ماننے سے انکار کر دے، وہ بات یوسف نے اتنی خوب صورتی سے تسلیم کرتے ہوئے ان کے مؤقف کی تائید کی اور ایک دم ہلکے پھلکے سے ہو گئے اور انہیں یہ لگا کہ یہ تو کوئی بہت معمولی سی بات تھی جسے سوچ کر وہ بس یونہی پریشان ہو رہے تھے۔

''شریعت اور عقیدت میں تو بہت فرق ہوتا ہے نا محمود صاحب! میرا فعل میری عقیدت کا مظہر تھا مگر ان کا مطالبہ شریعت کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے یقیناً ان سب کا جائز حق ہے جو انہیں ملنا ہی چاہیے۔''

''خدا تمہارے علم و ادب میں اضافہ فرمائے۔'' نہایت سرشار لہجے میں انہوں نے یوسف کو دعا دی تو وہ مسکرا دیا۔

''ارے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟'' طے شدہ پروگرام کے مطابق آج نوشی اور ہما نے شاپنگ کرنے جانا تھا۔ اسی مقصد کے لیے نوشی کے دیئے گئے ٹائم کے عین مطابق ہما اس کے گھر پر موجود تھی مگر نوشی کا تو جیسے دُور دُور تک جانے کا فی الحال کوئی ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا جس پر ہما کی حیرت بجا تھی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟..... بڑی سست لگ رہی ہو۔'' شولڈر سے پرس اُتار کر صوفے پر رکھتے ہوئے وہ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''ہاں یار! رات کی نیند بہت ڈسٹرب رہی، صبح طریقے سے سو نہیں پائی، اس لیے۔'' کسلمندی سے بات کرتے ہوئے اس نے جمائی لیتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''رازی نے محمود صاحب سے کہا تھا قاری کو منع کرنے کے لیے۔ اب دیکھو مانتا ہے کہ نہیں۔ آخر مولوی ہے نا۔ پتہ نہیں کوئی نکتہ اپنے حق میں نکال کر اسی پر اَڑ جائے۔''

''وکیلوں اور مولویوں کو بندہ ان کی مرضی کے بغیر ویسے قائل نہیں کر سکتا۔''

''ویسے سچ کہوں تو مولوی لگتا ہی نہیں ہے وہ کہیں سے بھی۔''

''کیا مطلب؟..... تم نے کہاں دیکھا ہے؟''

''ابھی تمہاری طرف آتے ہوئے راستے میں نظر آیا۔ پتہ ہے نا، مسجد کے آگے سے ہی گاڑی گزرتی ہے۔ محمود صاحب کا نوکر خیر سے انگلش اخبار دینے آیا تھا اور وہ مسجد کے سامنے ہی کھڑا اس سے اخبار لیتے ہوئے شاید حال چال پوچھ رہا تھا۔

''مولوی اور انگلش اخبار؟ گنگا ہی اس کا مطلب ہے اُلٹی بہہ رہی ہے۔'' نوشی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''تو اور کیا؟ مجھے ڈرائیور نے بتایا کہ یہ ہماری مسجد کا نیا مولوی ہے ورنہ میں تو شاید کبھی نہ مانتی۔'' کام والی چائے کی ٹرالی لے کر آئی تو نوشی نے ہما کی طرف چائے بڑھانے کے بعد خود بھی گرما گرم چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''تم کیوں نہ مانتیں؟''

''بھئی وہ مولوی لگتا ہی نہیں ہے۔ سچی اتنا تو ہینڈسم ہے۔ اوپر سے اچھی طرح خوب صورتی سے کٹنگ کروا کر سیٹ کیے ہوئے بال اور داڑھی بھی یقیناً اس نے اسی لیے رکھی ہوئی ہے کہ اس پر سج رہی ہے۔ اور پھر شوق دیکھو انگلش اخبار.....'' اس دفعہ ہما نے بھی فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا۔

''ویسے بھی یار! بے روزگاری بھی تو حد سے بڑھ گئی ہے نا۔ نوکریاں ملتی نہیں ہیں، اور نہ ہی آج کل کے لڑکے لگن سے پڑھتے ہیں۔ جانتے جو ہیں کہ پڑھ لکھ کر بھی بے روزگار ہی رہنا ہے۔'' نوشی چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے کے ساتھ اس کی بات پر تائیدی انداز میں سر ہلا رہی تھی۔

''اور مولویوں کا ''پیشہ'' ایسا ہے کہ جس میں کوئی بھی ڈاکومنٹس اسناد تو دُور کی بات ہے، چھوٹا سا ٹیسٹ لینے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔ بس محلے کی مسجد خالی ہو تو کسی بھی ایسے بندے کو لے آؤ جو بڑوں کو نماز اور بچوں کو قرآن پڑھانے کا ماہر ہو۔ بس آگے اللہ اللہ خیر سلا۔'' ہما نے بے لاگ تبصرہ کیا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے نا، ویسے بھی نماز کے وقت میں تو سارا دن سب آفسز میں ہوتے ہیں۔ شام میں تھکے ہار آ کر بھلا کس میں ہمت ہوتی ہے مسجد جانے کی۔ اس وقت تو دل چاہتا ہے کہ بس کسی خوبصورت سے پارک میں چہل قدمی کر کے بندہ خود کو فریش کر لے۔ اور جہاں تک بات ہے بچوں کی، ان کو بھی اسکرین کے آگے سے ہٹانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ ورنہ تو ظاہر ہے قرآن پاک ختم کرنے کے لیے تو ابھی عمر پڑی ہے، کوئی شرط تھوڑی لگائی ہے مذہب نے کہ ضرور اس عمر تک ہی قرآن ختم کرنا ہے۔''

''یہ سب تو مولویوں نے ڈرایا ہوا ہے عوام کو، ورنہ اسلام میں تو بہت نرمی ہے۔''

''اسلام میں تو نرمی ہے لیکن اب اگر تم نے تیار ہونے میں دیر لگائی تو میں تم سے کوئی نرمی نہیں برتوں گی۔'' چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے ہما نے کہا تو نوشی مصنوعی خوف کا مظاہرہ کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہ بابا نہ۔ ایسا نہ کرنا۔ تم پانچ منٹ انتظار کرو، میں آدھے گھنٹے میں آئی۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' سرسری انداز میں اس کی بات کا ہما نے جواب تو دے دیا مگر اگلے ہی لمحے بات سمجھ آنے پر پاس رکھا کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

❀---❀---❀

یوسف آج سے پہلے بھی کافی لوگوں سے مل چکا تھا مگر یہ تجربہ شاید نیا تھا۔ جمعہ کا پُر رونق اور بابرکت دن ہونے کے باوجود ظہر کے وقت مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو لوگ تھے ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو عمر رسیدہ یا ریٹائرڈ تھے۔ بچے بھی نہ ہونے کے برابر نظر آئے۔ یوسف جس جوش اور جذبے سے اپنے فرائض سنبھالنے آیا تھا، وہ بس کچھ روز کے بعد اب ماند پڑنے لگا تھا۔ کیونکہ یہاں کسی کو بھی مسجد یا اس سے متعلقہ امور میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ سوچ کر یہاں آیا تھا، لگتا تھا اب کچھ نہیں کر پائے گا اور یہی بات اب اندر ہی اندر اسے پریشان کر رہی تھی۔

ہم تو اس عہد میں زندہ ہیں جہاں پر یا ربّ!
لوگ روزی کے لیے ربّ کو بھول جاتے ہیں

رزق کے لیے دن رات بھاگ دوڑ کرنے والی اشرف المخلوقات، رازق کو یکسر بھولے اور نظر انداز کیے بیٹھی تھی۔ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کرنے والے حضرت انسان خدا کی طرف سے حی علی الفلاح یعنی آؤ کامیابی کی طرف کی پکار سن کر سنی اَن سنی کر جاتے ہیں اور اس کے

باوجود یہ بھی دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ سخت محنت کر رہے ہیں مگر پھر بھی ''کامیابی'' نہیں ملتی۔ یہی باتیں سوچ سوچ کر اس کا دل شکستہ ہو چلا تھا۔ جبھی اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی، اذان دینے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ سو اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ کچھ فاصلے پر بچوں کے کھیل کود کے لیے ہی مخصوص کی گئی جگہ پر بچے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ بھی ان کے پاس جا پہنچا۔ گو کہ ان میں سے کسی نے بھی ابھی اس سے قرآن پڑھنا نہیں شروع کیا تھا مگر پھر بھی اس کے آنے پر اپنے تئیں با ادب دکھائی دینے کے لیے کھیل روک کر کھڑے ہو گئے۔ چند بچوں نے بڑی برق رفتاری سے اسے سلام بھی کر ڈالا تا کہ بجائے اس کے کہ وہ کچھ دیر مزید کھڑا رہے اور پھر نماز قرآن پڑھنے پر لیکچر دینے لگے، جلدی جلدی سلام کا جواب دے کر چلتا بنے۔ مگر اس وقت بچوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سلام کا جواب دینے کے بعد مسکراتے ہوئے اس نے بھی ان سب کے ساتھ کھیل میں شامل ہونے کی درخواست کر ڈالی۔

''مولوی صاحب! آپ..... آئی مین آپ ہمارے ساتھ کھیلیں گے؟'' ہادی نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا تو ساتھ ہی تائید میں دوسرے بچوں کے بھی سر ہلنے لگے۔

''کیوں..... کیا آپ کو اچھا نہیں لگے گا، میرے ساتھ کھیلنا؟''

''لیکن جو مولوی صاحب ہوتے ہیں، وہ تو گیم نہیں کھیلتے نا۔'' ہادی کے بجائے شمعون نے بھی اپنے ذہن کی اُلجھن کا اظہار بڑی معصومیت سے کیا تو یوسف کو بے اختیار اس پھولی گالوں والے بچے پر پیار آ گیا۔

''اچھا؟..... لیکن میں تو کھیلتا ہوں۔'' اُسی کی طرح آنکھوں میں حیرت سموئے یوسف نے بھی جواب دیا تو اب بال ہاتھ میں لیے تیسرا بچہ بول اُٹھا۔

''تو کیا آپ مولوی صاحب نہیں ہیں؟''

''بیٹا! کیا مولوی صاحب انسان نہیں ہوتے؟''

''نہیں نا۔ وہ تو صرف مولوی صاحب ہوتے ہیں۔'' بچے ابھی تک مولوی صاحب کا تصور خیالات میں تھامے کھڑے تھے اور یوسف کی مسکراہٹ ان کی باتوں سے گہری ہوتی چلی گئی۔

''ہوں.....'' چند لمحے یوسف نے کچھ سوچا اور پھر بولا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے صرف دوست بن جائیں؟''

اُس نے دوستی کی آفر کرتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ بڑھایا، جس پر بچوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہوئے اوکے کرنے کے بعد اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اوپر تلے اپنے ہاتھ رکھنے شروع کر دیئے۔

''ہادی! سونے جا رہے ہو؟'' لاؤنج میں بیٹھ کر بزنس نیوز سنتے منیب نے ہادی کو پکارا تو دودھ پی کر منہ صاف کرتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف جاتا ہادی رُک گیا۔

''جی پاپا! ابھی مِلک پیا ہے نا۔ اب برش کرنے جا رہا ہوں، اس کے بعد سو جاؤں گا۔''

''اچھا ذرا ادھر تو آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔'' منیب کے بلانے پر ہادی خوشی خوشی اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ نوشی بھی اپنے اور منیب کے لیے گرما گرم کافی لے کر وہیں آ بیٹھی۔

''زیادہ سے زیادہ کھانا کھایا کرو۔ پتہ ہے نا اس بیئر (بھالو) سے زیادہ ہیلدی ہونا ہے ہمارے بیٹے نے۔'' اس کے نائٹ ڈریس پر بنے خوب صورت اور گپلو سے چند بھالوؤں میں سے ایک پر اُنگلی رکھتے ہوئے منیب نے جیسے اُسے ٹارگٹ دیا تھا۔

''جی پاپا! ہوپ فلی، اس سے بھی زیادہ پاورفل بنوں گا میں۔''

''ویری گڈ..... یہ ہوئی نا بات۔'' لاڈ سے اس کے بالوں کو بگاڑتے ہوئے منیب نے کہا تو نوشی بھی اس کا پیار دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

''ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ آج سب بچے مولوی صاحب کے پاس اتنی دیر تک کیوں کھڑے رہے؟ کیا کہہ رہے تھے وہ؟'' مولوی صاحب کے ذکر پر نوشی نے بھی اپنی تمام تر توجہ ہادی کی طرف مبذول کرتے ہوئے سامنے رکھے ریموٹ سے ٹی وی میوٹ کیا اور پوری دلچسپی سے ہادی کی آواز سننے لگی۔

''وہ..... ارے ہاں پاپا! وہ ہم سے فرینڈ شپ کر کے ہمارے ساتھ کھیلنے آئے تھے۔''

''کھیلنے.....؟'' منیب نے حیرانی سے ایک بار پھر اسی کے الفاظ کے ذریعے تصدیق چاہی تھی۔ نوشی نے بھی اس غیر متوقع جواب پر آنکھیں سکیڑ لیں۔

''جی پاپا! ہم نے انہیں سمجھایا بھی تھا کہ وہ تو مولوی صاحب ہیں اور مولوی صاحب کو تو نہیں کھیلنا چاہئے نا۔ مگر وہ سمجھے ہی نہیں۔''

''پھر..... پھر کیا ہوا؟'' نوشی نے اُسے رکتے دیکھ کر سوال کیا تاکہ بات کی تفصیل جان سکے۔

''اتنی دیر میں تو کھیلنے کا ٹائم بھی ختم ہو گیا اور پھر وہ کہنے لگے کہ اب انہوں نے اذان دینی ہے، اس لیے صرف دوستی ہی کی اور بس۔'' پُرسوچ انداز میں سوچتے ہوئے نوشی اور منیب کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔

''پاپا! کیا آپ نے بھی دوستی کرنی ہے مولوی صاحب سے؟'' ہادی کے معصوم سے سوال پر منیب کو بات بدلنا پڑی۔

''اچھا وہ بھی کر لیں گے۔ آپ جا کر برش کرو اور سو جاؤ۔''

''اوکے پاپا!'' اچھے بچوں کی طرح بغیر کسی سوال جواب کے اس نے فوراً ہی اوکے کہا اور بیڈروم میں

چلا آیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد منیب آخر بول ہی پڑا۔

''یار! یہ آخر مولوی صاحب کو ہے کیا؟..... کچھ عجیب سے نہیں لگتے؟'' دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے اس نے نوشی سے رائے مانگی۔

''ہاں لگتے تو ہیں۔ اور باقی لوگوں کا بھی یہی خیال ہے۔''

''اب انہیں کوئی سمجھائے کہ بھلے آدمی! مسجد دیکھو اور مسجد کے کام۔ بچوں سے کھیلنے یا ان سے آ کر دوستی کرنے کا کیا مقصد؟''

''تو اور کیا۔ بلکہ ہما تو بتا رہی تھی کہ انہوں نے بچوں کو گھر گھر جا کر قرآن پاک پڑھانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔''

''انکار کر دیا ہے..... لیکن کیوں؟'' منیب کی پیشانی پر بل اُبھرے۔

''اُن کا خیال ہے کہ بچے مسجد میں آ کر پڑھیں تو زیادہ بہتر ہے۔''

''اوہو..... لیکن بچے تو مسجد جا کر صرف ٹائم ہی ضائع کریں گے اور بس۔''

''ہوں.....'' نوشی نے کپ کے کناروں پر اُنگلی پھیرتے ہوئے ہنکارا بھر کر اس کی بات کی تائید کی۔

''گھر میں تو پندرہ بیس منٹ میں سپارے کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ مگر وہاں گھنٹہ بھر تو پھر کہیں نہیں گیا نا۔''

''ہاں۔ بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔''

''سوچتے ہیں۔ ایک دو اور لوگوں سے بھی بات کر کے دیکھتے ہیں، ان کا کیا خیال ہے، پھر کرتے ہیں کچھ۔'' منیب نے بات ختم کرنے کے ساتھ ہی کپ ٹیبل پر رکھا اور خود صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

❀---❀---❀

چاشت کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآن ختم کرتے ہی یوسف کو ہلکی سی اونگھ آ گئی تھی۔ یوں بھی فجر کے وقت اُٹھنے سے اس وقت عموماً جسم میں سستی آ ہی جاتی ہے، سو آنکھ کھلنے پر وضو کرنے کے بعد وہ مسجد میں چلا آیا تھا۔ دریاں جھاڑ کر ایک طرف رکھیں اور جھاڑو ہاتھ میں لیے صفائی کر ہی رہا تھا کہ محلے کے دو تین افراد اندر داخل ہوئے اور مصافحہ کرنے کے بعد اپنا مقصدِ آمد بیان کیا۔

''آپ کی بات بجا ضرور ہے لیکن پھر بھی معذرت چاہتا ہوں کہ میں بچوں کو پڑھانے کے لیے فرداً فرداً سب کے گھر جانے سے قاصر ہوں۔ ہاں البتہ جو بھی بچہ مسجد میں آ کر پڑھنا چاہے، اس کے لیے میں چوبیس گھنٹے حاضر ہوں۔''

''مولوی صاحب! بچے اسکول سے تھکے ہارے آتے ہیں۔ پھر کم از کم گھنٹہ بھر اُنہیں مسجد میں بٹھا دینا کہاں کا انصاف ہے؟''

''جناب یہی بات کیا آپ نے کبھی اسکول ایڈمنسٹریٹر سے بھی کی ہے؟'' سوال کے بدلے پھر سوال لوٹایا گیا تھا۔

''لیکن اسکول والوں کا تو ایک مخصوص وقت مقرر ہے نا، اسی.....''

''تو پھر مذہب کے لیے بھی مقرر کرنا چاہئے نا۔''

''آپ خوامخواہ ضد میں آ کر ہم سب کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ پہلے بھی تو بچے گھر میں ہی پڑھتے رہے ہیں۔ پھر سردی گرمی میں بچے مسجد تک کیسے آئیں گے؟'' بچوں کے سکون و آرام اور سہولت کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ کسی بھی طور انہیں گھر سے مسجد بھیجنے پر تیار نظر نہیں آ رہے تھے۔

''آپ ایک مرتبہ انہیں بھیج کر تو دیکھیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ وہ بڑے شوق سے مسجد آیا کریں گے۔'' اسے اپنی بات پر قائم دیکھ کر سب کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا اور پھر کندھ اچکا کر بے دلی سے مصافحہ کرتے ہوئے اجازت لے کر مسجد سے رخصت ہو گئے۔

❀---❀---❀

''رخسانہ! اتنی دیر؟ یہ کوئی وقت ہے کسی کے گھر آ کر کام کرنے کا؟''

شرمندہ شرمندہ سی رخسانہ کو چوروں کی طرح گھر کے اندر آ کر دہلیز پر جوتیاں اُتار کر اندر بڑھتے دیکھ کر نوشی نے اسے وہیں روک لیا۔

''معافی چاہتی ہوں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ آج دیر ہوئی کیوں؟ پہلے کسی اور گھر میں چلی گئی تھیں کیا کام کرنے؟'

''نہیں باجی! دراصل گھر سے ہی نکلنے میں دیر ہو گئی تھی ذرا۔''

''وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں دیر ہوئی؟ ایک تو تم بولتی بہت کم ہو۔ جتنا پوچھو بس اس کا مختصر سا جواب اور بس۔'' نوشی چاہتی تھی کہ رخسانہ بھی اسے اسی کی طرح تفصیلاً جواب دے مگر یہ بھی جانتی تھی کہ وہ فطرتاً کم گو تو تھی ہی مگر عادتاً بھی کام والے گھروں میں زیادہ بولنے سے پرہیز کرتی۔ مبادا ایک گھر کی بات دوسرے گھر میں منہ سے نہ نکل جائے۔ اور اُس کی اس عادت کی وجہ سے جن گھروں میں وہ کام کیا کرتی، وہاں اس پر بے پناہ اعتماد کیا جاتا اور اس کی یہی عادت اسے دوسری کام والیوں سے منفرد اور ممتاز بنائے رکھتی۔

''وہ بیٹے نے مولوی صاحب کی طرف جانا تھا، انٹرنیٹ کا کنکشن لگانے، تو اسے گھر سے کچھ چیزیں نہیں مل رہی تھیں۔ بس اس کے ساتھ وہی ڈھونڈنے میں ذرا دیر ہو گئی۔'' اس دفعہ نوشی کی تسلی اور اطمینان کے لیے رخسانہ نے مکمل تفصیل کے ساتھ جواب دیا اور یوں دیا کہ نوشی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''انٹرنیٹ کنکشن.....مولوی صاحب کو چاہئے تھا؟''

''جی باجی! یہ مولوی صاحب خیر سے ہیں تو اسی دنیا کے نا؟''

''ارے ان کی تو ہر ادا ہی نرالی ہے۔ ہر بات ہی انوکھی۔ آخر یہ چاہتے کیا ہیں؟''

نوشی کے ردِعمل پر رخسانہ خاموشی کے ساتھ بس کھڑی رہی۔ اس معاملے میں اس نے اپنی رائے محفوظ رکھی تھی۔

''باجی! میں کام شروع کر دوں؟''

''ہاں ہاں.....جاؤ۔''

اُکتائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے رخسانہ کو جانے کا کہا اور خود مولوی صاحب کے بارے میں سوچنے لگی جواب اس کے نزدیک ایک پراسرار انسان بنتے جا رہے تھے۔

❀---❀---❀

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ہما؟.....بھلا تم نے شمعون کو مسجد بھیجنے کے لیے بھائی کے کہنے پر کیسے حامی بھر لی؟'' شاید آج نوشی کے لیے یہ دن صرف حیران ہونے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔

''ارے یار! بہت بحث ہوئی ہے اس بات پر مسجد میں۔ مگر وہ مولوی بھی اپنی بات سے ہٹنے کو تیار نہیں ہے اور میں نے ایک دفعہ کہا تھا نا کہ مولویوں اور وکیلوں کو قائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی نکتہ پھر بھی نکال ہی لاتے ہیں۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے، کچھ عرصہ بعد پڑھ لیں گے قرآن پاک۔ تم خود سوچو اتنی سخت گرمی میں گھر میں تو ہر کمرے میں اے سی موجود ہے، مگر گھر سے باہر اتنی گرمی میں بچوں کو آخر کیوں بھیجیں؟''

''مجھے بھی اسی بات کی ٹینشن ہے۔ اسکول میں بھی مکمل ایئر کنڈیشنڈ، گھر میں بھی۔ اور وہاں مسجد میں اس قدر گرمی میں جانا بھلا کہاں کی عقلمندی ہے؟'' نوشی جیسے ہر صورت ہادی کے ساتھ ساتھ شمعون کو بھی بچا لینا چاہتی تھی، اگر اگلے ہی لمحے ہما کے مصلحت آمیز جواب نے اس کے جوش پر بھی جیسے ٹھنڈا پانی ڈال کر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

''میرا تو یہی خیال تھا۔ مگر رازی، محمود صاحب کی باتوں میں آ گئے۔ کہتے ہیں محمود صاحب کی بات اب کیسے ٹال دوں؟ تمہیں تو پتہ ہے نا، ایکسائز ڈیپارٹمنٹ میں رازی کے ہیڈ تھے اور ریٹائرمنٹ سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اب تک ہر معاملے میں ان کی ہیلپ کرتے ہوئے بہترین طریقے سے گائیڈ بھی کرتے ہیں۔''

''اوہ.....تو یہ بات ہے۔''

''ہاں یار! شروع کے چند دن تو بھیجنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے ہی جانا نہیں چاہتے تو کیسے زبردستی کریں۔'' ہما نے پورا لائحہ عمل ذہن میں ترتیب دے رکھا تھا جس سے نوشی کے حوصلے کو بھی کچھ تقویت ملی تھی۔

''میں تو کہتی ہوں تم بھی تقریباً ایک ہفتہ بھیج دو ہادی کو۔ خوامخواہ بھلا نظروں میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بعد نہ تو میں بھیجوں گی، نہ تم۔ جب بڑے ہوں گے اور کالج وغیرہ جانے لگیں گے تو دیکھا جائے گا۔ ابھی سے اتنا بوجھ ڈالنے کا کیا فائدہ؟''

''اچھا..... چلو ٹھیک ہے۔'' نوشی نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

''لیکن وہاں تو یو پی ایس بھی نہیں ہے یار! نہ ہی جنریٹر کا کوئی انتظام ہے۔ گھروں میں تو جنریٹر کی بھی سہولت ہے نا۔ وہاں اتنی گرمی میں جب لائٹ جائے گی پھر.....؟'' ماں کی ممتا ابھی تک خدشات میں گھری کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آ رہی تھی۔

''یہ سب تو مجھے اور باقی گھروں کو بھی معلوم ہے۔ لیکن کہا نا کہ مجبوری ہے، بچوں کو مسجد بھیجنا۔ اب کیا کر سکتے ہیں؟'' ہما کا لہجہ بھی تفکر کی تصویر بنا تھا۔

''ویسے بھی اچھا ہے۔ اس طرح بچے دو دن بعد ہی کانوں کو ہاتھ لگا لیں گے اور ہم پر بھی الزام نہیں آئے گا۔''

''ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ چلو صحیح ہے۔ میں منیب کو ساری صورتِ حال بتاتی ہوں۔ پھر اگر وہ بھی ایگری ہوئے تو ڈرائیور چھوڑ آئے گا مسجد تک۔''

''ہاں یہ صحیح ہے۔ تم بھائی سے بات کر لو۔''

❀---❀---❀

محمود صاحب کے مطابق آج سے بچے مسجد آیا کریں گے اور یہ خبر یوسف کے جوش اور خوشی کو دیدنی کیے دے رہی تھی۔

عصر کی جماعت کروانے کے بعد وہیں مسجد میں بیٹھ کر بچوں کا انتظار کرنے کے بجائے وہ اٹھا اور کپڑا لے کر ٹیوب لائٹس صاف کرنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ گاڑیوں کے رُکنے کی آوازیں بالکل نزدیک سے ہی آنا شروع ہوئیں اور کچھ ہی دیر میں چند بچے چہرے پر حیرت انگیز تاثرات لیے اس کے سامنے تھے۔

''السلام علیکم۔'' سیڑھی کو مسجد کے صحن میں دیوار کے سہارے کھڑا کر کے وہ انہیں اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ جہاں اب وہ حیرت سے مسجد کے در و دیوار کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کے سوال کا جواب دینے

کے بعد آخر ایک بچے نے چپ کا روزہ توڑا۔

''یہ آپ کیوں صاف کر رہے تھے لائٹس؟''

''ارے کیوں کا کیا مطلب ہے بیٹا؟ یہ تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے نا۔''

''نبی.....وہ کون؟''

''میرا مطلب تھا ہمارے Prophet۔ اب سمجھ آیا؟''

بغیر بولے محض گردن ہلا کر اس کی بات کا جواب دیا گیا۔

''لیکن مجھے تو بہت گرمی لگ رہی ہے۔'' ہادی نے ٹی شرٹ کو خود سے دُور کر کے گرمی کا اظہار کیا تو باقی بچوں کو بھی یاد آ گیا کہ اس وقت وہ سب گرمی میں کھڑے ہیں۔ یہاں تک کہ پنکھے بھی بند ہیں۔''

''کیا واقعی گرمی لگ رہی ہے؟'' یوسف نے فرداً فرداً سب کی طرف دیکھا اور اثبات میں ہلتی گردن پر مسکراتے ہوئے سوئچ بورڈ کے نزدیک جا کر پنکھوں کے بٹن آن کر دیئے۔ اور ایسا اس نے جان بوجھ کر مصلحتاً سوچ کے تحت صرف اس لیے کیا تھا کہ بچوں کو گرمی لگنے پر پنکھے آن کر کے اس شدت کو کم کیا جائے اور انہیں احساس ہو کہ انہیں گرمی سے بچانے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ پنکھے چل رہے ہوتے اور ان کی طرف سے گرمی کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لیے وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

آج اس کا بچوں کے ساتھ مسجد میں پہلا روز تھا۔ ڈرائیور نے مقررہ وقت پر بچوں کو لینے بھی آنا تھا۔ اور اسے آج کا دن اس انداز میں گزارنا تھا کہ وہ سب اگلے روز بھی آئیں۔ اسی لیے ان سب کو دائرے میں بٹھانے کے بعد وہ خود بھی ان کے ساتھ ہی دری پر بیٹھ گیا۔ اور سب سے پہلے بچوں کو اپنا تعارف کروانے کا کہا تا کہ ان کی ذہنی سطح کا بھی اندازہ ہو سکے۔

''مولوی صاحب! مما کہہ رہی تھیں کہ آپ کو اور کوئی کام کاج نہیں ہے۔ اور اپنی مہینے کی اچھی سیلری بنانے کے لیے بچوں کو مسجد میں اکٹھا کر رہے ہیں۔'' اپنا تعارف کروانے کے فوراً بعد شمعون نے گھر پر ہونے والی بات چیت بھی اس کے سامنے دہرائی تو یوسف کے صاف چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''ویسے آپ کیا جاب کرتے ہیں؟''

''میری نوکری اللہ کے گھر میں ہے اور سیلری میں مجھے صرف اپنے مالک یعنی اللہ کی رضا کی ضرورت ہے۔''

''ہماری کام والی تو ہمارے گھر میں کام کر کے مما سے بہت سارے پیسے لیتی ہے۔ اور آپ بھی تو اللہ کے گھر کے سارے کام کرتے ہیں، پھر پیسے بھی تو لیتے ہوں گے۔'' ہادی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کوئی نوکری بغیر پیسوں کے بھی کرتا ہے کیا؟

''اگر آپ اپنے گھر میں کوئی کام کرو گے تو کیا مما آپ کو پیسے دیں گی؟'' یوسف نے چمکتی آنکھوں کو

غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' ہادی نے بے پروائی سے کہا۔ ''لیکن ہاں، وہ مجھ سے happy ضرور ہوں گی۔''

''بس اسی طرح اللہ بھی تو ہم سے بہت زیادہ happy ہوتے ہیں نا، اور پیسے، وہ تو انہوں نے ایڈوانس میں ہی دے دیئے ہیں مجھے۔''

''جب اللہ تعالیٰ ہم سے بہت زیادہ happy ہوتے ہیں تو کیا بہت ساری چیزیں دیتے ہیں؟'' ننھے ذہنوں میں ایک کے بعد ایک سوالات جنم لے رہے تھے، اور ان کا یہ رسپانس یوسف کے لیے انتہائی خوشی کا باعث تھا۔

''ہاں بالکل..... آف کورس۔''

''لیکن اللہ تعالیٰ happy کیسے ہوتے ہیں؟ مجھے بہت ساری چیزیں چاہئیں مگر مما کہتی ہیں اب سب کچھ exams کے بعد ملے گا۔'' نوران نے معصومیت سے کہا تو باقی سب کو بھی اپنی ادھوری خواہشیں یاد آنے لگیں۔

''ہاں۔ بار بار مما پاپا کو remind کروانے سے بہتر ہے نا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ہی happy کر لیں۔'' ارحم نے منہ بناتے ہوئے سب کو گویا تجویز دی جو کم و بیش سبھی کے دل کو لگی بھی۔

''بتائیں نا..... کیسے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ happy؟''

''یہ پوچھو بیٹا! کہ اللہ تعالیٰ کب happy نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ تو ہم سے ہر قت خوش رہتے ہیں۔''

''really؟'' ہادی کو حیرت ہوئی تھی۔ ''کیا وہ ہم سے ہر وقت ہی خوش رہتے ہیں؟ تو پھر ناراض کب ہوتے ہیں؟''

''نہیں بیٹا! اللہ تعالیٰ ہم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوتے۔'' بچوں کے پُرتجسّس چہرے دیکھ کر اسے اس بات کا اطمینان ضرور ہو رہا تھا کہ بچے اس کی بات پورے دھیان اور توجہ سے سن رہے ہیں۔

''لیکن ہاں کبھی کبھار کم خوش ضرور ہو جاتے ہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''کم خوش کس وقت ہوتے ہیں؟'' پھر سے سوال آیا۔

''جب ہم ان کی بات نہ مانیں۔''

''لیکن ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے کچھ کہا ہی نہیں۔ نہ ہم نے کبھی کوئی بات سنی ہے ان کی۔'' بچوں کے چہروں پر لحہ بھر میں پریشانی ظاہر ہونے لگی تھی۔

''پتہ ہے بچو!..... اللہ تعالیٰ نے وہ ساری باتیں اپنی بُک یعنی قرآن پاک میں ہمیں بتائی ہیں۔''

''لیکن ہم نے تو کبھی بھی قرآن پاک والی بُک نہیں پڑھی۔'' اب ایک اور فکر نے بچوں کو آن گھیرا تھا۔

''پہلے والے مولوی صاحب نے ہمیں تھوڑا سا پڑھایا تو تھا لیکن وہ لینگویج ..... ہاں عربیک ناں.....

وہ تو ہمیں سمجھ ہی نہیں آتی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی باتیں کیسے سمجھیں گے؟'' ایک ہی جست میں ان کے اذہان کو درست سمت موڑنے کے بجائے وہ بالکل انہی کی ذہنی سطح پر بات کرتے ہوئے قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا تھا۔

''کیا اللہ تعالیٰ صرف عربیک میں باتیں کرتے ہیں؟'' ننھی سی ناک چڑھاتے ہوئے ارحم نے پوچھا۔

''نہیں تو..... اللہ تعالیٰ تو ہر اس زبان میں ہم سے بات کرتے ہیں جو ہمارا دل اور ذہن سمجھتا ہے۔''

''تھینکس گاڈ۔'' یوسف کے جواب پر ہادی نے جیسے سکون کا سانس لیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ باتیں سمجھ آئیں گی تبھی تو ہم انہیں follow کریں گے نا۔'' شمعون نے کہا تو تائید میں سر ہلاتے ہوئے یوسف مسکرا دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہہ پاتا، گاڑی کے ہارن کی آواز نے احساس دلایا کہ آج کے دن میں مختص کیا گیا مذہب کا ''کوٹہ'' بس اتنا ہی تھا اور جواب ختم ہوا چاہتا ہے۔ جبھی یوسف نے سب بچوں کے چہروں پر شفقت کی نظر ڈالتے ہوئے بات سمیٹی۔

''کل سے اِن شاء اللہ میں آپ سب کو قرآن پاک پڑھاؤں گا بھی اور اللہ تعالیٰ کی فرمائی ہوئی باتیں سکھاؤں گا بھی۔ اور ہاں یہی نہیں بلکہ ایک بات اور..... اور وہ یہ کہ.....'' چند لمحے رُک کر یوسف نے ان کے سسپنس کو مزید بڑھنے دیا اور پھر بولا۔

''I will also tell you a story everyday۔''

(میں روز آپ کو کہانی بھی سنایا کروں گا)

''آپ..... آپ کو انگلش بھی آتی ہے؟''

''کیوں..... کیا مجھے انگلش نہیں آنی چاہئے؟'' ان کی حیرت کا پس منظر اور ان کا ممکنہ جواب جاننے کے باوجود اس نے سوال کیا تو جواب دینے میں بچے جز بز سے محسوس ہوئے۔ آخر کار ہادی سب کی نمائندگی کرتے ہوئے بول ہی پڑا۔

''actually آپ تو مولوی صاحب ہیں نا۔ اور مولوی صاحب کا بھلا انگلش سے کیا کام؟''

ہادی کی بات پر یوسف کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ مگر دوسرے بچوں کے ڈرائیور کے بھی آ جانے پر محفل برخاست ہوئی اور سب ایک انوکھے تجربے کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

❀---❀---❀

''کیوں بھئی۔ آج کا دن کیسا گزرا مسجد میں؟''

''بہت ڈیفرنٹ پاپا!'' ہادی نے کانٹے میں پاستہ پروتے ہوئے جواب دیا۔

''رئیلی؟..... اچھا مگر وہ کیسے؟'' منیب دراصل جاننا چاہتا تھا کہ آخر آج مسجد جانے کے بعد کیا وہ کل

دوبارہ جانا چاہتا ہے یا نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نوشی کی بھی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ بڑے پُر جوش انداز میں جلدی جلدی پاستہ چبانے کے بعد تفصیلی جواب دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

''فرسٹ آف آل پاپا! وہاں جو مولوی صاحب ہیں نا وہ بہت ہی اچھے ہیں۔ اور انہوں نے ہمیں کچھ پڑھایا بھی نہیں۔''

''پڑھایا ہی نہیں؟..... تو تم لوگ کیا کرتے رہے پورا گھنٹہ؟'' نوشی نے حیرت سے نوالہ منہ میں لے جانے کے بجائے ہاتھ میں ہی رکھ کر پہلے پوچھا۔

''ماما! وہ ہمارے فرینڈ بن گئے ہیں نا، تو ہم سب آپس میں باتیں کرتے رہے۔''

منیب نے بھی حیران ہو کر پہلے نوشی کو دیکھا اور پھر ہادی کو۔

''وہ بہت اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ انگلش بھی بولتے ہیں۔ اور کل تو ہمیں اسٹوری بھی سنائیں گے۔'' ہادی کے سامنے کسی بھی طرح کی رائے دینے کے بجائے نوشی اور منیب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بیزاری سے دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

❀---❀---❀

''حیرت ہے یار! میں تو سمجھ رہی تھی کہ ایک دن جا کر بچے دوسرے ہی دن انکار کر دیں گے مگر.....''

ہما نے خلافِ توقع بچوں کو اگلے روز بھی مسجد جانے کے لیے بخوشی آمادہ دیکھا تو فوراً نوشی کو فون ملا کر اپنا دُکھ شیئر کر ڈالا۔

''یار! مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔'' نوشی نے لہجے میں پراسراریت گھولتے ہوئے کہا تو ہما کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

''کیا مطلب؟..... میں سمجھی نہیں۔''

''اب اس میں نہ سمجھنے والی کیا بات ہے؟ کیا کبھی تم نے سنا ہے کہ کوئی مولوی یوں روانی سے انگلی بولتا ہو یا بچوں کو یوں مسجد میں کہانیاں سناتا ہو، انٹرنیٹ یوز کرتا ہو۔ اور پھر اتنا نخرہ کہ گھروں میں آنے کے بجائے خود بچوں کو مسجد میں بلوائے۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ باتیں تو ساری ہی عجیب و غریب ہیں۔'' نوشی کے شکوک و شبہات پر ہما نے بھی گویا دستخط کر دیے تھے۔

''آج کل کا دور بھی پتہ ہے نا کیسا ہے؟ سچی ڈر ہی لگتا ہے مجھے تو۔''

''چلو خیر ہے کوئی بات نہیں۔ ایک دن گزر گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تین چار دن اور بھیجیں گے پھر کہہ دیں گے بچے ہی نہیں مانتے۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔اچھا وہ میرا خیال ہے پیسے بھی آج کل میں دے دیئے جائیں۔ کیونکہ اس کے بعد تو بچے ظاہر ہے جائیں گے نہیں مسجد۔'' نوشی کے اختیار میں ہوتا تو ابھی کے ابھی مولوی صاحب کا حساب چکتا کر دیتی۔

''ہاں دو چار سو دے بھیجیں گے ڈرائیور کے ہاتھ، کیا خیال ہے؟'' ہما نے تائید چاہی۔

''ہاں تو اور کیا۔اب ہم خود تو جانے سے رہے۔''

''ارے جانے سے یاد آیا، شمعون کی اسکول فیس کے لیے بارہ ہزار سائیڈ پر الگ کر کے رکھے تھے۔ میرا خیال ہے کل جمع کروا آؤں، ورنہ میں تو شاید انہیں بھی شاپنگ میں لگا دوں۔''

''ہاں ہاں تم تو ویسے بھی محلے کی وزیر خارجہ ہو نا۔'' نوشی کی بات پر دونوں طرف چہرے پر مسکراہٹیں بکھرنے لگی تھیں۔

❀---❀---❀

اور پھر حیرت انگیز اور غیر متوقع طور پر بچوں کو مسجد جانے کا انتظار رہنے لگا۔ یوسف نے روایتی طور پر محض قرآن پاک پڑھانے کے بجائے چند دوسری ایکٹیویٹیز بھی متعارف کروائیں جو کہ بچوں کے لیے گویا مقناطیسی کشش ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ ڈرائیورز کو کچھ دیر سے آنے کے لیے کہا جانے لگا۔

انتہائی دلچسپ اور متاثر کن انداز اور سادہ فہم الفاظ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، اُن کی سیرت اور معجزات کا ذکر تو جیسے بچوں کو مسحور کر کے رکھ دیتا۔ مختلف انبیاء کرام کے قصے، کہانیوں کی صورت میں بچوں کو گویا جکڑے رکھتے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے ننھے اور متجسس اذہان کو انہی جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اتنی خوب صورتی سے چھوٹی چھوٹی باتیں ذہن نشین کروائی جاتیں کہ انہیں اس بات کا احساس تک نہ ہوتا کہ یہ سب ان کی دینی تعلیمات کا حصہ ہیں۔

یہ سب تو پھر بچوں کا وقتی جوش سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا، مگر مسئلہ تب پیدا ہوا جب قرآن پاک پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کی حاضری کے رجسٹر میں ایک خانے کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔

''مولوی صاحب! یہ نیا بلاک کیوں بنا رہے ہیں اِدھر؟'' ہادی نے یوسف کو اسکیل سے لائن ڈرا کرتے دیکھ کر سوال کیا۔

''یہاں پر اس بچے کے نام کے آگے ایک گولڈن اسٹار بنا کرے گا جس کے گھر سے کوئی بھی نماز پڑھنے آئے گا۔''

''واٹ.....؟'' سب بچوں نے مل کر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یس.....!'' وہ مسکرایا۔

''لیکن ہمارے پاپا تو آتے ہی فائیو اوکلاک پر ہیں نا۔'' نوران دُور کی کوڑی لایا تھا۔

''نو میٹر..... پھر بھی تین نمازوں کا ٹائم تو بچتا ہے نا۔''

''اور اگر کبھی وہ فریش نہ ہوں تو؟..... کیا میرے آنے سے بھی اسٹار ملے گا؟'' خود ہی سوال اور خود ہی جواب کرتے ہوئے ہادی نے یوسف سے تصدیق چاہی۔

''آف کورس بیٹا! کیوں نہیں..... آپ بھی آؤ گے تو اسٹار تو ملے گا ہی نا۔''

یوسف کی بات پر سبھی بچوں کے دل میں اسٹارز کے معاملے میں سبقت لے جانے کا خیال اُبھرا تھا۔

❀---❀---❀

''بیٹا! ہمارا معاشرہ مرغی کے ڈربے سے کم نہیں ہے۔ جس طرح ڈربے میں موجود مرغیاں نئی آنے والی مرغی کو برداشت نہ کرتے ہوئے اسے چونچیں مار مار کر زخمی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں نا، بالکل اسی طرح ہمارے یہاں بھی نئے آنے والے کے ساتھ کم و بیش یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ طاقتور نہ ہو۔'' عشاء کی نماز کی ادائیگی کے بعد گھر جانے کے بجائے محمود صاحب، یوسف کے ساتھ ہی اس کے گھر چلے آئے تھے۔

ان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان کے لیے گرم گرم کڑک سی بھاپ اُڑاتی چائے بنا کر کپ میں ڈالی اور ان کے ساتھ خود بھی بیٹھا ان کے مشاہدات اور تجربات کو غور سے سننے لگا۔

''تم نے یہاں بچوں کے مسجد آنے کی ایک بالکل نئی روایت قائم کی ہے ورنہ مرحوم قاری صاحب گھر گھر جا کر ہی پڑھایا کرتے تھے۔''

''محمود صاحب! قرآن پاک یا اور کسی بھی طرح کی دینی تعلیم دینے کے لیے مجھے گھر گھر جانے میں نہ تو عار ہے نہ شرم۔ بلکہ اگر میں نے اس طریقے سے انکار کیا ہے تو اس کی بھی ایک وجہ تھی۔'' چائے کی چسکی لیتے ہوئے محمود صاحب نے اس کی چمک دار آنکھوں میں ایک جوش اور عزم دیکھا تھا۔

''دراصل بچے ہمیشہ اس کام میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جو اجتماعی طور پر ہو رہا ہو اور میں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ بچے ہمارے مذہب کی گہرائی تک نہ سہی تو عمومی طور پر ضرور آ جائیں۔ اسی لیے آپ دیکھئے گا کہ اگر اللہ کی مدد رہی تو ایک ڈیڑھ سال میں یہ بچے اپنے بڑوں سے کہیں زیادہ اپنے ربّ سے نزدیک ہوں گے۔''

''اِن شاء اللہ بیٹا! کیوں نہیں۔ خدا تمہاری مدد کرنے والا ہے۔'' اس کا عزم خود محمود صاحب کے اندر ایک انجانی خوشی منتقل کر رہا تھا۔

''آپ کو پتہ ہے محمود صاحب! جب پہلے دن میں نے انہیں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

معجزات کے بارے میں بتایا تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور وہ مجھ سے مزید سوالات پوچھنے لگے۔ یہاں تک کہ اب ایک ہفتے کے دوران وہ کئی معجزات اور سیرت طیبہ کے بارے میں اتنی دلچسپی سے سنتے ہیں کہ ان میں سے کتنی ہی باتیں یقیناً ان کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہیں گی۔''

''سچ کہہ رہے ہو بیٹا! بلکہ میں تو کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ سپر مین، اسپائیڈر مین یا ہیری پوٹر وغیرہ کو آئیڈیلائز کرنے والے بچے اور پھر ان سے آگے کی نسلیں دجال کے فتنے کا سامنا کیسے کریں گی جو آسان سے بارش تک برسانے اور سمندر کی تہہ میں موجود مچھلیوں کو صرف ایک اشارے سے باہر بلانے پر اللہ کے حکم سے قدرت رکھتا ہوگا۔''

''اسی لیے تو بچوں کے ذہن کلیئر رکھنے اور انہیں مذہب کے قریب لانے کی ضرورت ہے۔ ان کے ننھے اذہان میں ربّ کریم کا تصور ''غفار'' یا ''قہار'' کے بجائے ''رحیم'' اور ''رحمٰن'' کے طور پر پختہ کیا جانا چاہیے۔'' یوسف نے محمود صاحب کے ہاتھ سے خالی پیالی لے کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تربیت تو بڑوں کی بھی ہونی چاہیے نا۔'' محمود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں۔ لیکن بڑوں تک پہنچنے کے لیے اگر بچوں کو سیڑھی بنایا جائے تو معاملہ زیادہ برق رفتاری سے حل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔'' محمود صاحب نے نظر بھر کر یوسف کے چمکتے چہرے کو دیکھا اور دل ہی دل میں اسے ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔

❀---❀---❀

''بابا!.....نہیں مجھے کچھ نہیں پتہ۔ آپ آج میرے ساتھ مسجد جائیں گے بس۔'' ہادی نے منہ پھلاتے ہوئے کہا تو نوشی نے بھی ازراہِ مذاق منیب کی طرف دیکھا۔

''یک نہ شد دو شد۔''

''بیٹا! فضول ضد مت کرو۔ اور دیکھو آپ تو وہاں قرآن پاک پڑھنے جاتے ہو نا۔ لیکن میں تو قرآن پاک پڑھ چکا ہوں۔'' منیب نے ہادی کو ٹالنا چاہا مگر ناکام رہا۔

''لیکن مولوی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ بے شک قرآن پاک ختم ہو جائے پھر بھی مسجد روز جانا چاہیے۔''

''اوہو! تو میں کوئی مولوی صاحب ہوں کیا؟'' ہادی کے مسلسل اور نہ ختم ہونے والے اصرار نے بالآخر منیب کو زچ کر دیا تھا۔

''لیکن آپ نماز تو پڑھ سکتے ہیں نا مسجد جا کر۔'' ہادی نے منہ بسورا تو نوشی، منیب کی مدد کو میدان میں اُتر آئی۔

''بیٹا! آپ کو پتہ ہے نا، پاپا تھک جاتے ہیں سارا دن کام کر کے۔ اس لیے اب تو انہیں ریسٹ کرنا چاہئے نا۔''

''maximum ٹوئنٹی منٹس تو لگتے ہیں صرف نماز میں۔ خوامخواہ عشاء تک آپ کا ویٹ کیا۔ پہلے پتہ ہوتا کہ آپ نہیں جائیں گے تو میں خود ہی چلا جاتا۔'' ہادی نے پریشانی سے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو منیب کو اس پر بے تحاشا پیار آیا۔

''خود چلا جاتا؟'' اس نے حیرت سے ہادی کو دیکھا جس کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں تھے۔

''جی پاپا!..... آپ خود ڈرائیور سے کہیں، مجھے مسجد چھوڑ آئے عشاء کے لیے..... یا پھر..... چلیں رہنے دیں۔ میں خود چلا جاتا ہوں۔''

''خود چلا جاتا ہوں اس وقت..... مگر کہاں؟'' نوشی جو دو دن کے لیے اسے مسجد بھیجنے سے کترا رہی تھی، اب اس کی مسجد سے یوں محبت دیکھ کر حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

''مسجد مما! اور کہاں؟ میں دوسرے فرینڈز کو بھی فون کر کے بلا لیتا ہوں نا۔'' اس سے پہلے کہ وہ فون کی طرف بڑھتا، منیب نے لاسٹ آپشن استعمال کرنے کا سوچا۔

''اچھا ایسا کیوں نہ کریں لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔ آئس کریم بھی کھائیں گے اور فریش بھی ہو جائیں گے۔''

''آپ مما کے ساتھ چلے جائیں پاپا! مجھے تو نماز کے لیے دیر ہو رہی ہے۔'' ابھی تک ناراض تاثرات لیے ہادی وضو کے لیے اُٹھنے لگا تو وہ دونوں بس حیران کھڑے اسے دیکھتے ہی رہے۔ یہ انداز یہ الفاظ کتنے اجنبی تھے ان کے لیے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ننھا ہادی آج انہیں بڑا بڑا لگنے لگا تھا۔

''میرا خیال ہے آپ چلے ہی جائیں ان کے ساتھ۔ رات کا وقت ہے۔ اکیلا کیسے جائے گا؟'' نوشی کے لہجے میں فکرمندی واضح نظر آ رہی تھی۔ خود منیب بھی اس کے آگے ذہنی طور پر ہتھیار ڈال چکا تھا۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اور چلو خیر ہے، بیس پچیس منٹ ہی تو لگیں گے مگر بچہ خوش ہو جائے گا اور واک بھی ہو جائے گی مسجد جاتے جاتے۔'' جس ربّ کریم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونے کو وہ جا رہا تھا اسے خوش کرنے کی نیت یا ارادے پر تو ویسے بھی گرد کی تہیں جم چکی تھیں۔ جبھی یہ بات تو اس کے خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ خوش تو دراصل وہ ذات ہو گی جو اپنے بندے کے نیک اعمال اور صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آنے کی منتظر رہتی ہے اور اس کے لوٹ آنے پر آغوش کشادہ کیے اپنی رحمت بھری پناہ سے یوں نوازتی اور اس کی سابقہ خطاؤں اور غلطیوں کو یوں درگزر کر کے اپنا بناتی ہے کہ بندے کو خود دیر سے لوٹنے پر شرمندگی اور ندامت ہونے لگتی ہے۔

''ہادی! رُکو بیٹا۔ میں بھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔'' وضو کرنے کے بعد ہادی لاؤنج میں آیا تو منیب نے اسے روک لیا۔

''اور ئیلی.....واؤ، مائی پاپا اِز گریٹ.....بیسٹ پاپا اِن دی ورلڈ۔'' ہادی فوراً آ کر اس کے گلے سے جھول گیا۔

نوشی نے بڑے مان سے مسکراتے ہوئے منیب کو دیکھا اور گردن کی ہلکی سی جنبش سے ہادی کی بات کی تائید کر دی۔

اب مجھے تو گولڈن اسٹارز ملیں گے۔''

''گولڈن اسٹارز؟.....مگر کہاں سے؟'' نوشی نے پوچھا۔

''مولوی صاحب نے کہا تھا، جس کے گھر سے جتنے لوگ مسجد نماز پڑھنے آئیں گے، اس بچے کو اتنے ہی گولڈن اسٹارز ملیں گے۔''

''یہ مولوی صاحب بھی نا.....'' منیب نے بیزاری سے کہا مگر نوشی نے آنکھ کے اشارے سے ہادی کی موجودگی کی طرف دھیان دلاتے ہوئے اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔

❀---❀---❀

یوسف آج بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ اس احساس کی چمک اس کے چہرے سے عیاں ہو کر اپنا آپ سب پر واضح کیے دے رہی تھی۔ جب سے وہ اس مسجد میں اپنے فرائض سنبھالنے آیا تھا، عشاء کی نماز کی ادائیگی کے لیے تو شاذ و نادر ہی لوگ مسجد کا رخ کرتے، مگر آج.....اس کا دل چاہ رہا تھا ایک ایک بچے کو اُٹھ کر گلے لگا لے جو خود تو آئے ہی تھے مگر ساتھ اپنے والدین کو بھی لائے تھے۔ اور ان سب کو اپنے والد صاحبان کو مسجد تک لانے میں کتنی مشقت کرنی پڑی ہوگی، اس بات کا بھی احساس اور قدر اسے بہت اچھی طرح تھی۔

ویسے یہ کیفیت صرف یوسف پر ہی طاری نہیں تھی۔ جو لوگ آج مسجد آئے تھے، سبھی کم و بیش کچھ انوکھا محسوس کر رہے تھے۔ کتنے ہی دنوں کے بعد وہ لوگ ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ ورنہ تو افطار پارٹی یا دوسرے اجتماعات میں ہی یوں وہ لوگ اکٹھے ہوا کرتے۔ مسجد سے نکلنے کے بعد ٹولیوں کی صورت میں کچھ دیر وہیں کھڑے سب آپس میں گپ شپ کرنے لگے تو بچوں کو بھی ایک ساتھ کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اسی دوران محمود صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بات چھیڑ دی۔

''بیٹا منیب! ہادی کے ٹیوٹر سے بات کی ہمارے پوتے کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے؟'

''جی محمود صاحب! کہہ رہے تھے، نیکسٹ وِیک سے آ جایا کریں گے۔''

''چلو یہ تو اچھا ہوا۔ اور فیس کیا ہے؟'' تمہید کے طور پر بات شروع کرنے کے بعد اب وہ اپنی اصل بات پر پہنچ چکے تھے۔ باقی سب بھی ان کی بات شروع ہوتے ہی خاموش کھڑے ان دونوں کا مکالمہ سن رہے تھے۔

''فیس..... ہادی کے تو ہم پانچ ہزار دیتے ہیں۔ اور آپ سے بھی آئی تھنک اتنے ہی لے گا۔''

''ہاں بالکل۔ اس سے کم تو کوئی مشکل سے ہی لے گا محمود صاحب! یہ ٹیچر بہت مناسب فیس لیتا ہے۔'' رازی نے بھی منیب کی تائید کی۔

''بیٹا! ایک ٹیوٹر کی پانچ ہزار جبکہ قرآن، ایمان اور آخرت کی تعلیم دینے والے کو پانچ سو بھی نہیں؟'' بات کے یوں اچانک رخ بدلنے پر منیب اور رازی کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی چونکے تھے۔

''کیا گھر سجا دینا اور خوش لباس ہونا ہی کافی ہوتا ہے چاہے منہ میں ایک لقمہ بھی نہ جائے؟''

''محمود صاحب! وہ.....'' رازی نے خجالت سے سر کھجایا۔

''بیٹا! یہ دنیاوی تعلیم میں نہیں کہتا کہ بچوں کو نہ دلواؤ، لیکن ہاں اتنا ضرور ہے کہ لباس اور زیبائش کے ساتھ انتہائی لازمی جز خوراک کا بھی تو خیال رکھو نا۔'' سامنے کھڑے سبھی لوگوں نے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا مگر محمود صاحب کا معاشرے میں باعزت مقام تھا اچھے برے وقت میں محلے کے ہر خاندان پر سرپرست بن کر سایہ کرتے اسی لیے ان کی بات سب کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل تھی اور سب کو سننا بھی تھی۔

''دینی تعلیم ہمارے لیے خوراک کی سی حیثیت رکھتی ہے اور تعلیم دینے والا ہمارے لیے ایک بہترین خوراک کس طرح تیار کرے جب اس کے پاس اجزائے ترکیبی حاصل کرنے کے لیے بھی وسائل موجود نہ ہوں۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی اس رُخ پر تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔'' رازی نے اعتراف کیا تو باقی سب بھی گردن ہلانے لگے۔

''ماشاء اللہ! یہاں رہنے والے سبھی افراد باعزت روزگار نہ صرف خود حاصل کیے ہوئے ہیں بلکہ کئی تو دوسروں کے روزگار کا وسیلہ بنتے ہوئے کئی لوگوں کی سفید پوشی کا بھرم رکھنے میں معاون ہیں۔ تو ایسی صورت میں ہر گھر سے دو، دو سو روپے یوسف صاحب کی تنخواہ کی مد میں مجھ تک پہنچنا خود مجھے شرمندہ کر گیا۔'' محمود صاحب کی بات کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت معذرت کرتے ہوئے سب نے اجتماعی طور پر ایک معقول رقم تنخواہ کی مد میں محمود صاحب کے حوالے کی جو کہ انہوں نے یوسف تک پہنچانے میں بالکل دیر نہ کی۔

''واؤ.....مما! جلدی آئیں..... یہ دیکھیں مجھے کیا ملا ہے۔''

ہادی نے مسجد سے آنے کے بعد گھر کے اندر داخل ہوتے ہی نوشی کو پکارنا شروع کر دیا تھا جبھی اس کے لیے گرما گرم فرنچ فرائز بناتی نوشی نے جلدی سے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور باہر کی طرف بھاگی۔ تب تک وہ لاؤنج عبور کر کے صوفے پر بیٹھا ایک خوب صورت سے گفٹ پیپر میں لپٹا کوئی گفٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آپ آ گئیں..... یہ دیکھیں۔'' ہادی کی ایکسائٹمنٹ دیدنی تھی۔ نوشی کو دیکھ کر تو جوش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''ارے واہ..... یہ کیا ہے بھئی؟''

''آج مسجد میں ہمارا competition تھا..... and I won that۔''

''اور ریئلی؟'' نوشی نے فوراً اسے گلے لگاتے ہوئے بالوں پر پیار کیا۔

''آپ کو پتہ ہے مما! میں تینوں راؤنڈز میں آؤٹ اسٹینڈنگ تھا۔ پہلے تو مولوی صاحب نے قرآن پاک سنا، فرسٹ ڈے سے لے کر اب تک جتنا بھی پڑھایا تھا نا، اس سارے میں سے ٹیسٹ لیا تھا انہوں نے۔'' گفٹ کھولتے ہاتھ رک گئے تھے اور اب وہ پورے جوش سے تفصیلات بتا رہا تھا۔

''پھر؟'' نوشی اس کی بات میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی۔

''اس میں میری کوئی بھی غلطی نہیں ہوئی۔ پھر وضو کروایا، وہ بھی میں نے پرفیکٹ کیا۔ اور لاسٹ میں ٹو کلمے سنے تھے نا وہ بھی میں نے without any mistake سنا دیئے۔ پھر انہوں نے مجھے یہ گفٹ دیا اور باقی بچوں کو بھی۔''

بڑی خوشی سے اس نے گفٹ پیپر ہٹایا تو اندر اسماء الحسنٰی کی سی ڈی موجود تھی۔

''مما! یو نو..... مولوی صاحب نے کہا ہے کہ ہم ایک مہینے میں یہ ساری سی ڈی یاد کر لیں گے۔''

''ہوں، یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اب ایسا کرو، اب آ کر کچھ کھا لو۔ بھوک لگ رہی ہو گی نا۔'' نوشی نے سی ڈی لے کر رکھتے ہوئے کہا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُٹھتے ہوئے ہادی نے ایک بار پھر سی ڈی ہاتھ میں لے لی۔

''یہ بھی آن کر لیتے ہیں کھانے کے ساتھ۔''

''اچھا بابا! آؤ تو سہی۔'' مسکراتے ہوئے نوشی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لاڈ سے بال بگاڑتے ہوئے اپنے ساتھ کچن میں لے آئی۔ ہادی کے بدلتے جذبات کے ساتھ خود اس کے خیالات بھی بدل رہے تھے۔

''کہاں تھیں یار؟.....اتنی دیر سے فون کر رہی ہوں، ریسیو ہی نہیں ہو رہا۔'' جائے نماز لپیٹ کر ابھی نوشی اُٹھی ہی تھی کہ فون کی بیل پر متوجہ ہوئی، جہاں دوسری طرف ہما موجود تھی۔

''نماز پڑھ رہی تھی نا۔ابھی ابھی اُٹھی ہوں۔''

''نماز پڑھ رہی تھیں؟'' ہما کو جیسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

''کیوں.....اتنی حیران نہ ہو یار! آخر کو میں بھی تو مسلمان ہوں۔''

''تو یہ تمہیں یاد کس نے دلا دیا کہ تم بھی خیر سے مسلمان ہو؟'' ہما نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ویسے بھولنا تو نہیں چاہئے تھا۔مگر ہادی نے کہہ کہہ کر شرمندہ کر دیا۔اور میں نے بھی سوچا، شرم آنی چاہئے ہمیں کہ بچے منتیں کر کے ہمیں نماز کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔حالانکہ ہمیں چاہئے تھا کہ بچوں کو نماز کی تاکید کرتے۔''

''لو بھئی تم تو گئیں کام سے۔بن گئیں ملانی آخر کار۔'' ہما کے لہجے میں اس دفعہ طنز بھی در آیا تھا۔

''یہی تو مسئلہ ہے ہم میں۔کسی بھی اچھے کام کی تقلید کرنے کے بجائے اوّلین ترجیح کے طور پر اس میں خامیاں تلاش کر کے تمسخر اُڑانے لگتے ہیں۔''

''اچھا یار! میرے سامنے تو ذرا تبلیغ سے پرہیز ہی کرو۔پہلے ہی مجھ سے تو وہ مولوی برداشت نہیں ہو رہا۔اللہ جانے بچوں کو کس طرح پڑھاتا ہے، کیا کرتا ہے۔اتنی ننھی سی عمر میں ہی ان کی باتیں سنو تو لگتا ہے وہ نہیں، ان کے اندر کوئی ملا بول رہا ہے۔''

''ہم بہت منفی نہیں سوچتے ان کے حوالے سے۔پہلے میں بھی تمہاری طرح سوچتی تھی۔لیکن یار! دھندلی عینک لگا کر دنیا دیکھیں گے تو دنیا بھی دھندلی ہی نظر آئے گی نا۔مگر یہ بات تو understood ہے کہ دنیا میں خرابی نہیں بلکہ خرابی ہماری عینک میں ہے۔'' نوشی نے اس کی رائے بدلنا چاہی۔

''کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟'' اس کے بدلے ہوئے اندازِ بیاں پر ہما کھٹکی۔

''تم خود سوچو! انگلش اخبار پڑھنا، کرکٹ یا دوسرے کھیلوں میں حصہ لینا، خوش لباس ہونا وغیرہ کیا یہ سب اسلام کے منافی ہے؟ اگر نہیں تو پھر مولوی حضرات یا قاری صاحب کو ہم نے صرف مسجد اور چولھے تک پابند کیوں کر دیا ہے؟ ہم کیوں ان لوگوں کو زندگی کی باقی ایکٹیویٹیز سے دُور رکھنا چاہتے ہیں؟''

''اس لیے کہ وہ جس منصب پر ہیں، انہیں یہ سب سوٹ نہیں کرتا۔''

''یہ سب تو بس ہماری اپنی سوچ ہے۔ورنہ اسلام نے تو دین اور دنیا دونوں کو ایک ساتھ نبھانے کی ہدایت کی ہے۔نہ کہ دنیا سے ناطہ توڑ کر گوشہ نشین ہونے کی۔''

''تو پھر بھی کوتاہی تو سراسر مولوی حضرات کی ہی بنتی ہے نا، جنہوں نے تبلیغِ اسلام میں سنگین کوتاہی برتی ہے، محض اپنی تقویت اور اجارہ داری کو برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے مقابلے پر ایک کے بعد ایک مدرسے کھولتے جا رہے ہیں۔ جہاں کی کوئی بھی out-put ہو مجھے تو سوائے ان کے کوئی نظر نہیں آئی کہ وہ بچے جن کا تعلیم میں دل نہ لگتا ہو، والدین کان سے پکڑ کر وہاں چھوڑ آتے ہیں جہاں بیشتر یتیم اور لاوارث بچوں کو محض ہل ہل کر قرآن پاک نہ صرف پڑھنا سکھایا جاتا ہے بلکہ ''منہ زبانی'' رٹوا دیا جاتا ہے تاکہ محفلوں میں قرآن پاک پڑھ کر اسی مدرسے کے لیے ہدیہ اور تبرک لانے کا بھی ذریعہ بن سکیں۔''

ہما سانس لینے کو رُکی اور پھر کافی دیر سے خاموش سامع بنی اس کی باتیں سنتی نوشی سے سوال کر بیٹھی۔

''اچھا تم ہی بتاؤ، کیا اکثر و بیشتر مولوی حضرات، بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے ہوئے کبھی اس کے مفہوم سے بھی شناسائی فراہم کرتے ہیں؟ کیا کبھی انہوں نے قرآن کریم اور عہدِ حاضر کی ضروریات کو ایک پیمانے میں ڈال کر بچوں کے سامنے پیش کیا؟ تم خطبے میں دیکھ لو۔ کیا کبھی کسی نے ہماری روزمرہ زندگی کے ساتھ قرآن پاک کا تعلق جوڑ کر اسے بہترین بنانے کی باتیں کیں؟''

''کچھ لوگ کرتے ہیں یہ سب بھی۔'' نوشی کی کمزور سی آواز ماؤتھ پیس پر اُبھری۔

''کچھ کو چھوڑو، میں اکثریت کی بات کر رہی ہوں یار! اور صرف اس لیے کہ بدقسمتی سے ہمارے علماء کی اکثریت جدید تعلیم سے نابلد ہے۔ یہ لوگ ہمیں قرآن پاک اس طرح پڑھنا کہاں سکھاتے ہیں جس طرح ہم پر فرض ہے۔ یہ تو بس قرآن پاک کو استعمال کرنا سکھاتے ہیں۔ مرحومین کی بخشش کے لیے، وظائف کے لیے، یا ثواب کمانے کے لیے۔ لیکن خود سوچو! یہ باتیں تو دوسرے درجے پر آتی ہیں نا..... یہ ربّ کو راضی کرنا اور اسے راضی رکھنا کیوں نہیں سکھاتے؟'' نوشی کو اس کی تمام باتیں سچ معلوم ہو رہی تھیں تبھی گہری سانس لے کر سنتی گئی۔

''یہی وجہ ہے کہ ہم نے مذہب کو محض رسمی طور پر اڈاپٹ کر رکھا ہے۔ قربانی دیتے ہیں تو رسمی۔ سال میں ایک دفعہ رسمی طور پر زکوٰۃ دے دی تو فارغ۔ اس کے بعد چاہے پڑوسی بھوک سے خودکشی کر لے، پروا نہیں۔ حج کو چلے گئے، رسمی طور پر ادائیگی کر لی، واپسی پر نام کے ساتھ حاجی لگا کر پھر اپنی تمام برائیوں میں مشغول نماز کو بھی اسی طرح ہم نے صرف ایک رسم کی طرح ادا کرنا ہے۔ جاء نماز تہہ کیا اور بس۔ کہاں کی نماز اور کون سی نماز..... اس لیے تو میرا دل اوب گیا ہے ان چیزوں سے۔ اور تم یقین کرو نوشی! میرا دل تو سو فیصد مانتا ہے کہ مولوی صاحبان کی اکثریت ہمیں صرف اور صرف اسلام کی رسمیں ادا کرنا سکھاتی ہیں۔ اینڈ دیٹس اِٹ!''

باتیں تو تمہاری سبھی ٹھیک ہیں لیکن خود سوچو نا یہ مولوی صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی ہماری تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ اب پچھلے دنوں یہ issue چلتا رہا کہ وہ مسجد میں انٹرنیٹ آن کر کے بیٹھے

رہتے ہیں مگر جب کھوج لگایا گیا تو پتہ چلا کہ وہ تو صرف دو گھنٹے آن لائن چند لوگوں کو قرآن پاک سکھاتے ہیں اور سب لوگوں نے اس بات کو کتنا غلط طریقے سے لیا اور پھر بعد میں شرمندگی ہوئی۔

''ہاں وہ سب تو واقعی غلط ہوا تھا۔ لیکن ان پر بھی تنقید اس لیے ہوئی تھی شروع شروع میں کہ وہ ایک یونیک سے انسان تھے۔ اور کم از کم میں نے تو اپنی پوری زندگی میں کبھی آج تک پاکستان میں ایسے مولوی کو نہیں دیکھا جو یوں فرفر انگلش بھی بولتا ہو اور بچوں کو اتنے خلوص اور پورے دل سے ہر صورت قرآن پاک سکھانا چاہتا ہو۔'' ہما نے اپنی ابتدائی سوچ کے غلط ہونے کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

''بچوں اور وہ بھی ہمارے پٹاخہ جیسے بچوں کو پتہ نہیں کیسے قابو کیا کہ یقین کرو بچے خود اپنے شوق سے نہ صرف خود مسجد جاتے ہیں بلکہ اپنے بڑوں کو بھی گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔'' ہما نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں یہ کریڈٹ تو انہیں جاتا ہے۔'' نوشی نے بھی تائید کی۔

''اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ یہ سب اس محلے کے بچوں یا ہمارے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔ ان کی نوکری سرکاری ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی سرکار کے پاس نوکر ہیں۔'' نوشی نے منیب کے منہ سے سنی ہوئی مولوی صاحب کی باتیں ہما تک پہنچائیں۔

حیرت ہے، ورنہ اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی.....'' ہما کچھ کہتے کہتے رکی۔

''دراصل ہمارا المیہ یہ ہے ہما! کہ ہم دوسروں کی خامی بہت جلد اچھالتے ہیں مگر خود اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ کیا ہم نے خود کبھی اپنے بچوں پر دین کے معاملے میں کوئی دھیان دیا؟ ماں ہونے کے ناطے کیا سونے سے پہلے ان سے کچھ دعا وغیرہ سنی؟ دلچسپ پیرائے میں مختلف انبیاء کرام علیہم السلام اور خود سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں کچھ بتایا؟ اسکول میں ٹیسٹ ہو گئے تو آگے پیچھے گھوم پھر کر لاڈ سے تیاری میں بھی مدد کرواتے ہیں اور پک اپ بھی کرتے ہیں۔ کبھی قرآن پاک کے لیے ایسا کیا؟ بلکہ اکثر اوقات اسکول کے ہوم ورک کی زیادتی یا پیپرز کی تیاری کے لیے قرآن پاک پڑھنے سے ہی چھٹی کروالی جاتی ہے۔'' اس بار سننے کی باری ہماری تھی سو خاموش رہی۔

''کیا باپ ہونے کے ناطے بچوں کی انگلی پکڑ کر انہیں ادائیگی نماز کے لیے مسجد لے کر گئے؟..... بچپن سے ہی ان کے دماغ میں ڈاکٹر یا انجینئر وغیرہ بننے کا جنون داخل کیا جاتا ہے نا، کیا کبھی ہم میں سے کسی نے یہ بھی کہا کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو کر عالم بنے گا؟ پارٹیز، فنکشنز میں ہم بڑے فخر سے سب کے سامنے کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ تو اتنا زبردست ڈانس کرتا ہے، گانے گاتا ہے۔ کبھی اسی فخر اور مان کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارا بچہ فلاں سیپارے پر ہے یا اسے چھ کلمے فرفر آتے ہیں..... نہیں نا؟'' نوشی نے ہما کو مسلسل خاموش پا کر شاملِ گفتگو کرنا چاہا۔

''ہاں۔ کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو۔''

''تو جب بچے کی پہلی درس گاہ اس کی ماں کی گود ہے تو الزام سارا مولوی حضرات پر کیوں؟ پہلے اپنی ذمہ داری ہم خود تو نبھائیں، باقی باتیں تو بعد کی ہیں۔''

''ہوں۔'' ہما نے گہری سانس خارج کی۔

''کہنا آسان ہے سب کچھ، لیکن کرنا مشکل۔''

''مشکل تو اب چاند پر بھی جانا نہیں ہے، تم اس کی بات کر رہی ہو۔'' نوشی مسکرائی۔

''اور تم دیکھنا ہما! یہ سب میں تمہیں کر کے دکھاؤں گی۔''

''کیا مطلب؟.....کیا کرو گی تم؟'' ہما اس کی بات کی تہہ تک نہیں پہنچی تھی۔

''اِن شاء اللہ! میں اپنے بیٹے کو عالم بناؤں گی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ عالم۔ جس کا مقصد اور مشن ان مولوی صاحب کی طرح نوجوان نسل کو رحمٰن اور رحیم سے متعارف کروانا ہوگا۔ اور پھر اگر ایک نوجوان بھی اسلام کی اصل روح کو سمجھ گیا تو بس ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔''

''کاش! ایسا ہو.....'' ہما نے نوشی کے احساسات محسوس کرتے ہوئے دل سے دعا کی تھی۔

''ایسا ہی ہوگا اِن شاء اللہ۔ کیونکہ میرے بیٹے کی نوکری سرکاری ہوگی۔ بڑی سرکار کے پاس۔'' فون بند کرتے ہوئے نوشی پُرعزم تھی۔ اور یہ فیصلہ اس نے جذبات کی رو میں آ کر نہیں بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کیا تھا کہ وہ دین جو اپنوں میں اجنبی بن چکا ہے، اسے پھر سے اپنا بنانے کے لیے اپنے حصے کی شمع تو جلانی ہی تھی.....!!

درد کا گہرا بادل

''کلو! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' سجل جو دونوں پاؤں صوفے پر رکھے ناخن فائل کر رہی تھی، اسے باتھ روم جاتا دیکھ کر فوراً بولی۔

''کچھ..... کچھ بھی نہیں۔'' اس نے پزل ہوتے ہوئے بے اختیار ہاتھ پیچھے کیا۔ شاید وہ اسٹور سے نکلتی زینیا کو دیکھ نہیں پائی تھی۔

''اب تو چور پکڑا گیا۔'' دبے قدموں چلتی زینیا نے اس کی مٹھی پکڑ کر اچانک ہاؤ کے انداز میں کہا تو بے اختیار اس کی مٹھی کھل گئی۔ بیسن اس کی ہتھیلی پر آئے پسینے کی وجہ سے لئی بن گیا تھا جبکہ وہ دونوں بہنیں اس کے روہانسے چہرے کو دیکھ کر خوب انجوائے کر رہی تھیں۔

''ارے بھئی چیونٹی کے بھی پَر نکل آئے ہیں۔'' زینیا نے بہن کو مخاطب کیا جو ہنسنے سے فارغ ہو کر دوبارہ ناخنوں کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

''ہاں بھئی۔ اگر چہرے پر بیسن مل مل کر کوئی ایشوریہ رائے بن سکتا تو آج سب لڑکیاں مِس ورلڈ ہوتیں۔'' اس نے ایک نظر کلو پر ڈالتے ہوئے کہا جو آنسو چھپانے کے لیے فوراً باتھ روم میں چلی گئی تھی اور صرف آج نہیں بچپن سے اس کی یہی عادت تھی۔ رونے کے لیے وہ باتھ روم ہی کا رُخ کرتی تا کہ کسی اور پر اس کی کمزوری ظاہر نہ ہو اور پھر تب ہی نکلتی جب اس کا دل ہلکا ہو جاتا۔ آج بھی اس نے کنڈی لگا کر جو رونا شروع کیا تو خیال ہی نہ رہا کہ وہ دونوں باہر ہی بیٹھی ہیں۔ چونکی تب جب سجل کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ارے بھئی ریکھا تو نہاتے ہوئے صابن کی پوری ٹکیا خرچ کر دیتی تھی کہ شاید اس طرح گوری ہو جائے لیکن بے سود۔'' وہ ریکھا کے تازہ ترین انٹرویو میں سے اپنی پسند کا جملہ کوڈ کر رہی تھی جس میں اس

نے کھلے دل سے یہ اعتراف کیا تھا۔ لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ اشارہ اسی کی طرف ہے لہٰذا فوراً آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔

❀---❀---❀

''شہزادی.....!'' آج ہفتہ تھا اور امن بوا حسبِ معمول تیل کی شیشی ہاتھ میں لیے اسے بلا رہی تھیں اور وہ جو کالج سے آ کر ابھی کچھ دیر پہلے ہی کھانے سے فارغ ہوئی تھی، چڑ سی گئی تھی لیکن حسبِ عادت تحمل مزاجی سے بولی۔

''بوا!.....میری پیاری بوا اماں! میں شہزادی نہیں ہوں۔'' ہفتے میں ایک بار اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ اس کے بالوں میں خود اصلی آملوں کے تیل کی مالش کیا کرتی تھیں اور شاید اس کے گھٹاؤں جیسے خوب صورت بالوں کا راز بھی یہی تھا۔

''اے لو، یہ تم سے کس نے کہا؟'' برآمدے میں بچھی پلنگ پر بیٹھ کر وہ اس کی چٹیا کھولتے ہوئے بولیں جبکہ وہ فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ ''چندا! میں تمہاری ماں نہ سہی، ماں جیسی تو ہوں.....کبھی میری آنکھوں سے دیکھ کر پھر کہنا۔'' شفقت اور پیار بھرا لمس لیے دو ضعیف ہاتھ آہستہ آہستہ گویا اسے لوری سنانے لگے تھے اور ہمیشہ کی طرح اسے نیند آنے لگی تو اس نے بغیر تردّد کے آنکھیں بند کر لیں۔

''امن بوا! یہ مائیں اتنا جھوٹ کیوں بولتی ہیں؟''

''جھوٹ ووٹ کا تو مجھے پتہ نہیں البتہ تُو واقعی پیاری ہے۔''

''ہاں، کوّے سے بھی جب خوب صورتی کا معیار پوچھا گیا تو وہ اپنے ہی بچے کو چونچ میں دبا لایا کہ اس سے زیادہ خوب صورت کچھ نہیں۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''چل ہٹ.....جو اول فول منہ میں آتا ہے، بولتی چلی جاتی ہے۔'' انہوں نے ہلکی سی چپت اس کے سر پر ماری اور آنکھوں میں آئے نمکین پانی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے دوبارہ ہتھیلی پر تیل ڈالنے لگیں۔

❀---❀---❀

''ارے امن بوا! یہ آپ کیوں چاول صاف کر رہی ہیں؟ آج تو اتوار ہے۔ میں ہوں، تینوں لڑکیاں بھی گھر پر ہیں پھر بھی۔'' تاجور نے ان کے نزدیک رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے چاولوں کی پرات ان کے ہاتھ سے لینا چاہی۔

''ارے نہیں بیٹا! میں بھی فارغ ہی تھی۔ موئی چارپائیاں توڑنے سے بہتر ہے کہ بندہ کام کاج ہی کرے۔'' انہوں نے چاول سے کنکر نکال کر ساتھ رکھی پلیٹ میں رکھے۔ ''اور پھر میں تو کہتی ہوں یہ جسم

کیڑوں ہی کے کام آنا ہے تو کیوں نہ میرے اپنوں کے کام آ جائے۔'' چاولوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اُداسی سے بولیں تو تاجور فوراً ان کے پاس آ بیٹھیں۔

''بوا! اللہ خیر کرے۔ آپ کبھی کبھی کیسی باتیں کرنے لگتی ہیں؟ اوپر والے کے فضل سے آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے کہہ دیا ہے بس۔'' وہ بھی ایک دم پریشان ہو گئیں۔

''ارے بیٹا! یہ تو سب تم لوگوں کی محبت ہے کہ مجھ غریب پر اتنی مہربانیاں کرتے ہو۔ ورنہ خوامخواہ کا اضافی خرچ ہوں میں تو۔'' وہ ہنوز افسردہ تھیں۔ ''لوگ تو اپنے بوڑھے والدین کو نفسیاتی ہسپتالوں میں ڈال آتے ہیں اور ایک تم لوگ ہو کہ مجھے لاوارثوں کی صف سے نکال کر اپنا لیا۔ تم لوگ بہت عظیم ہو بیٹا!..... اوپر والا تم سب کو اس کا اجر دے گا۔'' آج وہ بہت دل گرفتہ سی محسوس ہو رہی تھیں۔

کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے جب بندہ کسی انجانے احساس کے تحت انتہائی افسردہ ہو تو خوامخواہ ہی پرانی باتیں یاد کر کے رونے کو جی چاہتا ہے کہ شاید ذہن و دل پر چھایا غبار اسی نمکین پانی سے دُھل جائے۔

''بوا! عظیم ہم نہیں، آپ ہیں کہ جب دو ڈھائی سال کی کلو سے اس کی ماں کا پیار چھن گیا تو نہ صرف یہ کہ آپ نے اسے ماں کا پیار دے کر پالا بلکہ اس کی ایسی تربیت کی کہ جہاں بھی ہو، منفرد سی لگتی ہے۔'' بے شک ان کی اپنی دو بیٹیاں تھیں لیکن وہ دل ہی دل میں تسلیم کرتی تھیں کہ وہ ماں ہو کر ان کی ایسی تربیت نہ کر سکیں جیسی انہوں نے کلو کی کر دی تھی۔

''ہونہہ، تربیت.....'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی تھیں۔ ''نہیں تاجور! میری تربیت میں کہیں کمی ضرور رہ گئی ہے جس نے اُس کی شخصیت کا اعتماد چھین لیا ہے۔''

''ارے بوا! اب بس کریں۔ شاید وہ ادھر ہی آ رہی ہے۔ آپ کو دیکھے گی تو دُگنی پریشان ہو جائے گی۔'' تاجور نے ان کا خیال ہٹانے کو کلو کی طرف اشارہ کیا جو کچن سے ادھر ہی آ رہی تھی۔

''بوا اماں! چاول صاف ہو گئے ہوں تو میں لے جاؤں؟'' لائٹ پنک اور گرین کنٹراسٹ کا سوٹ پہنے وہ کتنی ملیح لگ رہی تھی اور یہ سچ تھا کہ اس کے چہرے کی انوکھی کشش دیکھنے والے کو دوبارہ دیکھنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ کاش اسے کوئی سمجھائے کہ یہ کتنی خوب صورت ہے۔ بوا نے سوچا۔

''ہاں ہاں بیٹا! لے جاؤ۔''

''اور تائی امی! مسور کی دال کو بگھار لگانا ہے لیکن لہسن ختم ہو گئے ہیں۔'' اس نے کھڑے کھڑے چاولوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''زوہیب کہاں ہے؟''

''شاید اندر، اپنے کمرے میں۔''

''اسے بلاؤ..... اچھا رہنے دو، میں خود جاتی ہوں۔'' اپنی بات کی خود ہی نفی کرتے ہوئے وہ فوراً اُٹھ

کھڑی ہوئیں۔ جوان بیٹے کی ماں تھیں لہٰذا جیسے ہی کلو نے ذرا قد نکالا اور کچی عمر کی الوہی چمک نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا، وہ خوامخواہ چوکنی سی ہوگئی تھیں۔ ہلکے سانولے رنگ کو کہہ کہہ کر اس کے دماغ میں ایسا کمپلیکس بٹھا دیا کہ اس کی شخصیت کا اعتماد بالکل ختم ہوگیا اور یہی بات امن بوا کے لیے روگ بنتی جا رہی تھی۔

''شہزادی!'' انہوں نے چاول لے کر کچن میں جاتی کلو کو پکارا۔ سارے گھر میں صرف وہی اسے اس نام سے پکارا کرتی تھیں۔

''جی بوا اماں!''

''بیٹا! ادھر آ میرے پاس۔'' انہوں نے پلنگ کے بیچوں بیچ لڑھک کر آ جانے والے گاؤ تکیے کو پیچھے کر کے اپنے پاس جگہ بنائی۔

''کیا بات ہے بوا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' وہ بوا کے لیے اسی طرح پریشان ہو جایا کرتی تھی۔

''کیا کر رہی ہیں وہ دونوں؟'' اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے انہوں نے سجل اور زینیا کے مشترکہ کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''انہوں نے سمیرا باجی سے قمیض منگوائی تھی۔ اس کا ڈیزائن کاپی پر اتار رہی ہیں۔'' سمیرا اُن کے محلے میں ہی رہتی تھی اور بہت اچھی سلائی کرتی تھی۔ اکثر بوتیک وغیرہ کے آرڈرز بھی مل جاتے کہ اس کے ہاتھ میں غضب کی صفائی تھی اسی لیے ان دونوں کی اس سے گاڑھی چھنتی تھی کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے۔

''بیٹا! تم بھی اپنے لیے کچھ وقت نکالا کرو۔ کم و بیش تم تینوں ہم عمر ہی ہو۔ کیا تم کو شوق نہیں خوبصورت ڈیزائنوں کا؟'' آج کل وہ شدت سے کوشش کر رہی تھیں کہ اس کے دماغ سے کمپلیکس کا بھوت اُتر جائے۔

''ارے بوا! ہیں تو اتنے سارے کپڑے۔'' وہ بے نیازی سے چاولوں میں نہ جانے کیا لکھتی جا رہی تھی۔

''ہونہہ..... ہیں تو.....''

''اوہو..... پانی چولہے پر اُبل کر احتجاج کر رہا ہوگا۔ اور میں نے ابھی چاول بھی نہیں دھوئے۔'' جانتی تھی کہ پھر لیکچر شروع ہو جائے گا لہٰذا سہولت سے دامن بچا کر اُٹھ گئی۔

❀---❀---❀

''شہزادی!''

''یس میڈم۔''

''آپ نے نوٹس بورڈ پڑھا؟'' میڈم ممتاز نے ٹیبل پر رکھی اسائنمنٹ فائلز پر ایک نظر ڈالی اور بیک

بینچز پر بیٹھی شہزادی کو مخاطب کیا۔

''آئی ایم سوری میڈم! دراصل کل میں جلدی میں تھی اور اتفاق سے آج بھی بالکل ٹائم پر آ گئی۔ اس لیے دیکھ نہیں سکی۔'' فوراً کھڑے ہوتے ہوئے اس نے تفصیلی وضاحت دی۔

''پورے ڈویژن کے منتخب کالجز میں سالانہ مقابلوں کا انعقاد ہو رہا ہے اور تقریر کے لیے میرے خیال میں تمہارے ذہن میں موجود خیالات اور افکار اتنے پاور فل ہیں کہ کالج کی نمائندگی کر سکیں۔''

''میڈم! وہ..... وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اتنے سب لوگوں کے سامنے.....'' ہتھیلی پر آئے ننھے قطروں نے احتجاج کے لیے فوراً زبان کا سہارا لیا۔

''ارے ابھی پچھلے سال آپ نے اپنے ہی کالج کے فنکشن میں تقریر کی تھی۔'' وہ شاید اس کی صلاحیتوں سے واقف تھیں جبھی آزمانا چاہتی تھیں۔

''اوکے میڈم!'' اس نے ساری کلاس کے سامنے بحث کرنے سے بہتر سمجھا کہ اکیلے ان کے آفس جا کر بات کرے لہٰذا پیریڈ ختم ہوتے ہی ان کے آفس میں جا پہنچی۔

''میڈم! آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' ہاتھ مسلتی ایک بار پھر وہ ان کے سامنے تھی۔

''بات، ہاں بیٹھو!''

''وہ دراصل اتنے بڑے لیول پر کالج کی نمائندگی کرنی ہے۔ بے شک میرے لیے اعزاز کی بات ہے لیکن.....'' اس نے سر جھکا دیا۔ ''لیکن میں کر نہیں پاؤں گی۔''

''اوہو بھئی تم کیوں اسے ہوّا بنا رہی ہو؟..... لوگ اتنے ہی ہوں گے جتنے اپنے کالج میں تھے۔ بس یہ سوچو کہ تم کر لو گی؟ اور اگر جو میں کسی دوسری لڑکی کو منتخب کرتی ہوں تو کیا وہ دو زبانوں سے بولے گی یا اس کا دماغ سائز میں تم سے بڑا ہو گا۔ شہزادی! ایک بات یاد رکھو۔ اپنی ذات پر اعتماد ہی زندگی میں کامیابی کی کنجی ہے اور پہلی سیڑھی بھی۔ صرف یہ سوچ اپنا لو کہ اگر یہ کام فلاں کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں۔'' اپنی بات کا اثر اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق ہوتا دیکھا تو مسلسل برقرار رکھتے ہوئے مزید بولیں۔

''اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو برابر دماغ دیا ہے۔ بس فرق ہے تو اتنا کہ کچھ لوگ اسے زیادہ استعمال کرتے ہیں اور زندگی میں کامیابیوں کی کنجی پا لیتے ہیں اور کچھ لوگ کم یا پھر نہ استعمال کر کے ہمیشہ دوسروں پر رشک کرتے ہوئے محض ''کاش'' ہی کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا لیتے ہیں۔'' اب وہ اس کی طرف سے مثبت جواب سننے کی منتظر تھیں۔

''اوکے میڈم! اِن شاء اللہ آئی وِل ڈو دیٹ۔'' ہلکی سی پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ اس نے چیئر کھسکائی اور اجازت لے کر کامن روم کی طرف چل دی جہاں اب وہ تفصیل اور توجہ سے نوٹس بورڈ پڑھنا چاہتی تھی۔

کالج میں اس کی شخصیت گھر سے کسی حد تک مختلف تھی کہ یہاں بات بات پر میٹھے انداز میں نیچا

دکھانے والا کوئی نہ تھا۔ شاید یہاں بھی صورتِ حال وہی ہوتی۔ لیکن ایڈمیشن کے وقت جان بوجھ کر اس نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ مزید پڑھنا نہیں چاہتی جس پر گو کہ سب بہت خوش ہوئے مگر امن بوا کا تو گویا کھانا پینا ہی چھوٹ گیا۔ اور جب شہر کے سب سے بہترین کالج میں سجل اور زینیا کا ایڈمیشن ہو چکا تو اس نے محض دکھانے کو کہ وہ امن بوا کا دل رکھنے کو پڑھ رہی ہے، دوبارہ فارمز منگوائے اور نسبتاً اوسط درجے کے ارادے میں تعلیم حاصل کرنے لگی لیکن وہ خوش تھی کہ یہاں وہ دونوں بھری کلاس میں اس کی انسلٹ نہیں کر سکتی تھیں۔ اسکول کی طرح اسے شہزادی کے بجائے کلو کہہ کر نہیں بلا سکتی تھیں بلکہ یہاں اس کا اپنا ایک امیج تھا۔ ذہانت کی وجہ سے ہر لڑکی اس کی عزت کرتی اور دوستی کرنے کی خواہاں ہوتی۔ مختلف رنگ روپ کی لڑکیوں کے درمیان اب وہ یہ سوچنے کے لیے آزاد تھی کہ وہ اتنی کالی نہیں جتنا اسے کہا جاتا ہے۔ پھر بھی گھر والوں کے دیئے گئے کمپلیکس کے تحفے..... گھر میں چونکہ سب سرخ و سفید رنگت کے حامل تھے اسی لیے اس کے ہلکے سانولے رنگ کو طنز کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ دراصل اس کے والد نے زرینہ خاتون سے لو میرج کی تھی۔ وہ لوگ تو کشمیری تھے لیکن زرینہ ان کی ذات سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود سانولے سلونے رنگ کے ساتھ ان کے ذہن و دل پر ایسا چھائیں کہ پھر گھر کی ہی زینت بن گئیں۔ لیکن یہ اور بات کہ جب شہزادی دو ڈھائی سال کی تھی تو شادی سے واپسی پر آتے ہوئے گاڑی کا پہیہ نہ جانے کیسے نکل گیا اور تیز رفتاری کے باعث نصیر احمد قابو نہ رکھ پائے اور دونوں ساتھ جینے مرنے کی قسموں کو سچا ثابت کر گئے۔ لیکن مختلف قسم کے جملے اسے دیکھ کر وقتاً فوقتاً لبوں کی قید سے ضرور آزاد ہوئے۔

''ارے یہ کالی ماتا کہاں سے آ رہی ہے بھئی؟'' بڑی تائی چونکہ نصیر احمد کو داماد بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھیں لہٰذا جل کر کہتیں اور پھر شکر کرتیں کہ ان کی بیٹی کم از کم بیوہ ہونے سے بچ گئی۔

''چلو اچھا ہے نا بھئی، ایک نظر بٹو بھی ہونا چاہیے۔'' تاجور بیگم اپنی سنہرے بالوں والی گوری چٹی بیٹیوں کو دیکھتے ہوئے کہتیں۔

''اسے تو رات کو پیدا ہونا چاہیے تھا۔ دن دیہاڑے والی چیز تو یہ نہیں۔'' ہنسی کا ایک اور فوارہ کہیں سے پھوٹا تھا۔

ننھی شہزادی کے دل پر ان الفاظ اور مسکراہٹوں سے اَن دیکھی چھریاں سی چل جاتیں۔ امن بوا کے آنے سے ان کے رویوں میں کسی حد تک تبدیلی بھی آئی کہ ایک غیر اتنا پیار دے تو شرما حضوری میں انہیں بھی کرنا پڑے۔ لیکن پھر بھی کبھی زبان سے ایک آدھ جملہ ضرور پھسل جاتا اور پھر عمر کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ صاف ہوتا چلا گیا۔ مگر ان جیسا بہر حال نہ ہو سکا۔ لیکن پھر بھی اس کے چہرے کی معصومیت اور چمک ان سب کے لیے حیران کن ضرور تھی کہ جو ایک ٹک دیکھنے پر مجبور کر دیتی۔

گرمیوں کی لو دیتی دوپہریں اچھے خاصے بندے کے حواس گم کر دیتی ہیں اور پھر سونے پہ سہاگا پبلک ٹرانسپورٹ پر آنا جانا! جس میں مسافر سر کے بالوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ آج چونکہ اسے میڈم ممتاز کے ساتھ ڈسکشن کرنے میں کافی دیر ہوگئی تھی لہٰذا اپنے رُوٹ کی بس کے لیے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑا۔ ابھی اسے کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ گرے کلر کی شیراڈ بالکل اس کے نزدیک آ کر ہلکی رفتار سے اس کے آگے سے گزر گئی۔ رفتار اتنی مدھم تھی کہ اس نے گاڑی میں بیٹھے اس خوبرو شخصیت کے مالک شخص کو اپنی طرف بغور دیکھتے پا کر دانستہ دائیں طرف رخ موڑ لیا جہاں سے اس کی مطلوبہ بس کی آمد متوقع تھی لیکن چند ہی لمحوں بعد وہی گاڑی دوبارہ اس کے سامنے تھی۔

''لفنگا!'' اس نے دل ہی دل میں اسے ایوارڈ سے نوازا جو شاید اس نے وصول بھی کر لیا۔

''ایکسکیوز می مس! لفنگا میں نہیں، پان کے کھوکھے پر کھڑے وہ لڑکے ہیں جن کی وجہ سے مجھے دوبارہ مڑ کر آنا پڑا۔'' اس نے شاید اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے تھے جبھی وضاحت دیتے ہوئے بولا۔ اسے تو اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ سڑک کتنی سنسان ہو چکی ہے۔ دُور دُور تک بس کا انتظار کرنے کے لیے بھی کوئی موجود نہ تھا سوائے ان لڑکوں کے، جو اب ایک دوسرے کو آنکھ مار کر ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں۔'' اس نے ایک دم اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتے دیکھ کر آفر کی تھی۔ لیکن اتنے میں اس کی مطلوبہ بس اپنا مخصوص بگل بجاتے ہوئے عین اس کے نزدیک آ رہی تھی۔

''نو تھینکس۔'' اس نے مسافروں سے بھری بس کو ہی غنیمت جانا اور جگہ نہ ہونے کے باوجود دل کڑا کر کے کھڑی ہوگئی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کے کپڑے پسینے سے شرابور ہو چکے تھے۔ امن بوا ہمیشہ کی طرح انتظار کرتی ملیں کہ دوپہر کا کھانا دونوں ہمیشہ اکٹھا ہی کھایا کرتیں۔

''بیٹا! خیر تو ہے، آج کافی دیر ہوگئی؟'' امن بوا نے پیڈسٹل فین کا رخ اس کی طرف موڑ کر اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بوا! مت پوچھیں۔ یہ گرمی اس وقت بھنویں چڑھائے، آنکھیں نکالے کھڑی ہوئی ہے۔ اور پھر میڈم کے ساتھ ذرا ڈسکشن میں بھی ٹائم لگ گیا۔'' اس نے دوپٹہ اُتار کر بیڈ پر پھیلایا اور پاؤں کو جوتے کی قید سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ دوپٹہ اچھی طرح لپیٹنے کی وجہ سے قمیض تقریباً بھیگ چکی تھی اور جسم کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ بار بار خیال بھٹک کر آج کے واقعے کی طرف جا رہا تھا۔

''بیٹا! تم منہ دھو لو۔ میں کھانا کمرے میں ہی لے آتی ہوں۔'' انہوں نے اس کی کلپس اور ہینڈ بیگ اٹھا کر ہک ریک میں رکھا۔

''بوا! آپ آرام سے کھانا لے آئیں۔ میں پہلے نہاؤں گی۔'' اس نے الماری سے کپڑے نکالے اور بوا کے پیچھے پیچھے چل دی۔

گھر کے ہر کمرے میں اٹیچ باتھ تھا لیکن ان کے کمرے کے باتھ رُوم میں آج کل پانی نہیں آ رہا تھا جبھی وہ دونوں باہر صحن والا باتھ روم استعمال کیا کرتیں۔ گھر میں ہُو کا عالم تھا۔ سب کو ہی دوپہر کو سونے کی عادت تھی اور شام پانچ ساڑھے پانچ سے پہلے اگر خدانخواستہ آنکھ کھل جاتی تو گھڑی دیکھ کر دوبارہ ستے بن جاتے۔ اس نے ایک نظر سب کے بند دروازوں پر ڈالی اور زوہیب کے کمرے کی طرف دیکھ کر اور تائی کی سوچ پر سر جھٹک کر باتھ روم کی طرف چل دی۔ نہا کر نکلی تو اپنے آپ کو فریش محسوس کیا۔ بوا کھانا رکھے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

''میری پیاری بوا! آئی ایم سوری۔ دیر ہوگئی۔'' انہیں دیکھ کر اسے پہلا خیال یہی آیا کہ وہ شاید دیر تک نہاتی رہی ہے اور وہ محض اس کے لیے بھوکی بیٹھی ہیں سو فوراً ان سے لپٹ گئی۔ خوبصورت گھنے گیلے بالوں سے قطرہ قطرہ شبنم اس کی قمیض کو بھگو رہی تھی لیکن اب سکون محسوس ہو رہا تھا نہ کہ چڑچڑاہٹ۔

''شہزادی!''

''جی بوا اماں!''

آج چنے کی دال پکی تھی اور ساتھ ہمیشہ کی طرح سلاد اور پودینے کی چٹنی جس کے بغیر ان کے گھر گرمیوں کا کھانا نامکمل سمجھا جاتا وہ بڑے ہی شوق اور رغبت سے کھا رہی تھی۔

''بیٹا! شام کو سجل اور زینیا، ساجدہ آپا کے بیٹے کی شادی کے لیے کچھ شاپنگ کرنے جا رہی ہیں۔ میں نے کہا ہے تمہیں بھی لے جائیں۔ اچھے اچھے رنگوں کے کچھ گرمیوں کے جوڑے لے آنا۔'' سلاد کی پلیٹ سے ٹماٹر اٹھاتے ہوئے وہ بولیں۔

''بوا.....!'' اس نے آلکس سے کہا۔ گویا وہ جانے کے موڈ میں ہرگز نہ تھی۔

''ارے میری جان! وہ دونوں بھی تو ہوں گی نا۔ کون سا تم اکیلی ہو۔'' انہوں نے اسے قائل کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بوا! آپ کہتی ہیں تو چلی جاؤں گی ورنہ.....'' وہ برتن سمیٹ رہی تھی۔

''ہاں ہاں جانتی ہوں، تیرا موڈ نہیں۔ چل میری خاطر ہی سہی۔'' وہ خوش ہوگئی تھیں اور اسی میں شہزادی کی بھی خوشی تھی۔

❀---❀---❀

بازار میں اتنا تو وہ کبھی نہیں گھومی تھی جتنا آج اسے ایک ایک دُکان میں گھسنا پڑ رہا تھا۔ ہمیشہ بوا کے ساتھ آتی اور ضرورت کی چیزیں لے کر فارغ۔ فضول تاک جھانک نہ بوا کو پسند تھی نہ اُسے۔ اور اس پر ان

دونوں کا انتہائی بے تکلفی سے سیلز مینز کے ساتھ بات چیت کرنا! اُسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

''یہ لپ اسٹک کتنے کی ہے؟''

''گڑیا! آپ کے لیے صرف 140 کی۔''

''کیوں، ہم کیا اسپیشل ہیں؟'' ایک ادا سے پوچھا گیا۔

''میرے لیے تو ہیں ہی۔ اور پھر آپ کی گوری رنگت پر یہ رچ میرون شیڈ تو غضب ڈھائے گا۔'' سیلز مین کو تو موقع چاہئے تھا، فوراً پھیلنے لگا۔

''اور ان پر.....؟'' زینیا نے اچانک ہی شہزادی کی طرف اشارہ کیا جو ہاتھ میں شیڈ کارڈ پکڑے مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک ان سب کی نظریں خود پر محسوس کرتے ہوئے وہ ایک دم بوکھلا گئی۔

''گڑیا! ہر بندے کی اپنی چوائس ہوتی ہے۔'' وہ بھی بڑا کایاں تھا اور گاہک ہاتھ سے نہ جانے دینے کا ہنر بخوبی جانتا تھا جبکہ ان دونوں کا مزہ کرکرا ہو گیا۔

''اچھا، چیری بلاسم ہو گی آپ کے پاس؟'' سجل نے بل دیکھتے ہوئے ایک دم پوچھا لیکن وہ ان کا مطلب سمجھ نہیں پایا۔ ان کی یہی عادت تھی۔ ہر کسی کے سامنے اسے ڈی گریڈ کرنا شاید وہ خود پر واجب خیال کرتی تھیں۔ سیلز مین کی چرب زبانی ہی کی وجہ سے انہوں نے گھر میں موجود ہونے کے باوجود مختلف فیس واش، ماسک اور اسکرب وغیرہ بھی خرید لیے جو ان کے خیال میں اس نے اپنی بچت تک نہ رکھتے ہوئے دیئے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ کپڑوں کی دکان پر پہنچی تھیں۔ دل ہی دل میں وہ آئندہ کبھی ان کے ہاتھ نہ آنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ شام کے سائے اپنے پَر پھیلائے ہر چیز کو آغوش میں لینے کو بے تاب تھے۔ وہ جانتی تھی کہ بوا پریشان ہوں گی لیکن وہ دونوں بس تھوڑی دیر، بس تھوڑی دیر کر کے بہت دیر کر چکی تھیں۔

''جی تو چندا! کون سا پسند آیا؟'' سیلز مین کافی ساری ورائٹی دکھانے کے بعد اب اُن کی پسند پوچھ رہا تھا۔ وہ دونوں بھی اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان دونوں کی موجودگی میں ہمیشہ وہ پزل ہو جایا کرتی تھی۔

''یہ..... یہ بلیک والا پیک کر دیں۔'' اس نے چند سوٹوں کے نیچے سے کپڑا ہاتھ میں پکڑ کر نشان دہی کی۔

''ارے یہ.....'' وہ دونوں منہ پر ہاتھ رکھ کر یوں ہنسیں گویا اس نے مردانہ سوٹ پر انگلی رکھ دی ہو۔ حالانکہ پوسٹر پرنٹ تھا اور سانولی سی ماریہ واسطی پر خوب جچ بھی رہا تھا۔ بلیک سا بارڈر اُسے مزید دلکش بنا رہا تھا۔

اس نے استفہامیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا گویا پوچھا ہو۔ ''اس میں کیا خرابی ہے؟''

اس کے منہ پھاڑ کر ہنسنے کے انداز پر دکان میں موجود دوسرے لوگ بھی متوجہ ہوئے۔

''بلیک کلر میں پتہ ہی نہیں چلے گا، تمہاری گردن اور منہ کہاں سے شروع ہیں، کہاں ختم۔''

احساسِ ذلت سے اس کے چہرے پر ایک دم کئی رنگ آ کر گزرے تھے۔ سیلز مین بھی جھینپ سا کر مسکرایا تھا۔ شاپر اٹھائے دکان میں داخل ہونے والے ان کی ہی طرح سرخ و سفید رنگت والے لمبے چوڑے بندے نے تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ سفید شلوار سوٹ میں شہزادوں کی سی آن بان رکھنے والا اسے واقعی بچپن میں بوا ماں کی سنائی گئی کہانیوں کا شہزادہ معلوم ہوا، کچھ دیکھا دیکھا..... کچھ اپنا اپنا سا..... گھنی مونچھوں تلے دولب ہلے تھے اور ساتھ کھڑی لڑکی نے بھی تائید میں گردن ہلا دی تھی شاید دونوں بہن بھائی تھے اور رش کی وجہ سے دکان کے دروازے پر ہی سائیڈ میں کھڑے تھے۔

''ایکسکیوز می مس.....!'' اس شخص نے اپنے آگے کھڑی لڑکی کو مخاطب کیا جواب باہر نکل رہی تھی۔ ایک دم اُسے یاد آیا کہ یہ تو وہی شخص ہے جو اس دن اسے ڈراپ کرنے کی آفر کر رہا تھا، جس کے بولے گئے دو تین جملے وہ دن میں کتنی ہی مرتبہ دُہراتی رہی تھی لیکن اس وقت سچویشن مختلف تھی اور آنسوؤں پر بند باندھنا ناممکن سا لگ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بے بس ہوتی، پلکوں کو جلدی جلدی جھپکاتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر گئی اور شاید یہی وہ لمحہ تھا جب رضا کو لگا کہ اس کا سفر واقعی تمام ہو گیا ہو اور حاصلِ سفر اُس کی منزل کے روپ میں بالکل اس کے سامنے ہے لیکن کہاں؟..... یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً مڑ کر دیکھا لیکن وہ تینوں لوگوں کی بھیڑ میں کہیں گم ہو چکی تھیں۔

شام گہری ہو چلی تھی۔ اور اسے یوں لگا جیسے سفر کی تھکان پل بھر میں اس کے روم روم میں بس گئی ہو۔ لیکن آج مزنیٰ کے بے حد اصرار پر وہ اُس کے ساتھ بازار آیا تھا تاکہ کالج کے فنکشن کے لیے ضروری چیزیں خریدے جو اسے ڈرامے کے لیے درکار تھیں۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی دکان کے اندر داخل ہو کر اس کا ساتھ دینا پڑا۔

❀---❀---❀

''کبھی کبھی یہ دل اتنا بے بس کیوں ہو جاتا ہے، اپنی حیثیت و اوقات دیکھے بنا ایسی چیزوں کی خواہش کرنے لگتا ہے جو کبھی اُس کی دسترس میں نہ آ سکتی ہوں لیکن..... لیکن کیا کروں، ذہن سے وہ نکلتا ہی نہیں اور دل..... دل پر تو یوں قبضہ کیے بیٹھا ہے گویا اسی کی جاگیر ہو۔ حالانکہ جانتی ہوں کہ دن اور رات کا ملاپ کیسے ہو سکتا ہے اور پھر..... پھر میں ہوں کیا؟''

بستر پر لیٹے لیٹے جو سوچنا شروع کیا تو سوچتی ہی چلی گئی کہ سوچوں پر کیا کسی کا اختیار ہوا کرتا ہے۔ لیکن اپنے ہی خیالات کی یلغار سے گھبرا کر ایک دم اُٹھی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ بوا اماں گہری نیند میں تھیں۔

'کہاں وہ اور کہاں میں؟' آئینے میں خود کو اس کے مقابل دیکھا تو دل گرفتہ سی ہنس پڑی۔ اور پھر آئینہ تو وہی دکھلاتا ہے نا جو ہم دیکھنا چاہیں۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کیفیت کیا ہو رہی ہے۔ عجیب مخمصے کا شکار تھی۔ بالوں میں اُنگلیاں پھنسائے بُک ریک کی طرف بڑھی اور فرحت عباس شاہ کی ''محبت ذات ہوتی ہے'' لے کر رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔

''پیار بھی عجب شے ہے
اضطرار میں مضمر
انتشار سے آگے
اختیار سے باہر!!''

بُک کھولتے ہی جو پہلا صفحہ نکلا تو اسے اپنے ہی حسبِ حال لگا۔

'واقعی یہ کب کسی کے اختیار میں ہوتا ہے؟ اور پھر چاہنا اور چاہے جانا تو انسان کی فطری خواہش ہے۔ تو.....تو پھر میں کیوں اس سے دامن بچا رہی ہوں؟'

بُک ریک بند کرتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے سوچا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔

'واقعی سوچ بھی تو اختیار سے باہر ہے اور پھر سوچوں پر کوئی پابندی ہے کیا؟' اُس نے سوچا اور مسکراتے ہوئے آنکھیں موند کر اپنی پسندیدہ رفاقت کے ساتھ خوش کن وادیوں کی سیر کرنے لگی۔

❀---❀---❀

فنکشن میں نہ صرف یہ کہ نعت اور تقاریر تھیں بلکہ مختلف قسم کے ڈرامے اور کوئز بھی شامل تھے۔ کالج کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں شامیانے لگا کر مینا بازار کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں ہاؤس ہولڈ چیزوں سے لے کر عید کے ڈریسز تک کے اسٹالز لگائے گئے تھے۔ اکثر لڑکیاں چہروں پر مختلف ڈیزائن پینٹ کروائے گھوم رہی تھیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے مستقبل کا حال بتانے والے اسٹال پر بھی گہما گہمی تھی جب وہ ٹیچرز کے ساتھ وہاں پہنچی تو شہزادی تو اتنی شاندار عمارت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے سنا تو تھا کہ سجل کا کالج شہر کا سب سے بڑا کالج ہے لیکن دیکھنے کا اتفاق آج ہوا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے اسٹیج سیکرٹری کو جا کر اپنی کنفرمیشن دی اور پھر آڈیٹوریم سے ملحقہ رُوم میں بیٹھ گئیں۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگی جا رہی تھیں لیکن آج اُس نے عزم کر رکھا تھا کہ خود کو کمپوز رکھے گی اور میڈم کے کیے گئے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گی۔ تیاری تو اُس کی بھرپور تھی ہی اور پھر آج صبح بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خوب پریکٹس کر چکی تھی لہٰذا اب مسلسل امن بوا کی نصیحت کے عین مطابق تیسرے کلمے کا ورد کر رہی تھی۔ ساتھ لائی گئی کتابیں اس نے کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ جتنا کچھ اس نے ذہن نشین

کر رکھا ہے، کافی ہے۔

''ایکسکیوزمی۔'' ان سب نے ایک ساتھ دروازے کی جانب دیکھا۔

وائٹ یونیفارم پہنے ہاتھ میں مختلف کپڑے اور وگز پکڑے وہ معصوم سی لڑکی ان سے مخاطب تھی۔

''فنکشن کا باضابطہ آغاز ہونے والا ہے اور آپ کے بیٹھنے کا انتظام آڈیٹوریم ہی میں تو ہے۔ پلیز وہاں تشریف لے آیئے تاکہ دوسرے کینڈیڈیٹس بھی اس کمرے میں آسکیں۔'' انتہائی شائستگی سے بات کرتے ہوئے اس لڑکی نے ٹیچرز کو آڈیٹوریم جانے جبکہ ان کے وہیں بیٹھے رہنے کی تلقین کی تھی۔

''شہزادی!'' اس نے مختصر جواب دے کر ہاتھ میں پکڑی کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی کہ ہمیشہ کی طرح اُس کا دہکتا رنگ دیکھ کر اُسے آئینہ یاد آ گیا تھا۔

''کتنا خوب صورت نام ہے آپ کا..... آپ جیسا۔'' اس نے تعریف کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

''خوب صورت اور میں؟'' اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا تو نظریں میڈم سے جا ملیں اور انہوں نے مسکرا کر یوں اثبات میں سر ہلایا جیسے کہتی ہوں ''سچ ہی تو کہہ رہی ہے۔'' ان چند ہی دنوں میں وہ میڈم کے اور میڈم اس کے بہت قریب آ چکی تھیں اور اس کا نفسیاتی پرابلم سمجھ لینے کے بعد وہ اکثر اوقات اُس کی برین واشنگ کرتی رہتیں جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہی تھیں۔

❀---❀---❀

''اوہ نو! اتنا ٹریفک۔ شاید سارا شہر آج ہی سڑکوں پر نکل آیا ہے۔'' رضا نے جھنجلا کر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ سامنے سگنل پر ریڈ لائٹ کافی دیر سے اس کا منہ چڑا رہی تھی لیکن مخالف سمت سے آنے والی گاڑیاں تھیں کہ مہنگائی کی طرح ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ کتنے اصرار سے مزنیٰ نے اسے فنکشن میں آنے کا کہا تھا اور اس کے سامنے تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن اب اچانک جا کر اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ خدا خدا کر کے سگنل گرین ہوا تو وہ گاڑی نہ صرف دوڑاتا بلکہ اُڑاتا ہوا کالج تک جا پہنچا۔

یہ کیا.....

آڈیٹوریم میں قدم رکھتے ہی وہ ساکت سا ہو گیا تھا۔ کیا سچی طلب اسی کو کہا کرتے ہیں؟ آج پھر وہ دشمنِ جاں جس نے ہر پل اُسے بے قرار کر رکھا تھا جو موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہر وقت اس کے ساتھ تھی، جس کا نام نہ جاننے کے باوجود اسے لگتا کہ وہ شاید زمانے سے اسے جانتا ہو..... تیکھے نقوش اور بھرپور تمکنت لیے اسٹیج پر اس کے سامنے تھی گویا سفر آسان ہو چلا تھا۔

آنِ واحد میں اس کے دل کی کئی دھڑکنیں مس ہونے لگیں۔

''جنابِ صدر! میں پوچھتی ہوں کہ کیا اب بھی وہ وقت دُور ہے کہ جب مشرق سے اوقیانوس اور مغرب سے بحرالکاہل اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر خشکی کو بھی لپیٹ میں لے لیں؟'' اس پُر اعتماد آواز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ تمام لوگوں پر اس کے جذباتی انداز اور لہجے کے خوب صورت اُتار چڑھاؤ نے سکتہ سا طاری کر رکھا تھا۔ کسی کونے سے کوئی سرگوشی تک نہیں ہو رہی تھی۔ ہوٹنگ کرنے والی لڑکیوں کا گروپ بھی دم سادھے بیٹھا تھا۔

''حاضرینِ محفل! یہ نہ صرف میرا آج کا موضوع تھا بلکہ میرا آپ سب سے سوال بھی ہے کہ ذرا اپنے گریبان جھانکئے، اپنے خیالات کو کچھ دیر کے لیے کھنگالیے اور اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑے ہو کر خود سے یہ سوال ضرور کیجیے گا کہ کیا واقعی ہم مسلمان ہیں؟''

''ہمارے لیے تو میرے دوستو! ڈوب کر مر جانے کا مقام ہے کہ ربِ ذوالجلال کی کتاب کو ناپاک ہاتھوں سے زمین پر پھینکا گیا (نعوذ باللہ) جنابِ والا! یہ کہتے ہوئے میری زبان کیوں نہ لڑکھڑائے اور میرے حواس کیسے قابو میں رہیں کہ پھر بھی نہ تو ہماری آنکھیں شدتِ غم میں بینائی سے محروم ہوئیں اور نہ ہی ہم نے ایک دن کے لیے سوگ ہی منایا۔''

''کیا ہم واقعی مسلمان ہیں کہ نہ صرف زندہ بلکہ خوش وخرم ہیں اور انہی کا طرزِ زندگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔''

وہ بے حد حیران تھا کہ ہر وقت کنفیوز سی چپ چاپ سی لڑکی پُر اعتماد کیسے ہو سکتی ہے؟ جتنی کشش اس کی شخصیت میں تھی، اس سے کہیں بڑھ کر اس کا اندازِ بیاں دلکش تھا۔

ایک ایک لفظ سیدھا دل میں اُتر جانے والا..... ایک دو بار اس نے ڈائس پر رکھے ٹشو پیپر سے سے چہرہ صاف کیا۔ تقریر کے خاتمے پر ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا بلکہ فرسٹ ایئر کی جوشیلی طالبات نے تو کھڑے ہو کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

اس کے بعد رضا کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ ''خودی کا سرِّ نہاں'' کو مزنیٰ نے کیسے پرفارم کیا؟ خیال سے چونکا تو اس وقت جب شہزادی چیف گیسٹ سے ونگ ٹرافی وصول کر رہی تھی اور بے اختیار روتے ہوئے شاید اس نے ہال میں بیٹھی اپنی پروفیسرز کو دیکھا تھا۔

وہی جلدی جلدی پلکیں جھپکانا، آخری سیٹوں پر بیٹھا وہ اس کے چہرے کا ایک ایک تاثر دل پر نقش کر رہا تھا۔ فوراً سے پہلے اس سے ہم کلام ہو کر اپنی بے تابیوں کے قصے سنانا چاہتا تھا..... اپنی حالت پر اسے خود ہی ہنسی آ گئی اور کوئی ٹین ایجر تو نہ تھا۔ حال ہی میں یورپ سے نمایاں کامیابیاں رقم کیے اسناد کے ساتھ واپس آیا تھا لیکن..... لیکن آتے ہی ''کیوپڈ'' کے تیر نے اس کے دل کو ایسا گھائل کیا کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور اب اسے اپنے مسیحا کو حالِ دل سنانے کی جلدی تھی جس کے لیے اس نے مزنیٰ کی مدد

لینے کی ٹھانی۔

فنکشن کے بعد سب مینا بازار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مختلف قسم کے منفرد اسٹالز سب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ میڈم کو بتا کر وہ سجل اور زینیا کی طرف گئی جو آج خوامخواہ اس سے حسد محسوس کر رہی تھیں جبھی اسے دیکھتے ہی رُخ بدل لیا اور وہ اپنی جگہ حیران رہ گئی کہ وہ دونوں نو اسے لوگوں کے درمیان کلو، سیاہ رات وغیرہ کہہ کر چھیڑتی تھیں کہ ہم تو مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن آج چونکہ وہ اپنا تعارف آپ بن چکی تھی اس لیے وہ دونوں اس سے بات تک کرنے کی روادار نہ ہوئیں۔

''ہیلو ہیلو!'' وہ ہاؤس ہولڈ کے اسٹال پر موجود میڈم کی طرف جا رہی تھی کہ کھنکتے سے شوخ و چنچل طرزِ تخاطب نے اسے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ ''بہت بہت مبارکباد! آپ بہت اچھا بولتی ہیں۔'' مزنیٰ نے ایک بار پھر کھلے دل سے اس کی تعریف کی تھی اور وہ لاشعوری طور پر اس کے ساتھ گراؤنڈ کے کونے کی طرف جا پہنچی۔

''تھینک یو۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا کہ ساتھ کھڑے بندے کو دیکھ کر اس کے اندر جو اتھل پتھل شروع ہو چکی تھی، وہ کسی طور ظاہر نہ ہو۔

''یہ میرے بھائی ہیں، رضا احمد۔ آپ کی اسپیچ اور آپ سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔'' اس نے تعارف کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے سچ کہا تھا۔ گرے پینٹ پر لائٹ بلیو شرٹ پہنے وہ کس قدر ڈیسنٹ لگ رہا تھا اور پھر اُس کی وارفتگی بھری پُرشوق نظریں.....

وہ گھبرا سی گئی۔ گھنی مونچھوں تلے دو مسکراتے لبوں نے جنبش کی تھی جس سے شہزادی کو اپنا آپ سرد ہوتا محسوس ہوا۔ جبکہ مزنیٰ نے سن کر بھی یوں پوز کیا جیسے نہ دیکھا نہ سنا۔ جبھی وہ ان کے ساتھ اس کونے کی طرف آئی تھی کہ کوئی زیادہ نوٹس نہ لے۔ اور وہ کیا کہتی کہ جس کے ساتھ تنہائی میں ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی، خوابوں میں جس کے سنگ سنگ گھوما کرتی، اسے سامنے دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے اور وہ محض سر جھکا کر رہ گئی۔

بھائی کی وارفتگی تو مزنیٰ نے بازار ہی میں محسوس کر لی تھی لیکن آج اتنی دیر سے جس طرح وہ اس کی تقریر اور شخصیت کو ڈسکس کیے جا رہا تھا، وہ سمجھ گئی کہ دال ساری کالی ہو چکی ہے لہٰذا دونوں کو آمنے سامنے کر کے شہزادی کے بھی تاثرات جانچنے چاہئیں جو اس کے حسبِ منشا تھے۔

''اور یہ شہزادی۔'' اس نے تعارف مکمل کیا لیکن جیسے ہی اس کی سماعتوں سے اپنا نام ٹکرایا، اس نے چونکتے ہوئے سر اوپر اٹھایا تو یوں لگا گویا سنڈریلا کے بارہ بج گئے ہوں۔

''اتنا پرسنیلٹی کلیش۔'' اس نے دل میں اُٹھتی انجانی اُمنگوں اور لطیف جذبوں کو بے دردی سے مسل دیا اور جان بوجھ کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی جیسے کہ وہ کسی اور کا انتظار کر رہی ہو لیکن مزنیٰ بھی کام پکا کرنا چاہتی تھی۔

''آپ سجل کی کزن ہیں نا؟''

''جی!'' جان چھڑانے والے انداز میں جواب آیا۔

رضا کی نظریں مسلسل اُس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور وہ ان لو دیتی نظروں کی تپش سے بچنے کی ناممکن سعی کر رہی تھی۔

''ہم آئیں گے کسی دن آپ کے گھر۔'' مزنیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے رضا ذومعنی انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

جبکہ زندگی میں پہلی بار اسے سجل اور زینیا کو دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ تمام مینرز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فوراً ایک بار پھر ان کی طرف لپکی جو کپڑوں کے اسٹال پر مشکوک نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔

❁---❁---❁

تائی امی نے ان تینوں کے کام کرنے کی باریاں مقرر کی ہوئی تھیں جن میں وہ دونوں تو اکثر سر درد، چکر یا بی پی لو ہونے کا بہانہ بنا کر ڈنڈی مار دیا کرتیں۔ آج شام سالن اور اس کے ساتھ کچھ اسنیکس بنانا اس کی، آٹا گوندھ کر روٹیاں بنانا زینیا کی جبکہ برتن دھو کر کچن صاف ستھرا کرنے کی باری سجل کی تھی۔ تاجور بیگم اور امن بوا باری کے بغیر ہی کبھی گاجر کا حلوہ اور کڑھی بنا رہی ہوتیں تو کبھی چنے کی دال کی برفی اور کوفتے بنائے جا رہے ہوتے۔ غرضیکہ جس طرح بھی ہوتا، اچھا خاصا اہتمام ہو جاتا تھا۔ اس نے آج بھنڈی گوشت بنانے کے ساتھ آلو کے رول بنانے کا سوچا۔ بھنڈیاں تو امن بوا نے کاٹ کر رکھ دی تھیں تاکہ لیس نہ رہے۔ وہ اُٹھی تاکہ آلو غیرہ اُبلنے کے لیے رکھ دے۔ کچن میں آ کر ابھی اس نے باسکٹ میں سے آلو نکالے ہی تھے کہ ایک دم چونکی۔ زوہیب ٹیبل کے اس طرف بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''جی..... کیا..... کیا..... چاہیے؟'' ان دونوں کا آمنا سامنا کم ہی ہوا کرتا تھا اور پھر کہاں یہ کہ وہ یوں اکیلے میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے تو ایک دم ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ یوں تو تائی امی نے کبھی اسے کچھ کہا نہیں تھا لیکن ان کے دیکھنے کا انداز ہی اسے بہت کچھ کہہ جاتا۔

''کیا تم نہیں جانتیں، مجھے کیا چاہیے؟'' گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اُلٹا سوال داغ دیا تھا۔

صنفِ نازک کو اللہ تعالیٰ نے ایک اضافی خوبی اور حس یہ بھی دی ہے کہ وہ دیکھنے والی نظروں کا معیار

بخوبی پرکھ سکتی ہے اور وہ جانتی تھی کہ زوہیب کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ لیکن تائی امی کے خشک اور رد رویے اور اس کی بہنوں کے طعنے سنتے ساری عمر سہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی اور پھر اب جبکہ اس کے دل میں دھڑکن بن کر کوئی اور بس چکا تھا۔

''کیوں اس طرح اگنور کرتی ہو مجھے کہ ایک نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتیں..... تمہیں صرف میری پروا ہونی چاہئے۔ میں ان سب کے رویوں کا ازالہ کر دوں گا..... بہت خوش رکھوں گا تمہیں۔'' کرسی کی پشت پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے وہ بے حد سنجیدگی سے اپنے سچے جذبات کا یقین دلا رہا تھا لیکن اس کے دل پر جمی برف کو پگھلانے میں مکمل ناکام ثابت ہو رہا تھا۔

''تم یقین کرو مجھے تم سے.....''

''میں جانتی ہوں زوہیب! کہ آپ کو مجھ سے بہت ہمدردی ہے۔'' الفاظ چباتے ہوئے جملہ اس نے اپنی پسند کے الفاظ سے مکمل کیا تھا۔

''رویے تو دُور کی بات، آپ کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے مجھے جن نظروں کا سامنا ہوتا ہے، میں خود اپنی ہی نظروں میں گرسی جاتی ہوں۔ کیوں آپ کے حوالے سے مشکوک نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ میں انسان ہوں، محسوس کر سکتی ہوں سب.....''

آنسو مسلسل اُس کے چہرے کو بھگونا شروع ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا، اس نے ایک دم دو قدم پیچھے ہٹائے۔

''نہ تو میرے دل میں آپ کے لیے کوئی ایسا جذبہ ہے اور نہ ہی میں سب کے خدشات پر تصدیق کی مہر لگانا چاہتی ہوں۔'' جملہ مکمل کر کے اس نے فوراً رُخ موڑ لیا یعنی کہ اب وہ جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا دھواں ہوتا چہرہ وہ نظرانداز نہیں کر پائی تھی..... کمروں سے جوتیاں گھسیٹنے اور باتوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں سو وہ رُکا نہیں۔

''کلو یار! آج تو کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ ہمت ہی نہیں ہے۔'' سجل بالوں میں کومب کلپ پھنسائے کچن میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے جواب دیئے بغیر کسی معمول کی طرح پیاز نکالی اور بھنڈی کے لیے کاٹنے لگی۔

''کیوں بھئی، یہ تم کیوں جامنی سے آتشی ہو رہی ہو؟'' زینیا بھی ہاتھ منہ دھو کر اب چیئر پر بیٹھ چکی تھی لیکن شہزادی کی چغلی کھاتی آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''بھئی یہ سب اس پیاز کے کمالات ہیں اور کچھ نہیں۔''

''اور کچھ ہونا بھی نہیں چاہئے، ہیرے کے ساتھ پتھر کبھی نہیں جچتا۔'' اس نے ایک اور چوٹ کی۔

کالج میں رضا اور مزنیٰ کے ساتھ کھڑے دیکھ کر انہوں نے نیا ہی افسانہ گھڑا تھا اور پھر تین چار روز

پہلے مزنیٰ کا فون بھی آیا جو اتفاق سے اس نے اٹینڈ کیا اور جب ان کے پوچھنے پر مزنیٰ کا بتایا تو دونوں ایک دم استہزائیہ ہنسی، ہنسی تھیں۔

''تمہیں میری فکر میں دُبلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے کام سے کام رکھو۔'' اس نے محض دل میں سوچا کہ کہہ دینے سے کچن کا امن خطرے میں پڑ سکتا تھا۔

''سجل! ذرا دیکھنا باہر کون ہے؟'' ڈور بیل ہونے پر زینیا نے آلکس سے سجل کو کہا، جو حیرت انگیز طور پر بغیر بحث اور احسان جتائے فوراً چلی تو گئی لیکن اُلٹے قدموں ہونق سی بنی واپس آئی۔

''وہ.....وہ مزنیٰ آئی ہے اپنی امی اور بھائی کے ساتھ۔'' وہ اتنے جوش سے بتا رہی تھی کہ گویا پریذیڈنٹ آ گیا ہو۔

''کھا قسم۔''

''قسم وسم نہیں کھاؤں گی۔ البتہ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر امی کو ان کے پاس بھیجا ہے۔'' وہ جلدی جلدی بولی۔

''ہم آئیں گے کسی دن آپ کے گھر۔'' شرارت سے کہا گیا یہ جملہ اور محبت کی رِم جھم پھوار میں بھگوتی دو سیاہ آنکھیں چھن سے اس کے تصور میں آ گئیں۔

اس نے گھبرا کر سر جھکا لیا مبادا اس کے چہرے پر بکھرے رنگ ان دونوں پر آشکار ہو جائیں لیکن ان دونوں کو اپنا ہوش نہیں تھا، اسے کیا نوٹ کرتیں۔

''کلو! پلیز یار آٹا تو گوندھ دینا۔ تب تک میں ہلکا سا تیار ہو جاؤں۔'' جلدی سے ہدایت دے کر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی جہاں سجل پہلے سے فریش اپ ہو رہی تھی۔

❀---❀---❀

''بس دیکھو تاجور! خدا بھی کہاں سے کہاں بندوں کو ملا دیتا ہے۔ تم شادی کے بعد یہاں آ گئیں اور ایسی آئیں کہ ادھر بچوں کے اسکول وغیرہ شروع کروائے اور پھر سالوں بعد مڑ کے سکھیوں سہیلیوں کو نہ پوچھا اور خود میں، گھر بار میں ایسی مصروف ہوئی کہ ان دونوں کے پیدا ہونے کے بعد کچھ ہوش نہ رہا۔'' شمیم بیگم تعلق نہ رکھنے کا الزام ان کے ساتھ ساتھ خود کو بھی دے رہی تھیں۔

''واقعی سچ کہتی ہو، اور اب بھی تو اللہ بخشے ظہیر بھائی کی اچانک وفات اور رضا بیٹے کی نوکری کی وجہ سے تم لوگ بھی یہاں شفٹ ہوئے اور اب پھر اللہ نے ایسا میل کروایا کہ لگتا ہے کبھی بچھڑے ہی نہ تھے۔''

''ہاں بالکل اور کیا۔ ان بچوں کو یاد ہو گا کہ بچپن میں ایک دو بار چھٹیاں ساتھ کھیل کُود کر گزار چکے ہیں۔'' دونوں اس طرح اچانک مل جانے پر بے حد خوش تھیں۔

سجل اور زینیا بھی ہلکی پھلکی تیاری کے بعد محفل میں شامل ہو چکی تھیں لیکن وہ جسے دل ڈھونڈتا تھا، ابھی تک نظروں سے اوجھل تھی۔ رضا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مزنیٰ سے استفسار کیا لیکن وہ محض کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ بوا اماں نے بھی بھرپور اپنائیت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن چونکہ ان کی تسبیح کا وقت تھا لہٰذا وجہ بتا کر اُٹھ گئیں۔

''ارے تاجور! وہ تمہارے جیٹھ کی بیٹی تھی نا، نظر نہیں آئی۔ کیا شادی کر دی اس کی؟'' انہیں اچانک یاد آیا تھا۔ گو کہ مزنیٰ انہیں ساری صورتِ حال سمجھا کر لائی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ان کی ہونے والی بہو کے لیے رضا نے کسے منتخب کیا ہے۔

''ارے ہاں کلو! اماں کا تو تم کو پتہ ہے نا، وہ اس کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہیں اور پھر دیکھو! آج کل گھر بھر جہیز دینے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا تو اس بن ماں کی لڑکی کون لے گا؟ ہم ہی کچھ اپنا پیٹ کاٹ کر ذمہ داری پوری کریں گے۔'' انہوں نے لہجے پر مسکینی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''اور پھر دیکھو! نہ رنگ نہ ڈھنگ، ایک تو ویسے کالی رات اور پھر رنگ ایسے پہنتی ہے کہ دیکھ کر ہی اُبکائی آنے لگے۔''

ان کی بات سن کر جہاں زوہیب نے پہلو بدلا تھا وہیں مزنیٰ اور رضا نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ دراصل وہ آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کر رہی تھیں۔ آخر دو بیٹیوں کی ماں تھیں اور پھر اتنا خوبرو، کماؤ بَر خود چل کر ان کے گھر آیا تھا لہٰذا وہ کسی صورت اسے ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتی تھیں جبھی ان چاروں کو ٹی وی روم میں بھیج دیا کہ آپس میں گھل مل سکیں جہاں وہ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے خب صورت بالوں کو جوڑے میں لپیٹ کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں ٹی وی اسکرین پر جمائے جنید جمشید کا کوئی پرانا انٹرویو دیکھ رہی تھیں۔ گھر آئے مہمانوں کے سامنے ان دونوں کی وجہ سے وہ کم ہی جاتی تھی گو کہ تاجور کبھی کسی کے سامنے اسے تضحیک کا نشانہ نہ بنائیں لیکن سجل اور زینیا عادت سے مجبور تھیں۔ نظریں اُس کی ٹی وی پر لیکن دھیان سارا ڈرائنگ رُوم کی طرف تھا کہ اچانک اُن کے اندر داخل ہونے پر فوراً ریموٹ رکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے آپ یہاں بیٹھی ہیں اور ہم کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' مزنیٰ لپک کر اس کے قریب پہنچی اور رضا کے احساسات کو زبان دیتے ہوئے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔

''دراصل میں کچن میں تھی۔ ابھی لمحہ بھر پہلے آئی ہوں اور اب دوبارہ جا رہی ہوں تاکہ کچھ چائے وغیرہ بنا لوں۔'' سر جھکا کر اس نے مزنیٰ کو جواب دیا تھا۔ ادھر ان دونوں کے منہ کے زاویے بدل گئے تھے۔

''کلو! امی نے کچھ چیزیں مارکیٹ سے منگوائی ہیں۔'' سجل نے لہجے میں شائستگی سموتے ہوئے کہا۔

گورے رنگ کا زمانہ، کبھی ہوگا نہ پرانا
گوری ڈر تجھے کس کا ہے
تیرا تو رنگ گورا ہے

پروگرام میں ناظرین فرمائشیں کر رہے تھے۔ جیسے ہی یہ گانا شروع ہوا، دونوں کے منہ کھل سے گئے۔

سانولا سلونا رنگ کتنوں کو بھاتا ہے
جسے دیکھو گوریوں کے پیچھے چلا آتا ہے

جنید جمشید بڑی ترنگ میں گا رہا تھا۔ ساتھ چٹکیوں کا اضافہ ان لوگوں نے کر دیا۔

''واقعی گورا رنگ تو آج کی سب سے بڑی ڈیمانڈ ہے۔'' سجل نے بلاواسطہ اپنی اہمیت جتائی۔

''پتہ نہیں ہم ایشئز کو گورے رنگ میں کیا نظر آتا ہے؟ یورپی ممالک میں جا کر بھی گوریوں کو یوں گھورتے ہیں کہ وہ پانی پانی ہو جائیں مگر ان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بھئی میں تو بھرپور طریقے سے اوب چکا ہوں۔'' رضا نے فوراً تردید کی تھی کیونکہ جانتا تھا کہ شہزادی کمفرٹیبل فیل نہیں کر رہی۔

''اور پھر جو کشش سانولے رنگ میں ہے، وہ گورے میں کہاں؟'' نہ صرف زوہیب بلکہ جنید جمشید نے اس بات کی بھرپور تائید کی۔

سانولی سلونی سی محبوبہ
تیری چوڑیاں شرٹنگ کر کے

اس وقت کسی کالر کی فرمائش پر وہ سانولے رنگ کے مزید قصیدے گا رہا تھا۔

''خیر یہ سب فضول باتیں ہیں۔ کوئی اور بات کرو۔'' زینیا نے موضوع بدلا کہ رضا کی بات سے اختلاف کرنا اسے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

''سجل! تم کوئی لطیفہ سناؤ نا کامن رُوم میں تو سب کو ہنساتی رہتی ہو۔'' مزنیٰ نے فرمائش کی اور اس سے پہلے کہ وہ اسٹارٹ ہوتی، زوہیب پھر بول پڑا۔

''ارے چھوڑو۔ یہ تو اتنا پرانا لطیفہ سنائے گی کہ جس کی بھنویں تک سفید ہو گئی ہوں گی۔''

''جی نہیں۔ پرانا لطیفہ اور پرانے چاول ہمیشہ مزہ دیتے ہیں۔'' وہ کھسیا گئی تھی۔

''لیکن خیال رکھنا، پرانے چاولوں میں اکثر کیڑے بھی پڑ جاتے ہیں۔'' وہ بھی کہاں چُوکنے والا تھا۔

ان دونوں کی نوک جھوک سے رضا اور مزنیٰ دونوں ہی محظوظ ہو رہے تھے لیکن وہ دونوں حیران تھیں کہ ایسا پہلی مرتبہ ہو رہا ہے ورنہ زوہیب نے کبھی ان کی بات میں مداخلت نہیں کی تھی مگر شہزادی کو اندازہ تھا کہ یہ سب کس عمل کا ردِعمل ہے۔ بہرحال وہ شام یادگار رہی۔ پُرتکلف چائے کا دور چلا۔ امن بوا کے کہنے پر جب وہ شمیم بیگم کے پاس جا کر کچھ دیر بیٹھی تو نہ جانتے ہوئے بھی وہ جان گئیں کہ رضا جیسے جوہری نے اسی ہیرے کو پہچانا ہے۔ چائے کے ٹائم تک ہاشم صاحب بھی آ گئے۔ وہ بھی یوں دونوں سہیلیوں کے اچانک مل جانے پر بے حد خوش دکھائی دیئے۔ رضا گو کہ اس سے اتنا مخاطب نہیں ہوا تھا لیکن اشاروں کنایوں میں اسے چھیڑنا اور مزنیٰ کی دی گئی بے حد اہمیت۔ وہ حیران تھی کہ ان دونوں کے ہوتے ہوئے میری بھی

کوئی اہمیت ہے۔ اور جب رات گئے وہ لوگ گھر لوٹے تو تینوں لڑکیوں کی آنکھوں میں نئے اور خوش کُن خواب سجے تھے۔

❀---❀---❀

''ارے، یہ فریج میں آئل کس سے گرا ہے؟'' اس نے تایا جی کے لائے فروٹ شاپرز سے نکال کر فریج میں رکھنا چاہے تو بھنّا کر رہ گئی۔

''اوہ ہاں، سوری کلو! دراصل یہ مجھ سے گرا تھا۔ میں نے سالن سے نکال کر رکھا تھا مگر خیال نہیں رہا۔'' زینیا نے غلطی تسلیم کرتے ہوئے وضاحت کی تو اس نے بھی بحث نہیں کی۔ کل اتوار تھا اور فریج صاف کرنے کی باری اس کی تھی لہٰذا اس نے سوچا، کرنا تو ہے ہی، کل کیا اور آج کیا۔ سو فوراً فریج کا پلگ نکالا اور سرکے میں نمک ڈال کر فریج صاف کرنے بیٹھ گئی۔ باقی سب نے آج عید کی خریداری کے لیے شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔

''شہزادی بیٹا!'' وہ تینوں چلی گئیں تو بوا اماں اس کے پاس ہی آ بیٹھیں۔

''جی بوا اماں!'' اس نے ساری چیزیں نکال کر ٹیبل پر رکھ دیں اور پہلے سرف سے چکنائی صاف کر رہی تھی۔

''کل شمیم کا فون آیا تھا۔'' انہوں نے جیسے ہی کہا، اس کے ہاتھ سے سرف کا مگ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اتنی کوئیک سروس! وہ حیران تھی لیکن یوں ظاہر کیا جیسے کوئی انہونی نہ ہو۔ ''بیٹا! آج یا کل ہر لڑکی کو اگلے گھر جانا ہوتا ہے۔ اور پھر خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی بیٹیاں وقت پر اپنے گھر کی ہو جائیں۔''

''ہوتی ہوں گی۔ لیکن میں اپنی امن بوا کو چھوڑ کر جانے والی نہیں۔ یہ کیا کہ پہلے تو والدین سے جی بھر کر خدمت کروائی جائے، نخرے اُٹھوائے جائیں اور جب انہیں ہماری خدمت، توجہ اور پیار کی ضرورت ہو تو آٹھ دس رسمی آنسو بہا کر اپنی نئی دنیا سجا لیں۔'' وہ بوا کی تمہید کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہنوز اپنی تمام تر توجہ فریج پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔

''بیٹا! یہ تو حکمِ خداوندی ہے۔ ورنہ ماں باپ کا کب جی چاہتا ہے اپنے جگر کے ٹکڑے دوسروں کے حوالے کریں۔''

''اچھا میری بات سن غور سے۔'' انہوں نے کرسی اس کے نزدیک لے جاتے ہوئے کہا۔

''وہ لوگ کل رضا کے لیے تیرا رشتہ مانگنے آ رہے ہیں۔ لیکن میں نے شمیم سے کہا ہے، چند روز ٹھہرو اور گھر میں بھی فی الحال خبر نہ ہو۔ اس نے بھی ڈائریکٹ مجھ سے اس لیے بات کی ہے کہ اس کے خیال میں تاجور، زینیا کے لیے اس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ ویسے مجھے تو لوگ ہر لحاظ سے پسند ہیں۔'' انہوں نے گیند

اس کے کورٹ میں ڈالی تھی۔

''بوا اماں! ایک بات کہوں سچی سچی۔'' ان کی طرف مکمل رُخ کرتے ہوئے اس نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔

''ہاں ہاں بول۔''

''آج تک میں نے آپ کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا لیکن.....'' اس نے آہستگی سے ان کے ہاتھ تھامے۔ ''بوا اماں! میں ان کے ساتھ چچوں گی نہیں۔ اور ساری عمر طنز سہنے سے بہتر ہے کہ.....'' اُس نے سر جھکا کر اعتراف کرتے ہوئے ممکنہ خدشات کا سچائی سے اظہار کیا لیکن بوا اماں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھیں۔

''ارے کون کہتا ہے تُو نہیں جچے گی؟ میری شہزادی کے ساتھ تو کسی قسمت والے کا نام لگے گا۔'' انہوں نے ہاتھ دباتے ہوئے گویا یقین دہانی کروائی تھی۔

''بوا اماں! یہ مائیں اتنی خوش فہم کیوں ہوتی ہیں؟ ہونہہ..... شہزادی..... یہ نام رکھتے ہوئے امی نے مجھے دیکھ تو لیا ہوتا۔'' بات ختم کر کے وہ خود ہی ہنس دی اور بوا اماں کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

''شہزادی! یہ کوئی معذوری یا محرومی نہیں۔ اور پھر یہ نام تو ہماری روح کا ہوتا ہے، اس ظاہری مٹی کے بت کا نام نہیں..... جسم تو خود اس روح کی مرہونِ منّت ہے۔'' آج انہوں نے آر یا پار کرنے کی ٹھانی تھی۔

''روح کا نام!'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں روح کا نام۔ اب دیکھو! ایک شخص کا نام آصف ہے اور جب وہ مرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ آصف اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کیوں؟ حالانکہ جسم تو سامنے موجود ہوتا ہے۔ اس دنیا سے تو صرف روح جاتی ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ تمہاری روح تمہارے نام سے بھی زیادہ پیاری اور خوبصورت ہے۔''

امن بوا نے اتنی خوب صورت مثال دے کر اسے سمجھایا تھا کہ وہ مزید بحث نہ کر سکی۔ بس لاجواب سی ہو کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھا اور ان کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔ اپنی کامیابی پر گو کہ بوا اماں خوش تھیں لیکن پھر بھی انہوں نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا ضروری سمجھا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر کچھ سوچتے ہوئے رضا کو فون کرنے چل دیں کہ گھر میں کوئی نہ تھا اور آزادی کا اس سے بہتر وقت انہیں پھر شاید ہی میسر آتا۔

❀---❀---❀

''رکشہ.....!'' شہزادی نے ہاتھ ہلا کر رکشہ روکنا چاہا لیکن وہ رُکا نہیں۔ ویسے بھی اسکولوں کی چھٹی کا وقت تھا، تقریباً تمام رکشوں میں اسکول کے بچے اور ان کے بیگ نظر آ رہے تھے اور جو خالی تھے، وہ شاید

بچوں کو پک کرنے جا رہے تھے جبھی اس کے روکنے کا کوئی نوٹس نہیں لے رہے تھے۔ آج امن بوا نے ہاسپٹل جانا تھا۔ اس سے پہلے وہ زوہیب کے ساتھ چلی جایا کرتیں لیکن آج انہوں نے شہزادی کو بھی ساتھ لے جانا چاہا تو تاجور بیگم نے سہولت کے ساتھ منع کر دیا کہ آج انہیں بھی کہیں جانا ہے اور امن بوا نے تو شکر ہی کیا اور اس کے ساتھ سڑک تک آ گئیں۔ اور ان کی بے چینی ظاہر کرتی تھی کہ انہیں کسی کا انتظار ہے لیکن شہزادی نے خیال کیا۔ ''ظاہر ہے رکشے کا۔ اور کس کا؟''

''السلام علیکم بوا اماں!'' بائیں جانب سے آنے والی چمچماتی شیراڈ ان کے بالکل نزدیک آ رکی تھی اور بوا اماں تو جیسے کھل سی گئیں۔

''وعلیکم السلام بیٹا! جیتے رہو۔'' جیسے ہی وہ گاڑی سے نکلا، فوراً بوا اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دینے لگیں۔

''السلام علیکم!'' وہ ایک بار پھر اس کی پُرشوق نظروں کی زد میں تھی، جواب دیتے ہوئے اس نے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔

''آیئے بیٹھیے، میں آپ کو ڈراپ کیے دیتا ہوں۔'' اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے آفر کی جو انہوں نے بغیر کسی تردّد کے قبول کر لی۔ ان کی تقلید میں اسے بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے سے پہلے اس نے بیک مرر اس پر سیٹ یا، سیٹ بیلٹ باندھی، بسم اللہ پڑھی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے بوا اماں کے بتائے گئے ہاسپٹل کی طرف گاڑی بڑھا دی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بوا اماں کو بھرپور کمپنی دے رہا تھا بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے بھی اپنے بے تابیوں کے قصے شیئر کر رہا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر دیکھنے لگتی لیکن چند ثانیے بعد دوبارہ اس کی آنکھوں میں گم ہونے لگتی۔ وہ خود حیران تھی کہ وہ اپنے آپ پر کنٹرول کیوں نہیں کر پا رہی۔

ہاسپٹل پہنچنے پر بھی وہ ساتھ ساتھ رہا۔ بوا اماں کو چند ایکسریز کے لیے اندر لے کر گئے تو انتظار کے لیے وہ اس کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ گیا۔

''شہزادی!'' اس نے دھیرے سے اسے متوجہ کیا۔

''فرمایئے۔'' وہ جتنا اس سے بچنا چاہتی تھی، وہ اتنا ہی قریب ہوتا جا رہا تھا۔

''تمہیں میرے فیصلے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟'' وہ خاموش تھی مگر وہ بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مکمل سکوت تھا لیکن اس کے برعکس اس کے اندر کا شور اسے شل کیے دے رہا تھا۔

''بولو نا۔ تم جانتی ہو جب سے تمہیں دیکھا ہے، اب اکیلے دل نہیں لگتا۔ میں جلد از جلد تمہیں خود سے وابستہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مت کیجیے مجھ سے ہمدردی..... نہیں چاہیے مجھے بھیک میں ملی ہوئی محبت.....'' قدرے سخت لہجے

میں اس نے کمالِ ضبط سے کہا۔

''ہمدردی..... بھیک..... واٹ نان سینس۔'' اس کے بے تکے خیالات جان کر وہ حیران رہ گیا۔

ویٹنگ روم میں اور کوئی مریض نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اٹینڈنٹ۔ وہ دونوں آسانی سے بات چیت کر رہے تھے اور رضا جانتا تھا کہ اس سے اچھا موقع اسے پھر نہیں ملے گا۔

''کیوں ہمدردی کرنے لگا میں تم سے؟..... کیا تمہارے ہاتھ پاؤں نہیں؟ یا ذہنی معذور ہو تم؟..... کیا نقص ہے تم میں؟..... بولو۔'' آہستہ آہستہ مگر سخت آواز میں اب وہ اس سے مخاطب تھا۔ اور وہ کوئی جواب نہ بن پڑا تو رونے لگی۔

''ارے ارے..... کوئی ایسی خطرناک بات نہیں۔ یہ بس بلڈ پریشر پرابلم ہے۔'' ڈاکٹرز رُوم سے نرس باہر نکلی تھی، اسے روتے دیکھا تو خود ہی اندازہ لگا کر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری نبھاتے ہوئے اسے تسلی دینے لگی۔

''بس وہ باہر آنے والی ہیں۔ جسٹ ڈونٹ وری۔'' اس کا کندھا تھپکتے ہوئے وہ مسکرائی اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔

''میں تمہاری کنفیوژن دُور کرنا چاہتا ہوں۔ شیئر کرو مجھ سے۔'' اپنائیت سے بھرپور لہجہ اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا تھا۔ ''اور ہاں، یہ سوچ لینا کہ محبت انسانوں سے نہیں، روّیوں سے کی جاتی ہے اور میں نے..... تم سے محبت کی ہے۔''

''میں آپ کے ساتھ سوٹ نہیں کرتی۔ لوگ ہمیں اندھیرا اُجالا کہیں گے۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے نہایت بھولپن سے وجہ بیان کی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''تمہیں شاید یاد نہیں ایک دفعہ جب تم لوگ چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے اور کسی نے تمہاری رنگت پر چوٹ کی تھی تو گو کہ تم چھوٹی تھیں لیکن بولیں ''اچھا زیادہ اِترانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کے حروف، خانہ کعبہ کا غلاف اور محمد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کملی کا رنگ بھی کالا ہے اور مجھے فخر ہے کہ اس طرح ہی سے سہی مگر میری نسبت تو ان پاک چیزوں سے بن گئی۔''

اُس کے انکار کی وجہ جان کر وہ ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا کہ ولن کا کوئی چکر نہیں لہٰذا اپنے مخصوص لب و لہجے کا جادو جگاتا ہوا ڈائریکٹ اس کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا جس کی کنڈی کھل چکی تھی۔

''شہزادی! تم جانتی ہو نا تمہیں اس سوچ کا بھی ثواب ملے گا اگر جو تم اپنا لو۔''

ٹشو کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی وہ اس کی خوب صورت سوچ کی بھی قائل ہوتی جا رہی تھی۔

''اور وہ واقعہ تو تم نے پڑھ رکھا ہو گا کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک صحابی کے زیرِ تعمیر مکان کے سامنے سے گزرے تو روشندان دیکھ کر فرمایا۔

''یہ کس لیے رکھوائے ہیں؟''

صحابی نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ ﷺ! تاکہ ہوا کا گزر ہو سکے۔''

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''کاش! تم کہہ دیتے کہ اذان کی آواز سننے کے لیے، ہوا تو پھر بھی گزرتی ہی۔''

بوا کمرے سے آ گئی تھیں اور اب گفتگو میں حصہ لے رہی تھیں جب کہ رضا اب ڈاکٹر سے ان کے چیک اپ کی تفصیل معلوم کر رہا تھا اور اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے رضا نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ بوا اماں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے چہرے سے پھوٹتے شگوفوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ جس کے لیے انہوں نے رضا کو فون کر کے بلوایا تھا وہ اس میں سو فیصد کامیاب رہی ہیں۔

ہاسپٹل سے فارغ ہو کر رضا نے بوا اماں کے کہنے پر گاڑی بازار کی طرف موڑ دی۔

''بوا اماں! کیا لینا ہے؟'' اس نے پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت بازار کا کوئی پروگرام نہ تھا۔

''بیٹا! عید سر پر ہے۔ اپنی خریداری کر لو۔ روز روز آیا نہیں جاتا۔'' رضا نے زیر لب مسکراتے ہوئے گاڑی پارک کی اور ان کے ساتھ ہی چل دیا۔ اس کی موجودگی میں شاپنگ کرتے ہوئے وہ پزل ہو رہی تھی۔ بازار میں عید کی وجہ سے کافی گہما گہمی تھی۔ عید کارڈز، چوڑیاں، مہندی ہر جگہ رش تھا۔ اسے یاد تھا کہ رضا کی موجودگی میں بازار میں سجل اور زینیا نے اس کا کتنا مذاق بنایا تھا لیکن جس جس چیز پر سراہتی نظر ڈالی، وہ بے اختیار خریدتی چلی گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ آج اس کے اندر کسی نئی شخصیت نے جنم لیا تھا۔ اس عید پر وہ رضا کی پسند کے رنگوں سے سجنا چاہتی تھی۔ خریداری کے دوران ہی ایک جگہ رضا نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

''عید پر میں امی کے ساتھ تمہارے جملہ حقوق ضبط کرنے آ رہا ہوں۔ تیاری زبردست ہونی چاہیے۔''

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کیا تھی، اس کا رنگ روپ کیا ہے، سجل اور زینیا کے تاثرات کیا ہوں گے؟ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ ہاں یاد تھا تو بس اتنا کہ یہ عید حقیقتاً اس کے لیے بھرپور مسرتیں اور خوشیوں کی نوید لا رہی ہے اور رضا نے دوسری تمام لڑکیوں اور ان دونوں کے ہوتے ہوئے اگر اسے ترجیح دی تھی تو یقیناً اس میں کچھ خاص تھا، جو دوسروں میں نہیں اور پھر سہاگن تو وہی ہوتی ہے نا جسے پیا چاہے!!

(تمت بالخیر)

Pakistanipoint Waqar Azeem